U79916

رسائل
۳۹۵

مُصوّر
مُجلّہ
لاہور

بہترین و ارزاں ترین علمی و ادبی رسالہ

RARY
OKS:

کائنات لاہور

کا سالنامہ ۱۹۳۳ء

مدیران معاون

شوکت معصوم   سید اکبر حسینی آرزو

چندہ سالانہ

عام دو روپے علاوہ محصول - معاونین سے پانچ روپے - سرپرست حضرات سے پچیس روپے

عہ/   صہ/   ـعـہ/

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ اتنا کافی ہے

سید سراج احمد ایڈیٹر رسالہ کائنات لاہور

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

ایک ضروری خط

صادق صاحب نے ذیل کا مکتوب ایسے وقت بھیجا کہ تمام کاپیاں پریس میں جا چکی تھیں اتفاقیہ جو جگہ نکل آئی ہے اس میں بالاختصار درج کیا جاتا ہے:

"محترمی! السلام علیکم۔ کائنات کا ہر نمبر پہلے سے زیادہ دلچسپ اور مفید ہے امید ہے کہ ایک دن آسمان صحافت پر آفتاب بنکر چمکے گا۔ میں اپنا فائل مکمل کرتے کرتے تھک گیا۔ مگر مکمل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے دوستوں کو مانگ کر رسالہ پڑھتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ بڑے بڑے تیلو پچی میری میز پر سے رسالہ یہ کہکر لیجاتے ہیں کہ کل پہنچ جائیگا اور پھر کبھی نہیں پہنچتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اور بھی کئی رسالے آتے ہیں مگر کائنات ہی پر چھینا جھپٹی ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دو دفعہ مجھے آپ سے بھی جھوٹ بولنا پڑا کہ "رسالہ نہیں پہنچا جلد بھیجدیجے" حالانکہ پہنچ چکا تھا مگر میرے پاس سے جاتا رہا تھا۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے اور مجھے کوئی کامیاب تدبیر بھی بتائیں گے۔" (صادق علی خاں صادق)

اعتراف بھی بڑی جرات کا کام ہے آخر صادق ہو نہ بھئی! مفت خوری تو ایک بے غیرتی ہے جب تک خود انہیں احساس نہو تب تک کیا تدبیر کارآمد ہو سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ جو پرچے آپکے پاس باقی رہ گئے ہوں وہ بھی دوستوں کی نذر کر دیجئے۔ اور دفتر سے مکمل فائل منگا لیجئے۔ والسلام (مدیر)

سالنامہ کے بعد عید اضحیٰ نمبر

عید نمبر میں اعلیٰ درجہ کی مسرت افروز نظمیں اور غزلیں ہوں گی

عید نمبر میں بلند پایہ ادبی علمی تاریخی وغیرہ مضامین ہوں گے

عید نمبر میں ایسے ایسے مزاحیہ مضامین ہونگے کہ بس کچھ نہ پوچھئے

عید نمبر میں تصاویر نہایت دلکش و دلفریب ہوں گی۔

عید نمبر کی خصوصیات عید نمبر کو دیکھکر ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔

اگر آپ مفت عید نمبر لینا چاہیں تو آج ہی سے سالانہ خریدار بن جائیے تاکہ اس عید نمبر کے علاوہ ہر خاص نمبر اور سالنامہ آپکو مفت ملا کرے سالانہ قیمت صرف دو روپیہ (عہ) علاوہ محصولڈاک ہے (مینیجر)

اشارات

الحمدللہ علی کل حال - ہم جس شان کا سالنامہ ناظرین محترم کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے، ہمیں اعتراف ہے کہ ویسا پیش نہ کرسکے اس کی کئی وجوہ ہیں - ایک تو یہ کہ جن احباب کا سالانہ چندہ ختم ہوچکا تھا انہوں نے آئندہ سال کا چندہ بذریعہ منی آرڈر نہیں بھیجا دوسرے احباب سے صرف ایک ایک خریدار بڑھانے کی درخواست کی تھی جو نامنظور ہوئی تیسرے اندازہ کیا تھا اخراجات کا ۵۰۰ روپے اور حقیقت میں درکار تھے اس سے بھی زیادہ - اب فرمائیے ہم اپنے ارادے کو عملی جامہ کیونکر پہنا سکتے تھے - یہ بھی جو کچھ ہوگیا محض تائید ایزدی ہے -

---

مسلم پرنٹنگ پریس میں کائنات کے سوا اور بھی متعدد رسائل چھپتے ہیں جن کی تاریخ اشاعت اس قدر قریب قریب ہے کہ تمام کے تمام رسائل ٹھیک وقت پر تیار نہیں ہوسکتے اس لئے ہم اپنے رسالہ کی تاریخ ہر مہینہ کی ۲۵ قرار دیتے ہیں تاکہ ناظرین کرام کو زحمت انتظار نہ ہو - چنانچہ جنوری ۱۹۳۳ء سے اس پر عمل ہوگا -

---

زینتھ پریس لاہور کے ان پریسوں میں سے ہے جو اپنے کام کے لحاظ سے وقیع ہیں - اس کے مالک منشی محمد حسین صاحب ایک بامذاق، محنتی اور اپنے کام کے ہر نشیب و فراز سے واقف شخص ہیں - مدت سے انہیں کے پریس میں کائنات کی تصاویر چھپتی ہیں - اس دفعہ انہوں نے قابل ذکر کام "کارواں" کا کیا ہے -

---

کارواں "ایک سالانہ رسالہ ہے جو اردو میں بالکل نئی چیز ہے اب تک "اردو" اور "ہندوستانی" دو رسائل سہ ماہی اعظم گڑھ اور الہ آباد سے نکل رہے تھے اب لاہور سے کارواں سال بھر میں صرف ایکبار شایع ہونا شروع ہوا ہے - جسکے کارپردازوں میں نہایت صاحب سلیقہ اور صاحب مذاق حضرات شامل ہیں - پنجاب کے مشہور انشا پرداز جناب تاثیر ایم اے اس کے ایڈیٹر ہیں - مشاہیر ملک کے شاہکاروں کا مجموعہ بیان کیا جاتا ہے اور ہر قسم کے آرٹ کا حسین گلدستہ - امید ہے کہ ادبی رسائل پوری فراخدلی سے اس کا خیر مقدم کرینگے اور اہل ذوق کماحقہ قدردانی - حجم زائد از ۳۰۰ صفحات تصاویر قریباً ۳ درجن قیمت عہ

حضرت اختر شیرانی کے یکسالہ فرزند کا گزشتہ ماہ انتقال ہوگیا انا للہ و انا الیہ راجعون - نہایت خوبصورت اور تندرست بچہ تھا - تقریباً دو ہفتے نمونیہ میں مبتلا رہ کر اپنے جوان سال و جوان عمر والدین اور بزرگسال دادا دادی کو داغ مفارقت دے گیا - حضرت مولانا محمود خانصاحب شیرانی اپنے پوتے سے بہت مانوس تھے - ہمیں ممدوح اور دیگر متعلقین سے اس صدمۂ جانکاہ میں دلی ہمدردی ہے -

---

ابونعیم آرزو کے نام نامی سے قارئین کائنات بخوبی واقف ہیں - موصوف کائنات سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں - سالنامہ سے آپ کائنات کے حلقہ ادارت میں شامل ہوگئے ہیں اب آپ کائنات کی فلاح و بہبود کے لئے پہلے سے بھی کچھ زیادہ یا بہت زیادہ سرگرمی اور مستعدی سے کام کریں گے ہم ان کی شمولیت ادارت اور رفاقت کار پر خوش ہیں اور انہیں اس شرکت و خلوص پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں - ہمیں احباب دکن سے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ وہ آرزو صاحب کو اپنے ہاں کائنات کا ایک نمائندہ تصور فرمائیں -

---

عزیزم شوکت معصوم موٹر سائیکل سے گر کر صاحب فراش ہیں خدا کا فضل و کرم شامل حال تھا کہ محض ٹانگ پر ضرب آئی ورنہ

بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ جلد صحتیاب ہونے کی توقع کی جاتی ہے احباب سے دعائے صحت کی استدعا ہے۔

منشی محمد امین صاحب منیجر کائنات عرصہ سے بیمار تھے اب بفضلہ تعالیٰ وہ خود تو صحتیاب ہو چکے ہیں لیکن ان کی بچی نمونیہ میں مبتلا ہے اللہ تعالیٰ اسے جلد شفائے کلی عطا فرمائے۔

ایک طرف شوکت معصوم کا حادثہ تھا دم اور علالت۔ دوسری طرف منیجر صاحب کی بیماری اور معذوری نے مجھے اس قدر مصروف کر دیا کہ بہت سے ضروری خطوط کے جواب تک لکھنے کی فرصت نہ پا سکا۔ پھر بھی سالنامہ کی تیاری میں تاخیر ہو گئی۔ سردیوں کے بوند بھر دن ایک اکیلا آدمی کیا کیا کرتا کبھی ایک پریس میں کبھی دوسرے میں کبھی بلاک میکر کے ہاں۔ غرض اسی طرح دن ختم ہو کر رات ہو جاتی اور دوسرے دن پھر وہی۔ معذوری ظاہر ہے۔ عذر کیا کروں۔

کرپا رام اینڈ سنز سے اس دفعہ کام لینے کا اتفاق ہوا اچھا کام کرتے ہیں۔ سالنامہ میں متعدد بلاک انہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ اجرت بھی مناسب ہے۔ تاجرانہ اخلاق سے بھی واقف ہیں غرض خوب آدمی ہیں اور خوب کام کرتے ہیں۔ انارکلی بازار میں دکان ہے۔

تنقید و تبصرہ کیا کرتا۔ پڑھنے کی فرصت ملتی تو کچھ لکھتا بھی۔ حکیم محمود علیخاں صاحب ماہر (دہلی) کی ایک کتاب۔ چغتائی صاحب کی جدید تصنیف "فل بوٹ" اور ایک دو چیزیں جوں کی توں رکھی ہیں پڑھنے کا موقع مل گیا تو آئندہ نمبر میں کچھ لکھ سکونگا۔ جدید رسائل "فانوس" لاہور "فردوس" لاہور (جو مجھے غیرت صاحب نے بھیجا تو ضرور ہوگا مگر پہنچا نہیں) اور "رخستان" راولپنڈی۔ پر بھی جنوری نمبر میں اظہار خیال کیا جائے گا۔

احباب بلدہ سے گزارش ہے کہ وہ جلد سے جلد "لیاقت النساء صاحبہ بی اے" کے بارہ میں اپنی تحقیق مکمل کر کے مطلع فرمائیں۔ یہ مضمون نامکمل نہیں چھوڑا جائے گا۔

جواب طلب امور کے لئے جوابی خط یا ٹکٹ آنا لازمی ہیں ورنہ جواب کا انتظار نہ کیا جائے۔ بعض صاحبان معمولی معمولی باتوں کا جواب مانگتے ہیں۔ اور ٹکٹ وغیرہ کچھ نہیں بھیجتے دفتر ایسے جوابات کا ذمہ نہیں لے سکتا۔

عدم وصولی رسالہ کی اطلاع بجائے دفتر میں بھیجنے کے ڈاکخانہ کو بھیجا کیجئے تاکہ گمشدگی کا پورا پورا انسداد ہو سکے۔ دفتر سے ہر مہینہ باقاعدہ رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ پھر بار بار شکایت کرنا اور یہ لکھنا کہ آپ نے بھیجا ہی نہیں فضول بات ہے۔ رسالہ بھیجنے ہی کے لئے شائع کیا جاتا ہے نہ بھیجنا کیا معنی؟ شیخ خیر اللہ صاحب نظامی لکھتے ہیں کہ میں نے خود اپنا رسالہ پوسٹ آفس کے کلرک کے پاس دیکھا اور وہی نمبر دوسرے یا تیسرے دن ان کو ملا بھی لیکن پھر بھی اکتوبر غائب ہو گیا۔ اگر یہی شاکی صاحبان ہر دفعہ گمشدگی کی اطلاع ڈاکخانہ کو دیا کریں تو چند ہی روز میں اس علت کا تدارک ہو سکتا ہے۔

گزشتہ عید قرباں نمبر سے جو صاحبان ایک روپیہ چندہ بھیجکر خریدار ہوئے ہیں وہ سالنامہ وصول پانے کے بعد اپنا چندہ خریداری ختم تصور فرمائیں عید نمبر ۸ر سالنامہ ۱۲ر باقی پرچے افسانہ نمبر و اکتوبر وغیرہ مزید براں۔ اس سے زیادہ ایثار و قربانی کی کائنات میں گنجائش نہیں۔ امید ہے کہ آپ حضرات اپنی خریداری آئندہ جاری رکھکر کائنات کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے اور اپنی اپنی رقم بذریعہ منی آرڈر بھیجدینگے تاکہ وی پی میں ۴ر زائد نہ خرچ نہ ہوں۔

ہمارے نامہ نگار حضرات سب ہی اچھا لکھنے والے ہیں جیسا کہ مضامین سے ظاہر ہے اور قدیم کرمفرما۔ اس لئے کسی مزید تعریف و تعارف کے محتاج نہیں۔

عالی جناب سے ہمیں ندامت ہے کہ ان کے فوٹو کا بلاک تیار نہ ہو سکا۔ آپنے اور **نصیر خان صاحب** نے اپنا معاونانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر اور متعدد جدید خریدار عنایت فرماکر شکریہ کا موقع دیا ہے۔ (سراج)

سرپرست حضرات

جن امراء وطن نے گزشتہ سال کائنات کی سرپرستی فرمائی تھی ان کی علمدوستی وادب نوازی اور قدر دانی سے امسال بھی سرپرستی کی توقع ہے۔ ان بزرگان ملک کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

(۱) عالیجناب نواب فخر الملک بہادر جنکا شاندار فوٹو سالنامہ کائنات کی زیب وزینت ہے۔
(۲) عالیجناب نواب لطف الدولہ بہادر۔
(۳) عالیجناب نواب اختر یار جنگ بہادر۔
(۴) عالیجناب نواب عزیز یار جنگ بہادر۔
(۵) عالیجناب نواب نذیر جنگ بہادر۔
(۶) عالیجناب نواب عقیل جنگ بہادر۔
(۷) عالیجناب نواب کرامت جنگ بہادر۔
(۸) عالیجناب مظفر الدین بہادر ایم اے۔
(۹) عالیجناب نواب قدرت نواز جنگ بہادر۔
(۱۰) عالیجناب شو شنکر راؤ بہادر جاگیردار۔
(۱۱) عالیجناب مہاراجہ پرتھی سنگھ صاحب بہادر۔
(۱۲) عالیجناب امیر کبیر نواب سر سالار جنگ بہادر (پہلی مرتبہ)

صاحب موصوف کا فوٹو بھی سالنامہ کی زینت ہے۔ علم و ادب کے سرپرست ہیں

(۱۳) عالیجناب یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد (پہلی دفعہ)
(۱۴) عالیجناب سید محمد کاظم علی صاحب رئیس اعظم (پہلی دفعہ)

معاونین حضرات

(۱) جناب میر محمد عامر عباسی عالی صاحب۔
(۲) جناب محمد نصیر خانصاحب انسپکٹر (جھانسی)
(۳) جناب ایم عبدالجلیل صاحب ہیڈ کلرک دفتر خبگلات
(۴) جناب سید محمد علی صاحب وکیل درجہ اول۔
(۵) جناب عابد حسین صاحب وکیل مالوہ۔
(۶) شاہزادہ محمد شفیع صاحب اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ
(۷) بیگم صاحبہ محترمہ میاں عطاء الحق انسپکٹر آبکاری۔
(۸) جناب ای جی خانصاحب سپرنٹنڈنٹ برماشل پٹرول ڈپو
(۹) جناب عبد الرزاق خانصاحب انسپکٹر پولیس۔
(۱۰) محترمہ بیگم صاحبہ صاحبزادہ معشوق علیخانصاحب
(۱۱) جناب منوہر لال صاحب بیرسٹرایٹ لا۔
(۱۲) جناب سید محی الدین صاحب محاسب۔
(۱۳) جناب محمد نواز خانصاحب رئیس اعظم ملیکےتارو
(۱۴) جناب محمد حاجی کریم بخش صاحب وکیل۔
(۱۵) جناب سید علی صاحب بی اے پرنسپل۔
(۱۶) جناب رستم جی وشابور جی صاحب مددگار مہتمم پولیس
(۱۷) جناب عبدالغنی صاحب انصاری افسر انچارج پولیس
(۱۸) جناب منظور احمد صاحب تحصیلدار۔
(۱۹) جناب محمد جلال الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس
(۲۰) جناب حاجی قادر محی الدین صاحب (مدراس)
(۲۱) جناب مولوی میر احمد علی صاحب رضوی تعلقدار۔
(۲۲) جناب عتبار خانصاحب ای اے سی۔ کراچی
(۲۳) جناب سید دو محمد شاہ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر۔
(۲۴) جناب آغا سرور شاہ صاحب نائب تحصیلدار۔
(۲۵) جناب محمد رفیق خانصاحب صوبیدار۔
(۲۶) جناب غوث الدین صاحب قاضی (دکن)
(۲۷) جناب قاضی محمد صابر صاحب جاگیردار۔ (بھوپال)
(۲۸) جناب ملک محمد عبدالرؤف صاحب منصف۔
(۲۹) جناب نور محمد خانصاحب جاگیردار
(۳۰) جناب محمد رحیم الدین صاحب افسر سررشتہ خاص۔

(نوٹ) امید ہے کہ یہ تمام کرمفرما معاونت فرماکر ہمیں شکرگزاری کا موقع دیں گے۔ (مینیجر کائنات لاہور)

"سرکار دام اقبالھم"

تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ خاکسار مدیر کائنات کو ..." سرکار دام اقبالھم" نے خوش قسمتی یا بدقسمتی سے یاد فرمالیا۔ ہم نے سوچا کہ ایک والی ریاست کے دربار میں تو شاندار لباس سے ملبس ہو کر جانا ہی کچھ موزون و مناسب ہو سکتا ہے اور وہ ہمارے پاس ہے نہیں۔ اب کیا کریں؟ آخر یہی فیصلہ کیا کہ جھوٹے عذرات کون تراشے اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بنے۔ سچی سچی بات لکھدی کہ "حضور والا! عزت افزائی کا شکریہ دربار شاہانہ کے لائق لباس ہی نہیں رکھتا نہایت محجوب و نادم ہوں" "سرکار دام اقبالھم"، غریب اپنی خواہش ملاقات کو اب کس طرح پورا کر سکتے تھے۔ صبر کر کے بیٹھ گئے۔ ہم نے بھی دو چار روز جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہی کیا جو " سرکار دام اقبالھم" نے کیا تھا۔ یعنے صبر۔

بات آئی گئی ہوئی۔ اِدھر ہم مجبور اُدھر ہماری طرح "سرکار دام اقبالھم" مجبور۔ بات آئی گئی نہ ہوتی تو کیا ہوتی؟ سالنامہ کی مصروفیتوں نے "سرکار دام اقبالھم" کے بلاوے کا خیال تک بھی بھلا دیا۔ ایک روز ہم سالنامہ کے گرانبار اخراجات اور آمدنی محدود بلکہ مفقود" کے دلچسپ موضوع پر حسب عادت غور کر رہے تھے۔ بہتیرا غور کیا کچھ سمجھ میں نہیں آیا سمجھ میں کیا آتا؛ ناظرین سے درخواست کی تھی کہ ایک ایک جدید خریدار فراہم کر دیں۔ وہ کسی نے نہ کیا۔ جن خریداروں کے چندے ختم ہو گئے تھے ان سے کہا کہ بھائی آئندہ سال کا چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدو وہ بھی نہوا آخر اس غور و فکر سے دل گھبرا گیا اور ہم دفتر سے اٹھکر ٹہلتے ٹہلتے بیرونی پھاٹک پر جا کھڑے ہوئے۔ خیالات بھی ساتھ ساتھ گئے اور دماغ میں ٹہلنے لگے " اتنے بلاک سہ رنگ بنوانے ہیں اتنے یک رنگ ہوں ٹائیٹل کے لئے کیسا بلاک بنوایا جائے۔ ابھی ایک مضمون بھی لکھنا ہے" اتنے میں ایک نیولائٹ سوٹڈ بوٹڈ بزرگ نے سلام کلام تعارف سب کو بالائے تہذیب" رکھکر ہم سے پوچھا "کیوں جی تم جانتے ہو؟ کہ جناب مولوی سید سراج احمد صاحب سراج ایڈیٹر رسالہ کائنات لاہور کا مکان یا کائنات کا دفتر کونسا ہے؟" جواب کیا دیتا؛ انہیں دفتر میں لا بٹھایا۔ اور کہا فرمایئے؟ مگر وہ "سراپا دانش" اسی پر اصرار فرماتے رہے کہ آپ ایڈیٹر صاحب کو بلا دیجئے۔ میں نے مودبانہ عرض کیا کہ صاحب بہادر آپ کیا سمجھتے ہیں ایڈیٹر صاحب کو! وہ بہت بڑے آدمی ہیں! آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ جب تک آپ مجھ سے گفتگو فرمایئے۔ انہوں نے اپنا نام، وطن، وغیرہ بتائے اور اس کے بعد سراپا سوال بنکر پوچھنے لگے اور تم؟ میں نے کہا کہ "میں کائنات کا چپڑاسی ہوں" ہنسے اور پھر "نا مرد سخن... " یہ کند چھری پھیر کر کہنے لگے آپ تو قابل آدمی معلوم ہوتے ہیں! میں نے مسکرانے میں ان کی تقلید کرتے ہوئے عرض کیا " تو پھر کیا ابھی تک آپ کسی ناقابل کا انتظار کر رہے ہیں؟ اب بھی وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکے تو میں نے سلسلہ کلام کو یوں ختم کیا " یاد کیجئے کہ میں ہی سراج ہوں"، کیا بتاؤں کہ کس پھرتی سے وہ اچھل کر کھڑے ہوئے اور بائیں ہاتھ سے کوٹ کا دامن سنبھالتے ہوئے دہنا ہاتھ ملانے کی عاجلانہ کوشش کی ہے کہ لطف آگیا۔ فرمانے لگے "میں مصاحب... سرکار دام اقبالھم ہوں"، آپ کا شش شبنہ والا مضمون "سرکار دام اقبالھم" نے پسند فرمایا اور بلایا بھی مگر افسوس آپ نے زریں موقعہ کھو دیا ورنہ انعام لیکر آتے۔ میں نے کہا "صاحب بہادر! میں نے سچی بات لکھدی تھی مگر دائے قسمت کہ نئے لباس کیلئے نہ اس وقت میری جیب میں پیسے تھے نہ اتفاق سے آپ کے "سرکار دام اقبالھم" کی جیب میں۔ دونوں طرف مجبوریوں کا عالم تھا۔ صبر شکر کر کے بیٹھ گئے۔"

صاحب بہادر مصاحب خاص "سرکار دام اقبالھم" بہت دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور "میر منشی یعنی پیشکار خاص سرکار دام اقبالھم" کی شکایت کرتے رہے کہ "وہ نور باف بعض خطوط کو سرکار دام اقبالھم کے روبرو پیش نہیں کرتا وغیرہ"، چلتے وقت میں نے کہا "سال ختم ہو چکا ہے سرکار دام اقبالھم سے دو روپیہ چندہ بھجوا دیجئے گا"، (سراج)

حضرت امام حسن ابن علی علیہم السلام کے دست مبارک کا لکھا ہوا

قرآن کریم

یہ قرآن کریم ہرن کی کھال پر خط کوفی میں لکھا گیا ہے۔ جس کے نوے ورق موزۂ کابل کے کتب خانہ میں اب بھی موجود و محفوظ ہیں۔ ان نوے اوراق میں سور ہائے مبارکہ نحل، اسرے، کہف مکمل ہیں۔ اس قرآن مجید کی تحریر حضرت امام حسنؑ سے منسوب ہے۔ شیخ محمد رضا خاں مدیر موزہ کا بیان ہے کہ یہ اوراق انقلاب کابل اور بچہ سقہ کے عہد میں پریشان و منتشر اور دور نادر شاہی میں پھر دستیاب ہوئے۔ لیکن افسوس کہ ان میں سے وہ نود ۹، ورق جن میں حضرت شیخ بہاء الدین محمد آملی نے اس امر کی تحقیق و تصدیق کی تھی کہ واقعی یہ تحریر حضرت امام حسن علیہ السلام کے ہاتھ کی ہے۔ کہیں ایسے گم ہوئے کہ اب تک دستیاب نہ ہوئے۔ البتہ اس گم شدگی سے قبل قران مجید کا معہ تصدیق شیخ بہاء الدین محمد آملی فوٹو لے لیا گیا تھا جو اس وقت بھی موزۂ کابل میں موجود ہے۔

یہ فوٹو جس کا بلاک سامنے کے صفحہ پر دیا گیا ہے چند آیات پر مشتمل ہے۔ جو سورۂ نحل کی ہیں اور جو "فلا تحسبن الله غا... سے شروع ہو کر کلمۂ فیقول الذ" پر ختم ہوتی ہیں۔

یہ معلومات ہمیں مجلہ "کابل" (افغانستان) سے حاصل ہوئی ہیں اور یہ بلاک بھی اسی رسالہ کے فوٹو سے تیار کرایا گیا ہے۔

(ادارہ)

کاغذات ۳ قر



قرآن کریم
حضرت امام حسن علیه السلام

قطعہ تاریخ کائنات

بابت سالنامہ سال رواں

نتیجہ فکر جناب شیخ بنے میاں صاحب جوہر چاندوڑی

خضر کی سی پائے دنیا میں حیات　　کسقدر دلکش ہے تو اے "کائنات"

ہیں ثنا خواں تیرے آزاد و ادیب　　مجھ سے ہوں کیونکر بیاں تیری صفات

تجھ میں پاتا ہوں سخن آزاد کا　　جسکی شیرینی ہے از قند و نبات

ہیں مدیر اولیں سید سراج　　منتخب بزم ادب ہیں جن کی ذات

یوں کہو جوہر اگر ہے فکر سال　　کیا ہے مرغوب عالم "کائنات"

۱۹ ۶ ۳۲

(آزاد سے مراد حضرت حکیم آزاد انصاری اور ادیب سے مولانا محمد حسین ادیب مراد ہیں)

صفدر جنگ مشیر الدولہ فخر الملک بہادر دام اقبالہ

نواب میر سرفراز حسین خاں بہادر حیدر آباد دکن کے امراء عظام میں خاص وجاہت و شان کے قدیم خاندانی امیر ابن امیر ہیں جن کے جد اعلیٰ نواب بیرم خاں خانخاناں گورنر خراسان، شہنشاہ بابر کے ساتھ ہندوستان آئے۔ بابر اور ہمایوں ان کی اعلیٰ قابلیت اور قابل اعتماد کارگزاریوں کے سبب ان کی بہت عزت کرتے اور ان پر کامل بھروسہ رکھتے تھے چنانچہ جب ہمایوں کے انتقال کا وقت قریب آیا تو اپنے فرزند اکبر ولیعہد سلطنت کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا۔ چونکہ اکبر کم عمر تھا، لہذا بحیثیت نائب شاہ جملہ امور سلطنت نواب بیرم خاں ہی انجام دیتے رہے۔ جب اکبر سن شعور کو پہنچے تو آپ نے نہایت وفادارانہ طور پر زمام سلطنت اکبر بادشاہ کے ہاتھ میں دیدی یہی وجہ تھی کہ شہنشاہ اکبر کبھی کوئی اہم کام اپنے مدبر اور وفادار مربی نواب بیرم خاں کے مشورہ کے بغیر سرانجام نہ دیتا تھا۔

ان کے فرزند عبدالرحیم خاں بھی اپنے نامور باپ کے قدم بقدم بہترین مدبرانہ و شجاعانہ خدمات سے بادشاہ کے معتمد اور خطاب خانخاناں سے سرفراز رہے۔ آپ اس قدر فیاض اور سخی تھے کہ تاحیات کبھی کوئی حاجتمند آپ کے در سے خالی نہ گیا۔ ایک شاعر کو ایک قصیدہ کے صلہ میں چاندی سے تول دیا تھا۔ بعض مقدر کے شاکی جب آپ کی بارگاہ سخاوت میں پہنچے تو بجائے کوئی نقد رقم دینے کے ایک قاب پلاؤ کی اور ایک زردے کی سائل کے گھر بھجوادی جاتی۔ لیکن پلاؤ کے نیچے روپے اور زردے کے نیچے اشرفیاں ہوتیں اس سے آپ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ داد و دہش کی دوسروں کو خبر نہ ہو لیکن پھر بھی یہ بات اس قدر مشہور ہوئی کہ "میر خانخاناں جن کے کھانے میں بطانہ"، ضرب المثل بن گئی۔

میر امانت خاں بیرم خاں کے پوتے تھے یہ بھی اعلیٰ خدمات پر ممتاز رہے شہنشاہ اکبر ان کی قابلیت اور نظم و انتظام کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان کے فرزند میر معین الدین خاں جو بعد میں امانت خاں دوم کہلائے، شاہجہان اور اورنگ زیب کے عہد میں مختلف صوبجات کی گورنری پر سرفراز رہے۔

نواب میر کاظم علی خاں بہادر، نواب فخر الملک بہادر حال کے پردادا سلطان ٹیپو کے قوت بازو تھے کسی وجہ سے ناراض ہو کر حیدر آباد چلے گئے اور حیدر آباد دکن کے دیوان نواب میر عالم کی بہن سے شادی کی۔ ان کے فرزند نواب میر عباس علیخاں المخاطب بہ نواب نظام یار جنگ نظام یار الدولہ حسام الملک حسام الامراء خان خاناں بہادر تھے۔ ان کے فرزند نواب میر غلام حسین خاں مخاطب بہ نواب نظام یار جنگ حسام الدولہ فخر الملک بہادر جن کی سخاوت کا شہرہ تمام دکن میں زبان زد ہر خاص و عام ہے۔ آپ کے فرزند رشید نواب فخر الملک بہادر حال تباریخ ۱۴ ار محرم الحرام ۱۲۷۰ھ پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی، اور انگریزی کی تعلیم نہایت قابل اہل زبان اساتذہ سے حاصل کی۔ خاندانی خطاب حسام الملک خانخاناں آپ کے حقیقی برادر بزرگ نواب نظام یار جنگ بہادر کو ملا۔ اور آپ صفدر جنگ مشیر الدولہ فخر الملک بہادر کے شاندار خطابات سے سرفراز ہوئے اور حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخاں شہریار دکن کے مصاحب خاص اور کونسل آف ریجنسی کے رکن ہوئے جسکے میر مجلس خود حضرت غفران مکان تھے۔

کوئن وکٹوریہ نے جب قیصرۂ ہند کا لقب اختیار کیا تو ہمراہ غفران مکان آپ بھی شریک اجلاس دہلی تھے۔

۱۸۸۴ء میں جبکہ مارکوئیس آف رپن بغرض ادائے مراسم

"معاون و سرپرست کائنات" نواب فخر الملک بہادر دام اقبالہ"



تخت نشینی حضرت غفران مکان حیدرآباد گئے تو پیشوائی کے لئے آپ ہی تشریف لے گئے تھے۔ ایک مدت تک کونسل آف اسٹیٹ کے آپ رکن رہے اور جب کیبنٹ کونسل مرتب ہوئی تو اس کے بھی آپ ایک اہم رکن تھے۔

جب آپ وزیر پولیس مقرر ہوئے تو اس تدبر و فراست اور خداداد ذہانت و قابلیت کا ثبوت دیا کہ جلد ہی وزارت عدالت، کوتوالی و تعلیمات و امور مذہبی و امور عامہ آپ کے سپرد کئے گئے۔ عرصہ تک مجلس وضع قوانین کی صدارت کے فرائض نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے۔

۱۳۳۱ھ میں صیغہ کورٹ آف وارڈس بھی براہ راست آپ ہی کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ جملہ صیغہ جات و محاکم میں آپ کی خدمات جلیلہ بے نظیر یادگار ہیں ۱۳۳۶ھ میں آپ ان ذمہ دارانہ خدمات سے سبکدوش ہوئے۔

امرائے عظام دکن میں اس امر کی اولیت کا سہرا بھی آپ ہی کے سر ہے کہ اپنے فرزندان سعید کو یورپ بھیجکر تعلیم دلائی ملکہ وکٹوریہ آنجہانی نے اکثر آپ کے صاحبزادگان بلند اقبال کو زمانہ طالب علمی میں باریابی کا اعزاز بخشا۔ اب آپ کے تمام فرزندان عزیز سرکار نظام میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہیں۔

آپ کو گھوڑے کی سواری اور شیر کے شکار سے بہت شوق ہے۔ چنانچہ آپ نے ایک سو سے زائد شیروں کا شکار کیا ہے۔ اگر صرف واقعات شکار ہی کو بیان کیا جائے تو ایک مکمل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ تمام مردانہ کھیلوں سے آپ کو دلچسپی ہے۔ جس کا تفصیلی تذکرہ تو اس مختصر مضمون میں سما نہیں سکتا بالاجمال یہ ہے کہ نیزہ بازی، شمشیر افگنی، فٹ بال کرکٹ کا شغل تقریباً روزانہ کا معمول ہے۔ آپ کی نشانہ بازی کا تو دکن بھر میں شہرہ ہے۔ اور سب سے بڑا ثبوت جو موجود ہے کہ جو شیر زد پہ آگیا بچ کر نہ جا سکا۔

حیدرآباد میں پولو کی ابتدا آپ ہی کے ذوق سلیم نے کی۔ اور آپ ہی کی دیکھا دیکھی دوسروں کو بھی شوق پیدا ہوا۔ اسوقت بھی جبکہ آپ کا سن مبارک ۸۵ سال ہے (خدا مزید ۸۵ سال جواں ذوق و جواں بخت، جواں زور سلامت رکھے) روزانہ بلاناغہ بلکہ دونوں وقت ورزش کرتے اور میل ہا میل پا پیادہ تفریح فرماتے اور گھوڑے کی سواری کرتے ہیں۔

اعلیٰ دماغی اور نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کا یہ عالم ہے کہ جن لاینحل مسائل میں بڑے بڑے مدبرین و سیاسین ملک عاجز رہ جائیں نہیں آپ کا ناخن تدبیر پلک جھپکاتے حل کر دیتا ہے۔ اپنے عہد حکومت و وزارت میں آپ نے ایسی ایسی الجھی ہوئی گتھیوں کو بعجلت تمام سلجھایا اور وہ دوررس نتیجہ اخذ فرمایا کہ تمام اہل دانش و بینش انگشت بدنداں رہ گئے۔

بذلہ سنجی، سخن فہمی، ادب نوازی اور علم پروری کا کیا کہنا بذل و سخا اور داد و دہش تو گویا آپ نے ورثہ میں پائی ہے آپ ہمیشہ زبان کے بجائے دست زر پاش سے داد دیا کرتے ہیں خلیفہ مامون رشید کا حکم تھا کہ جس شخص کی بات پر ہم ایک کلمہ بھی تعریفی کہدیں اسے فوراً ایک ہزار دینار انعام دیا جائے۔ لیکن اس سنی سنائی بات کا اگر زندہ ثبوت اور مکمل نمونہ عہد حاضرہ میں دیکھنا ہو تو وہ نواب فخر الملک بہادر کی ذات ستودہ صفات ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ ؎

"ترا دیدہ و یوسف را شنیدہ
شنیدہ کے بود مانند دیدہ؟"

(ادارہ)

برکاتِ دنیا

(از حضرت حکیم آزاد انصاری مدظلہٗ)

(بر طرح مشاعرہ سٹی کالج حیدرآباد دکن)

جن میں کچھ حوصلہ ہے دنیا میں
ان پہ فضلِ خدا ہے دنیا میں

سٹی کالج کے نوجواں طلبا،
پوچھتے کیا ہو کیا ہے دنیا میں

طالب اوج و عز و شاں طلبا،
جو ہے، سب سوجھتا ہے، دنیا میں

ہر بشر کو دکھائی دیتا ہے،
عرش و فرش و سما ہے دنیا میں

ہر نظر کو سجھائی دیتا ہے
مہر و ماہ و سہا ہے دنیا میں

سارے اہل نگاہ واقف ہیں
آگ، پانی، ہوا، ہے دنیا میں

سب سپید و سیاہ واقف ہیں
روح ہے، مادہ ہے دنیا میں

ایک جاہل بھی علم رکھتا ہے،
ابتدا، انتہا ہے دنیا میں

ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے
خبر و مبتدا ہے دنیا میں

کون ہے؛ جس کو یہ یقین نہیں!
کارِ بد کی سزا ہے دنیا میں

کون ہے؛ جس کے دلنشین نہیں!
نیکیوں کی جزا ہے دنیا میں

کونسی چیز اس جہاں میں نہیں
دکھ ہے، دکھ کی دوا ہے دنیا میں

کونسی جنس اس دکاں میں نہیں
سکھ ہے سکھ کا مزا ہے دنیا میں

اخذ دلچسپی نظر کے لئے،
حسنِ دلکش ادا ہے دنیا میں

دعوت گوشِ ہر بشر کے لئے
نغمۂ دلربا ہے دنیا میں

جس طرف دیکھئے ہجوم بہار
جنتِ دلکشا ہے دنیا میں

جس طرف جائیے گل و گلزار
خلد کی سی فضا ہے دنیا میں

اختلافِ مزاج کے ہوتے، اعتدال تو ہے دنیا میں
ظلم و طغیاں کے راج کے ہوتے امن فرما نروا ہے دنیا میں

غصہ و کینہ و حسد کے خلاف خلق و حلم و حیا ہے دنیا میں
ستم و جور لاتعد کے خلاف عدل و صدق و صفا ہے دنیا میں

کار ارشاد و اہتدا کے لئے طبقہ انبیا سے دنیا میں،
طالب قربت خدا کے لئے خود وجود خدا ہے دنیا میں!

واقفانِ ہنر کی نظروں میں خاک بھی کیمیا ہے دنیا میں
صاحبانِ بصر کی نظروں میں مِس بھی رشکِ طلا ہے دنیا میں

جام صہبائے عشق و الفت سے ہر نفس کیف زا ہے دنیا میں
بعدِ مردن جیئے تو خاک جیئے، زندگی کا مزا ہے دنیا میں

چاہنے والے کے لئے ہر آں، دو جہاں کا بھلا ہے دنیا میں،
ڈھونڈنے والے پر بدل قرباں دولت دوسرا ہے دنیا میں

جس قدر عقل و فہم میں لائے اس سے بھی کچھ سوا ہے دنیا میں
جس جگہ تک قیاس پہنچائے اس سے لاکھوں گنا ہے دنیا میں

دوستو! دین ہو کہ دنیا ہو، جو ملا ہے، ملا ہے دنیا میں
خواہ ادنیٰ ہو خواہ اعلےٰ ہو، جو بنا ہے، بنا ہے دنیا میں

کار دنیا کو چھوڑ کر بے کار، بیٹھ رہنا بُرا ہے دنیا میں
ترکِ دنیا کے خبطیو! ہشیار! ترکِ دنیا خطا ہے دنیا میں

راہ پویانِ آرزو کو نوید، ہر طرف راستا ہے دنیا میں
فیض جویانِ چار سو کو نوید درِ ہر فیض وا ہے دنیا میں

ماحصل یہ کہ سعی و کوشش کا　　کامیابی صلہ ہے دنیا میں

غالب کے لطیفے

(سراج)

مرزا غالب کے متعلق بہت سے لطائف مشہور ہیں لیکن آج جو لطائف ہم لکھ رہے ہیں وہ کسی کتاب سے ماخوذ نہیں۔

دربار رامپور میں:۔ حضرت غالب ایک دفعہ دربار رامپور میں پہنچے۔ نواب کلب علی خاں خلد آشیاں سریر آرائے حکومت تھے۔ اتفاق سے عین اس وقت جبکہ نواب صاحب مرزا غالب سے باتیں کر رہے تھے ریزیڈنٹ بہادر کی آمد کی اطلاع ملی۔ نواب صاحب نے کھڑے ہوتے ہوئے فرمایا اچھا غالب صاحب اللہ کے حوالے۔ غالب صاحب بھلا کب چوکنے والے تھے فرمانے لگے حضور! اللہ نے آپ کے حوالے کیا تھا آپ لوٹ کے پھر اللہ کے حوالے کئے دیتے ہیں؟ نواب صاحب متبسم ہوئے اور انعام کا حکم فرمایا۔

حساب برابر ہوگیا:۔ مرزا غالب ایک شب میر مہدی مجروح سے باتیں کرتے کرتے کہنے لگے کہ آج کوئی بھلا آدمی آجاتا تو پاؤں دبواتے مجروح نے کہا کیوں استاد کیا ہم بھلے آدمی نہیں ہیں؟

غالب:۔ ہاں بھائی تم ایسے بھلے آدمی نہیں ہو کہ تم سے یہ کام لیا جائے۔

مجروح:۔ میں تو ضرور پاؤں دباؤنگا۔ ایسا ہی ہے تو پیسے دیدیجئے گا۔

غالب:۔ بھئی تم تو مجبور کرتے ہو۔ اچھا تمہاری خوشی۔

میر مجروح جب پاؤں دبا چکے تو کہنے لگے لاؤ استاد پیسے!

غالب۔ بھائی حساب تو برابر ہوگیا۔

مجروح۔ وہ کیسے؟

غالب۔ "تم نے ہمارے پاؤں دابے۔ ہم نے تمہارے پیسے دابے"

؟:۔ ایک دوست نے غالب کو لکھا حضرت دلّی سے تھوڑا سا خالص سرکا دو لے کے لئے بھیجدیجئے۔ آپ نے فرمائش کی تعمیل تو کردی لیکن ساتھ ہی لکھ بھیجا کہ "صاحب سرکا" بھیجوں یا "پاؤں" کا؟ مطلب یہ تھا کہ "سرکہ" ہ سے کیوں نہ لکھا؟ الف سے کیوں لکھا؟

شیطان غالب ہے:۔ ایک روز مرزا صاحب ایک غزل لکھنے بیٹھے شاگردوں کا ہجوم سرگرم گفتگو تھا۔ آپ نے پہلے تو خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ لیکن نوجوان پارٹی اور خاموشی! اجتماع ضدین کے مترادف ہے۔ یہ ہدایت قطعاً بے اثر ثابت ہوئی پھر آپ نے حکم دیا کہ سب اس جگہ سے چلے جائیں اور باہر صحن میں بیٹھیں۔ سب نے بخوشی تعمیل کی مگر صحن میں پہنچکر آزادی سے قہقہے لگانے شروع کئے۔ مرزا صاحب نے ہرچند خیالات کو یکسو کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود شاگردوں میں برابر سرگوشیاں جاری تھیں۔ جب ہی ذرا ادھر خیالات مجتمع ہوتے تب ہی صحن سے اس زور کا اجتماعی قہقہہ بلند ہوتا کہ گنبد گردوں بھی گونج اٹھتا۔ آخر مرزا صاحب نے قلم ہاتھ سے رکھدیا اور شاگردوں سے فرمانے لگے کہ بھئی آج تم نے میرے خلاف کیا سازش کی ہے؟ انہوں نے نہایت سادگی سے بیساختہ کہدیا کہ حضرت! کیا عرض کریں "شیطان غالب" ہے۔

تا کہ دن کو تکلیف نہ ہو:۔ ایک شب غالب صاحب کے پاس بہت سے دوست ملنے آئے جن میں بعض نئے دوست بھی تھے جب وہ رخصت ہونے لگے تو غالب صاحب شمع لیکر دروازہ تک پہنچانے گئے احباب نے جوتے پہنتے ہوئے کہا کہ بس حضرت اب آپ تکلیف نہ فرمایئے۔ غالب صاحب اپنے جوتے کی طرف اشارہ کرکے، جو فرش کے پاس ہی دوسرے جوتوں میں ملا جلا پڑا تھا کہنے لگے کہ صاحب رات کو اس لئے تکلیف کر رہا ہوں تا کہ دن کو تکلیف نہ ہو۔ (یعنے کوئی صاحب بھول چوک میں جوتہ تبدیل نہ کرلیں یا بغل میں داب کے چلتے نہ بنیں) اس پر سب دوست کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

تاریخ:۔ ایک بے تکلف دوست نے دریافت کیا کہ مرزا صاحب آپ نے اپنی کوئی تاریخ پیدائش بھی لکھی؟ ہمارا مادہ تاریخ لفظ "تاریخ" ہے جو دہی مرزا صاحب ان سے ایک سال بڑے تھے فرمانے لگے سنو۔ ہاتفِ غیب اس طرح چیخا، تیری تاریخ میرا تاریخا

کائنات طاہرہ



مولانا محمد حسین صاحب ادیب ایم اے بی ایچ ڈی
حیدرآباد دکن

شاعر کا تخلیقی کارنامہ

(جناب مولانا محمد حسین صاحب ادیب ایم اے بی ای ڈی - حیدر آباد دکن)

مغربی دنیا میں نقادوں کی ایک جماعت "حقیقیّین" یا "فطریّین" کے نام سے موسوم ہے - ان کے نزدیک کسی واقعہ، منظر، معاملہ یا جذبہ کو من وعن بیان کر دینا کمال شاعری ہے - انگلستان کا سب سے بڑا فطرت پرست شاعر ورڈس ورتھ تھا - اس نے اپنی شاعری کا موضوع معمولی دیہاتی زندگی کے حالات و واقعات قرار دیئے تھے - اور زبان بھی وہی اختیار کرنے کی کوشش کی تھی - جو عام طبقہ کے لوگوں میں بولی جاتی ہے - لیکن جیسا کہ اس کے سوانح نگار مسٹر میئرس کا بیان ہے کہ ورڈس ورتھ کو اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی - کیونکہ اس کی وہی نظمیں بلند پایہ سمجھی جاتی ہیں جن میں اس نے اعلیٰ جذبات اور لطیف خیالات کی ترجمانی کی ہے - اور پیرایۂ بیان بھی معمولی بول چال سے بالاتر اختیار کیا ہے - لیکن جہاں اس نے اپنے نظریہ پر عمل کیا ہے وہاں اس کا کلام بالکل بے مزہ - پھیکا اور بے اثر ہے - بایں ہمہ ہمارے ملک کے بعض نقاد بھی مغربی "حقیقیّین" کی کورانہ تقلید میں قدیم شعراء کے تخیلی کارناموں کو غیر فطری اور حقیقت و واقعیت کے منافی خیال کر کے انہیں بدنام کرتے ہیں - چنانچہ مولانا حالیؔ نے بھی اپنے "مقدمہ شعر و شاعری" میں ورڈس ورتھ کی ہمنوائی کرتے ہوئے نیچرل اور ان نیچرل یعنی فطری اور غیر فطری شاعری کی بحث چھیڑی ہے - مولانا کے خیال کے مطابق جو غالباً ورڈس ورتھ سے مستعار ہے - شاعری کو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنے فطرت و عادت کے مطابق ہونا چاہیئے - لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے مطابق ہو - معناً نیچر کے مطابق ہونے سے مطلب یہ ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں - لیکن یہ خیال خواہ وہ حالیؔ کا ہو یا ورڈس ورتھ کا تحقیق کی کسوٹی پر کھرا ثابت نہیں ہوتا - ہر ملک اور ہر قوم میں سنجیدہ ادبی زبان کو عام بول چال کی زبان پر تفوق و ترفع حاصل رہا ہے - پھر دائرہ ادبیات میں بھی شاعرانہ زبان نثری زبان سے ممتاز ہوتی ہے - گلی کوچوں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ لطیف خیالات و جذبات کی کب حامل ہو سکتی ہے - فی الحقیقت لفظی اعتبار سے کلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے نحوی و عروضی اسقام سے پاک ہو - نہ یہ کہ وہ معمولی بول چال کے مطابق ہو -

مولانا کی ہدایت کی دوسری شق بھی غور طلب ہے - آپ کی رائے ہے کہ شعر کو معناً بھی فطرت کے مطابق ہونا چاہیئے - جس کا مطلب یہ ہے کہ شعر میں وہی باتیں بیان ہونی چاہئیں جو ہمیشہ دنیا میں پیش آیا کرتی ہیں - لیکن دنیا میں جو واقعہ جس طرح پیش آئے اسے ہو بہو بیان کر دینا گویا تخیل و خیال آرائی کے پر و بازو کو توڑ دینا ہے حالانکہ تخیل اور خیال آرائی شاعری کے اہم عناصر ہیں - بعض وقت شاعر کا تخیل ایسے ایسے نورانی پیکر تیار کرتا ہے جن کا اس عالم آب و گل میں کہیں وجود بھی نہیں ہوتا - چنانچہ صاحب "مراۃ الشعر" تخیل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں - کہ "جذبہ اور توہم کی شدت جب اپنا کام کرتی ہے تو کچھ کا کچھ دکھاتی ہے - رسی کو سانپ اور سایہ کو بھوت بناتی ہے اور نگاہ و خیال دونوں کو مسحور کر دیتی ہے اسی لئے کبھی کبھی آدمی باغ و راغ کا تصور کرتے کرتے دیکھتا ہے کہ سامنے برف و سرسر کا نہیں بلکہ چاندی کا پہاڑ کھڑا ہے - موتیوں کا مینہ برس رہا ہے سیماب کے ندی نالے اپنی لہر بہر میں بہے چلے جاتے ہیں - بلندیوں سے نورانی آبشار گرتے ہیں - اور سمع خراش شور کے بجائے رود و سرود کے نغمے پیدا کرتے ہیں - وادی کا درخت زمرد کا درخت ہے اور

شاخ شاخ طلائی ہے۔ لال و عقیق ۔ درّ و مرجان کے پھول پھل لگے ہیں اور ادھر ادھر جو سیر کرتے پھرتے ہیں آدمی نہیں پری زاد ہیں جب چاہتے ہیں اڑنے لگتے ہیں یہ ساری شعبدہ بازیاں وہم کی ہوتی ہیں جسے تخیل بھی کہتے ہیں۔"

الغرض شاعران وہمی اور تخیلی اشیاسے بھی اپنا گلدستہ سخن سجا تا ہے اور سامعین کو محظوظ و مسرور کرتا ہے۔ مولانا حالی تو اسے غیر فطری ضرور کہیں گے لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ غیر فطری کلام ان کے فطری کلام سے کہیں زیادہ پر لطف و پر اثر ہوتا ہے۔ حالی کو بھی ورڈس ورتھ کی طرح اپنے نظریہ پر عمل کرنے میں ناکامیوں کا مونہہ دیکھنا پڑا۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ مولانا حالی کے وہی اشعار دل میں کھبنے والے اور اثر رکھنے والے ہیں جو قدیم رنگ میں کہے گئے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اس رنگ کو غیر فطری سمجھکر ترک کر دیا تھا اور جہاں مولانا نے معمولی بول چال کی زبان میں محض واقعہ نگاری کی ہے۔ وہاں ان کا کلام بالکل پھسپھسا اور بودا بن گیا ہے۔ مثلاً یہاں ان کے قدیم و جدید کلام کے دو نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ ناظرین ان کی خوبیوں یا خامیوں کا خود موازنہ کرلیں۔ قدیم "غیر فطری" رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محرم دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخل ایمن و ہر سنگ طور تھا!

دردِ کہ لب پہ حالِ دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک دور تھا

دردی کشان بزم مغاں کا نہ پوچھ حال
ایک ایک رند نشۂ وحدت سے چور تھا

اب بار یاب انجمن عام بھی نہیں!
وہ دل کہ خاص محرم بزم حضور تھا

روز وداع بھی شب ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شام بلا کا ظہور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا

ان پھڑکتے ہوئے اشعار کے بالمقابل دنیا میں اکثر پیش آنے والے واقعات کو معمولی بول چال کی زبان میں نظم کر دینے کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو جس کو "نیچرل شاعری"، کا تمغہ حاصل ہے۔

راہ سے گزرا کہیں میلا کچیلا اک غلام،
اس کے میلے پن پہ لوگوں نے ملامت اس کو کی
عرض کی اک اک رواں ہو جس بدن کا ملک غیر!
اختیار اس کی صفائی کا نہیں رکھتے رہی[1]!
جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال
عذر میلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی،
کیونکہ جسم آدمی میں پیش اہل معرفت
کوئی چیز اس کی نہیں سب ہے امانت گور کی!

آپ اسے اعلیٰ اخلاقی تعلیم کہیں۔ حکیمانہ نکتہ کہیں۔ درس عبرت کہیں غرض کہ جو چاہیں کہیں آپ کو اختیار ہے۔ لیکن اسے شاعرانہ کلام کہنا گویا کند چھری سے شاعری کو ذبح کرنا ہے۔ اس قسم کے خشک پند و موعظت یا واقعہ بیانی کا بہترین ذریعہ نثر ہے نہ کہ شاعری۔

اب آپ نے دیکھ لیا کہ واقعات کو ہو بہو بیان کر دینے سے شعر کس طرح خاک میں مل جاتا ہے۔ "نیچرل شاعری" یا حقیقت نگاری کا نقاب اس کی بدصورتی کو چھپا نہیں سکتا۔ نام نہاد "حقیقیتین" یا "فطرتیین" اور ان کے کورانہ مقلدین غالباً ارسطو کے قول کو اپنا خضر راہ سمجھتے ہیں۔ اس یونانی حکیم نے دوسرے فنون لطیفہ کی طرح شاعری کو بھی ایک محاکاتی فن قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک شاعری ایک قسم کی محاکات ہے۔ کسی خیال۔ جذبہ۔ معاملہ۔ واقعہ یا منظر کی ہو بہو تصویر کھینچ دینا کمال فن کاری ہے۔ نقاش یہ تصویر رنگ کے ذریعہ اور شاعر الفاظ کے ذریعہ کھینچتا ہے لیکن یہ تین ہزار سال پیشتر کا خیال ہے۔ اب دنیا نے بہت ترقی کرلی ہے۔ دور حاضر کے نقادان فن نری محاکات کو منصب شاعری کے منافی خیال کرتے ہیں۔ محاکات کا لفظ فرض کرلیتا ہے کہ کوئی شے پہلے سے موجود ہے۔ جس کی عکاسی۔ نقالی یا تصویر کشی

---

[1] "رہی" عام بول چال کا لفظ نہیں بلکہ ردیف کی مجبوری سے لایا گیا ہے جس کے معنی ہیں

صناع (آرٹسٹ) کا کام ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ شاعر بسا اوقات نئی نئی چیزیں پیدا کرتا ہے۔ جن کا اس عالم آب وگل میں کہیں وجود بھی نہیں ہوتا۔ قدرت کی موجودہ اشیا کو بھی شاعر ان کے اصلی رنگ میں پیش نہیں کرتا بلکہ ان پر تخیل و مبالغہ کا رنگ و روغن چڑھا کر انہیں بہت زیادہ شاندار و نظر فریب بنا دیتا ہے۔ غرض کہ شاعر کا کام "محاکات حیات" نہیں۔ بلکہ "تخلیق حیات" ہے۔ یونانی زبان میں شاعر کے لئے جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس کے معنے ہیں "خالق" فی الحقیقت شاعر کا دماغ خلاق ہوتا ہے۔ وہ صرف دنیا میں آئے دن پیش آنے والی باتوں ہی کی ترجمانی نہیں کرتا جیسا کہ مولانا حالی کا خیال ہے۔ بلکہ وہ واقعات گڑھتا ہے کردار ایجاد کرتا ہے۔ رجال داستان کو پیدا کرتا ہے ان سے مختلف جذبات و احساسات منسوب کرتا ہے۔ قدرتی اشیا ومناظر کو بھی اس کے تخیل کی رنگ کاری نئے نئے لباس میں جلوہ گر کرتی ہے۔ انگلستان کا زبردست شاعر پرسی شیلی کہتا ہے کہ:-

"شاعر کو دنیا کی فانی خوشیوں کی تلاش نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے چمنستان خیال میں گلگشت کرنے والے پری پیکروں کے بوس وکنار سے حظ اندوز ہوتا ہے۔ وہ جھیل کی آئینہ صفت سطح پر آفتاب کی شعاعوں کا دلکش رقص ملاحظہ کرتا ہے وہ کناروں پر سبزہ کی لہک سے اپنی آنکھوں میں طراوت پاتا ہے۔ وہ رنگ برنگ کے خوشنما پھولوں کے گرد بھنوروں کے مستانہ انداز میں چکر لگانے کا تماشا دیکھتا ہے۔ لیکن اس دلفریب منظر کی ہوبہو تصویر پیش کرنا وہ اپنی شان خلاقی کی توہین سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ ان عناصر کی آمیزش سے ایسے ایسے طلسمی پیکر اور منظر تیار کرتا ہے جو قدرتی مظاہر و مرایا سے نہ صرف زیادہ خوشنما و دلکش بلکہ غیر فانی و لازوال بھی ہوتے ہیں"

شاعر کا موئے قلم اپنی ہنستی بولتی تصویروں میں جو رنگ بھرتا ہے وہ قدرت کی گلکاریوں سے کہیں زیادہ چوکھا ہوتا ہے۔ علاوہ بریں تاریخی مشاہیر شاعر کے پیش کردہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ثانی الذکر کے کارنامے اول الذکر سے بہت زیادہ شاندار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات دنیا میں انسان اپنی نیکیوں اور برائیوں کا بدلہ نہیں پاتا۔ جس سے ہمارے اخلاقی احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مذہب ہماری تشفی کے لئے عالم عقبے کو دار المکافات قرار دیتا ہے۔ لیکن دنیائے شاعری میں نیکی و بدی کی جزا و سزا ملے بغیر نہیں رہتی۔ شاعر ایسے حالات و واقعات پیدا کرتا ہے جو ہمارے احساس عدل کے لئے تسکین و اطمینان کا باعث ہوتے ہیں۔ المیہ ڈرامہ کا بطل (ہیرو) اگر ناکامیابی سے ہمکنار نہ بھی ہو تو اس کی جانبازی ثابت قدمی۔ اولوالعزمی۔ ایثار نفس اور استقلال و تحمل ہم سے عزت واحترام اور تحسین وآفرین کا خراج ضرور وصول کر لیتا ہے۔

سرفلپ سڈنی کا قول ہے کہ:-

"دنیا میں کوئی علم وفن ایسا نہیں ہے جو اپنے موضوع بحث کے لئے کارخانہ قدرت کا تابع نہ ہو۔ چنانچہ مہندس منجم فلسفی طبیعی مقنن طبیب مغنی سب کو قوانین قدرت و نوامیس فطرت کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن شاعر ہر قسم کی قید و بند سے آزاد ہے۔ وہ عالم کائنات کی کسی چیز کو علی حالہ قایم نہیں رکھتا۔ وہ قدرتی اشیا کو اپنی سحر کاری سے نئی نئی صورتوں میں تبدیل کر دیتا ہے یا اپنے جی سے عجیب وغریب پیکر تیار کرتا ہے وہ محکومانہ یا خادمانہ حیثیت سے کارکنان قدرت کے پیچھے پیچھے نہیں نہیں چلتا۔ بلکہ مساویانہ حیثیت سے ان کے دوش بدوش گامزن ہوتا ہے۔ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ بعض وقت وہ ان سے آگے نکل جاتا ہے۔ خود بساط آرائے شہود نے عروس عالم کو ایسے شاندار لباس اور زیوروں میں کبھی جلوہ گر نہیں کیا۔ جو شاعر اس کی زیب وزینت کے لئے تیار کرتا ہے۔ وہ بنجر زمین اور بے برگ وگیاہ میدان کو خوشنما نہروں، ثمردار درختوں اور رنگ برنگ کے پھولوں سے آراستہ کرکے اسے رشک گلزار بنا دیتا ہے فی الحقیقت یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر قدرت کی عنصری دنیا پیتل کی ہے۔ تو شاعر کی تخیلی دنیا سونے کی ہوتی ہے"

اگر ہم عالم اشیا سے گزر کر عالم انسانی پر نظر ڈالیں تو یہاں بھی شاعر کا

تخلیقی کارنامہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوگا۔ شاعر اپنے گرد واسا آپ پیدا کرتا ہے۔ اور انہیں ایسے اوصاف سے متصف کرتا ہے کہ ان کی نظیر عالم اجساد میں ملنی مشکل ہے۔ بسا اوقات وہ تاریخی رجال کی طرف بھی رجوع کرتا ہے۔ لیکن جس شخص کی طرف اس کی نظر کیمیا اثر مبذول ہوتی ہے اس کے معمولی اوصاف کو وہ منتہائے کمال تک پہنچا کر اسے زندۂ جاوید بنا دیتا ہے۔ نہ معلوم کتنے مجنوں جیسے عاشق۔ نوشیرواں جیسے عادل۔ رستم جیسے پہلوان۔ یوسف جیسے حسین۔ اور حاتم جیسے سخی گلشن دہر کی سیر کو آئے اور چلے گئے نہ ان کی کوئی یادگار قایم ہے نہ ان کا کوئی نام لیوا باقی ہے لیکن مجنوں۔ نوشیرواں رستم۔ یوسف۔ اور حاتم کے کارناموں کو جس نے اجاگر کیا ان کے معمولی اوصاف کو جس نے معراج کمال تک پہنچایا۔ ان کے نام کو جس نے بقائے دوام عطا کیا۔ وہ شاعر کی مقدس ہستی ہے چنانچہ فردوسی کا یہ شعر اس پر شاہد ہے ؎

منش کردہ ام رستم پہلواں ؛ وگرنہ یلے بود در سیستاں

ان واقعات کی موجودگی میں شاعر کی خلاقی کا کون منکر ہوسکتا ہے؟ ہزلٹ جیسے زبردست نقاد کا قول ہے کہ" واقعہ بیانی یا حقیقت نگاری شاعری کے منصب سے گری ہوئی چیز ہے۔ قدرتی اشیاء و مناظر کی ہو بہو تصویرکشی یا فطری جذبات و احساسات کی من و عن ترجمانی شاعری کے بلند ترین مقصد کی تکمیل کے لئے بالکل ناکافی ہے کسی واقعہ یا منظر جذبہ یا خیال کو اس کی قدرتی سطح سے بلند کرنا اور اس پر تخیل کا رنگ چڑھا کر اسے زیادہ جمیل و شاندار صورت میں پیش کرنا شاعر کا اصل فریضہ ہے" حقیقت الامر بھی یہ ہے کہ شاعر کا زور تخیل سادہ واقعہ کو عظیم الشان، ادنیٰ کو اعلیٰ، معمولی بات کو عبرت خیز اور بے اثر چیز کو اہتزاز انگیز بنا دیتا ہے۔ کس نے نہ دیکھا ہوگا کہ جب چراغ بجھتا ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے؟ لیکن غالب کی فکر بلند اس ادنیٰ سی بات کو کیسا اعلیٰ و ارفع بنا کر پیش کرتی ہے ؎

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد!

کون نہیں جانتا کہ قطب نما کی سوئی ہمیشہ متحرک رہتی ہے اسے ایک آن بھی قرار حاصل نہیں۔ لیکن سودا کی باریک بینی نے سوئی کے

متحرک رہنے کی جو توجیہہ کی ہے۔ وہ قابل ملاحظہ ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

یہ بھی ایک معمولی بات ہے کہ پتھر پر پانی گر کر قطرے قطرے ہوجاتا ہے لیکن یہ قطرے پھر آپس میں ملکر ایک ہوجاتے ہیں۔ سر اقبال کا حقیقت آشنا دل اس ادنیٰ سے واقعہ میں انسانی زندگی کے روح پرور کرشمے دیکھتا ہے اور حیات بعد ممات کے ثبوت میں ایک زندہ شہادت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہوگئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہوگئی
ہجران قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے
پستی عالم میں، ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

کبھی معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اگر ایک طرف شاعر ادنے اور معمولی چیزوں کو اعلیٰ و ارفع بنا کر پیش کرتا ہے تو دوسری طرف وہ عظیم الشان اشیاء کو ان کے بلند مقام سے نیچے کھینچکر پست سطح پر لاکھڑا کرتا ہے بالعموم دنیا کی بے ثباتی۔ جاہ و جلال کی بے اعتباری۔ دولت و قوت کی ناپائیداری اور کبر و نخوت کی کاواکی دکھانے یا کبھی یاس و حسرت، اور ناکامی و نامرادی کے جذبات ظاہر کرنے کے لئے شاعر یہ پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے۔ مرزا غالب کے حسب ذیل اشعار مثالاً پیش کئے جاسکتے ہیں:۔

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک ؛
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے ؛

ہوئی یہ کثرت غم سے تلف کیفیت شادی
کہ صبح عید مجھ کو بدتر از چاک گریباں ہے!

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے!
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے!

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ؎ ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

یہاں شاعر نے نہایت عظیم الشان و رفیع المنزلت اشیا کو نہایت حقیر رنگ میں پیش کیا ہے۔ وہ عالم کو کفِ خاک سے، آسمان کو بیضۂ قمری سے۔ صبحِ عید کو چاک گریباں سے تشبیہ دیتا ہے۔ اورنگِ سلیماں اور اعجازِ مسیحا کو ایک معمولی بات بلکہ کھیل تصور کرتا ہے۔ ہستی یا اشیا اور ظواہرِ عالم کو محض وہم وخیال کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ جامِ جم پر جامِ سفال کو ترجیح دیتا ہے۔ اور بزمِ کونین کو حلقۂ دامِ خیال کی طرح بے بود قرار دیتا ہے۔

لارڈ بیکن کا بیان ہے کہ شاعری میں ربانی عنصر شامل ہے۔ فلسفہ اور تاریخ کی طرح شاعری ہمارے دل و دماغ کو عالم کے واقعات وظواہر کے تابع نہیں کرتی۔ بلکہ ایسے حالات، واقعات پیدا کرتی ہے جو ہماری دلی تمناؤں کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس طرح ہماری روح میں وسعت و رفعت رونما ہوتی ہے۔ شاعر اپنی دنیا آپ تخلیق کرتا ہے اس سنہری دنیا کے تمام واقعات انسانی روح کے لئے تسکین بخش ہوتے ہیں۔ یہاں کا ہر ذہنی تجربہ پایۂ تکمیل کو پہنچا ہوا نظر آتا ہے اور نقص وعیب سے منزہ ہوتا ہے۔ یہ دنیا اپنے اجزا، کی ہم آہنگی، استواری، اہمیت اور معنی خیزی کے لحاظ سے مثالی (آئیڈیل) ہوتی ہے۔ مسٹر ابر کرامبی نے اس کی تشریح ایک نہایت سادہ اور معمولی مثال سے کی ہے۔ وہ اسٹریلیا کی وحشی قوموں کا ایک گیت نقل کرتے ہیں جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

کنگارو ــــ کنگارو ــــ کنگارو
کنگارو تیز بھاگا
چھوڑا نہ ہم نے پیچھا
ازبسکہ تھا وہ موٹا
مارا جو اس کے سوٹا
چت گر گیا زمیں پر!
بھونا اسے وہیں پر
سب نے مزے سے کھایا

خوش ہو کے گیت گایا
کنگارو ــــ کنگارو ــــ کنگارو

مسٹر موصوف فرماتے ہیں کہ وحشی انسان کے لئے یہ فتحمندانہ گیت ہر طرح جائز اور موزوں ہے۔ اس گیت نے کنگارو کے شکار کو مثالی دنیا کا ایک اہم معاملہ بنا دیا۔ جب وحشی یہ گیت گاتا ہے تو اس کی محویت اسے ایک ایسے عالم میں منتقل کر دیتی ہے جہاں ہر شے اس کی مرضی کے مطابق انجام پاتی ہے۔ آب وگِل کی دنیا میں ہر روز کنگارو کا شکار نہیں ہوتا۔ اگر وحشی آدمی کنگارو کا تعاقب کرے بھی تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ لگ ہی جائے۔ وہ آدمی سے تیز بھاگتا ہے۔ وہ دوڑ کر کسی جھاڑی میں دبک جا سکتا ہے۔ دنیا میں صید افگنی کی ہر مہم کامیاب نہیں ہوتی۔ پھر اگر وحشی کو کنگارو ہاتھ آ بھی جائے تو یہ ضرور نہیں کہ وہ موٹا تازہ ہی ہو۔ بہت ممکن ہے۔ کہ کنگارو بڈھا اور لاغر ہو اور اس کا گوشت سخت۔ سیٹھا اور ریزہ ہو۔ لیکن اگر شاعری کی سنہری مثالی دنیا میں کنگارو کا شکار کیا جائے تو یہاں ہر بات وحشی کے حسبِ خواہش طے پاتی ہے اور اس کی کوئی تمنا بغیر پوری ہوئے نہیں رہتی۔ اگرچہ مثالی دنیا کے شکار کے گوشت سے وحشی کا کام و دہن آسودہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس سے قلب کو جو فرحت ومسرت حاصل ہوتی ہے اس کے آگے زبان کی مادی لذت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ وحشی انسان نے کنگارو جانور کو مثالی نہیں بنایا۔ کنگارو کی فطرت اور عادت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس نے البتہ اپنے احساس کامیابی اور شکار کرنے کے فتحمندانہ تجربہ کو تصوری بنا دیا ہے۔ غرض کہ اس نے اپنی ایک علیحدہ دنیا پیدا کر لی ہے جس کا وہ مالک ہے جس پر وہ فاتحانہ حیثیت سے حکومت کرتا ہے اور جس کے آئین وقوانین اس کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ مست ہو کر گیت گاتا ہے اور اصلی شکار کی زحمتوں اور تکلیفوں کا سامنا کئے بغیر مزے سے بیٹھا ہوا اپنے شاعرانہ شکار کے تجربہ سے حظ اندوز ہوتا ہے۔ ایک قابلِ ذکر امر یہ بھی ہے کہ دنیا کے مادی شکار سے صرف شکار میں حصہ لینے والے ہی لذت یاب اور شادکام ہو سکتے ہیں لیکن دنیائے شاعری کا شکار قومی ملک ہے ہر وحشی بغیر تگ و دو کئے ہوئے اپنے جھونپڑے

میں یا کسی ٹیلہ پر بیٹھ کر گنگا رو کے شکار کا گیت گا سکتا ہے اور اس سے اس کو بیحد مسرت و فرحت حاصل ہو سکتی ہے

جب وحشی انسان اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتا ہے تو مہذب اقوام کے کیا کہنے! ہر شخص دنیا پر قابو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے تمام دنیوی معاملات اس کی مرضی کے مطابق طے پائیں لیکن مادی دنیا کسی کی خواہشوں اور تمناؤں کی مطلق پروا نہیں کرتی۔ وہ اپنی راہ پر چلتی رہتی ہے۔ کسی آدمی کی تمام خواہشیں نہ کبھی پوری ہوئی ہیں نہ ہوں گی۔ کون ہے جسے کبھی مایوسیوں اور نا امیدیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو؟ لیکن شاعر عالم اجساد کی تمام برائیوں اور خامیوں کی اصلاح کر دیتا ہے۔ شاعر کی آفریدہ مثالی دنیا کا ہر واقعہ اور ہر معاملہ اطمینان بخش اور تسکین دہ ہوتا ہے۔ شاعر اس عالم آب و گل کی فطرت نہیں بدلتا دنیا کی تمام برائیاں اور بھلائیاں اس کی مشکلات اور آزمائشات تا ابد قائم رہیں گی۔ شاعر کی نظر خیر اور شر دونوں پر پڑتی ہے۔ اگر وہ اپنے کلام سے شر کا عنصر خارج کر دے تو شاعری محض ایک دل خوش کن فسانہ بن جائے گی۔ جس سے ممکن ہے کچھ لطف و دلچسپی میسر ہو جائے لیکن قلب کو اس سے اطمینان اور تشفی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے شاعر اپنے ذہنی تجربہ کی تکمیل کے لئے خیر اور شر دونوں کو ضروری خیال کرتا ہے۔ وہ دنیا کی برائیوں کو معدوم اور اس کی آزمائشوں کو مفقود نہیں کرتا۔ ان کا وجود ہمیشہ قائم رہے گا۔ وہ صفحۂ ہستی سے مٹنے والی چیزیں نہیں ہیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

لیکن شاعر اپنی سحر کاریوں سے آزمائشات و مصائب کو بھی ایسا خوش آیند بنا دیتا ہے کہ ہم انہیں خوشی خوشی برداشت کر لیتے ہیں وہ سمجھاتا ہے کہ برائی بھی اپنے اندر مفید معنی پنہاں رکھتی ہے۔ شر بھی کسی نہ کسی مصلحت پر مبنی ہوتی ہے۔ تکالیف و مصائب کی بھٹی ہمارے روحانی میل کو دور کر دیتی ہے۔ غرض کہ وہ ناپسندیدہ امور کی بھی اس طرح توجیہہ و تشریح کرتا ہے کہ اس سے ہمارے اخلاقی احساس کو پوری تسکین حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً کون نہیں جانتا کہ نکبت و ادبار ایسی بری بلا ہے جس سے ہر شخص پناہ مانگتا ہے لیکن شکسپیئر نے اپنے ڈرامہ "دلپذیر" (ایز یو لائک اٹ) میں بد اقبالی اور بدبختی کے فوائد کچھ ایسے دل نشین طریقہ سے بیان کئے ہیں کہ جلا وطن و معزول شدہ نواب اور اس کے ہمراہیوں کو اپنی حالت پر نہ صرف صبر ہو جاتا ہے بلکہ وہ اپنی سابقہ خوش حالی پر جلاوطنی کی تکلیف دہ زندگی کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ آج بھی ہر مصیبت زدہ شخص کو شکسپیئر کی یہ عبارت پڑھکر تسکین ہوتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عورت کے لئے بیوگی سے بڑھکر کوئی مصیبت نہیں ہو سکتی لیکن مولانا حالی نے "مناجات بیوہ" میں ایسا پر تاثیر اسلوب بیان اختیار کیا ہے کہ سرسید علیہ الرحمۃ اس سے مسحور ہو کر پکار اٹھے تھے کہ "سہاگنیں بھی صرف اس مناجات کا پورا لطف اٹھانے کے لئے چاہتی ہونگی کہ بیوہ ہو جائیں"۔ زندگی کے مختلف مدارج میں جوانی کا زمانہ سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی بوڑھا آدمی ایسا ہوگا جسے جوانی کی امنگوں کی یاد مغموم و آزردہ نہ بنا دیتی ہو۔ لیکن آپ کسی ضعیف العمر شخص کو براؤننگ کی نظم "ربی بن عذرا" پڑھکر سنا دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ وہ اپنی گزری ہوئی جوانی پر کف افسوس ملنے کے بجائے اپنے بڑھاپے پر فخر و ناز کرنے لگتا ہے یا نہیں؟ یہ سب شاعر کی خلاقی کے ادنے کرشمے ہیں۔ فی الحقیقت شاعر آفریدگار عالم ہے وہ ایسی دنیا تخلیق کرتا ہے۔ جس میں بڑھاپا، بیوگی، مفلسی۔ ادبار وغیرہ موجود ہوں تو ہوں لیکن ان میں تلخی کی جگہ شیرینی پائی جاتی ہے۔

انگلستان کے ایک مشہور نقاد لی ہنٹ کا بیان ہے کہ جہاں علم و حکمت کی آخری منزل ختم ہوتی ہے وہاں سے شاعری کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ شاعرانہ صداقت حکیمانہ صداقت سے بالاتر ہے۔ ہم ایک مالی سے پوچھتے ہیں کہ یہ کونسا پھول ہے وہ جواب دیتا ہے۔ اسے جوہی کہتے ہیں۔ یہ معمولی واقعہ ہوا۔ ایک ماہر نباتات اسے "شش نری یک بعچی" یعنے (Monandria Monogynia) کی ایک نوع قرار دیتا ہے۔ یہ علمی واقعہ ہوا۔ اسپنسر

اسے باغ کی سپید پوش پری کہتا ہے۔ گویا اس نے پھول کی خوشنمائی کے شاعرانہ احساس کا اظہار کیا ۔ یہ جمالیاتی واقعہ ہوا۔ تیجا بن ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور اسے نور و سرور کا منبع قرار دیتا ہے اب پھول کی رعنائی صرف لذت نظر ہی نہیں بخشتی بلکہ اس سے قلب میں بھی گرمی اور اہتزاز پیدا ہونے لگا۔ یہ روحانی واقعہ ہوا۔ جب مغربی شاعر نے اسی پھول کو دیکھا تو مست ہو کر کہا ع

اے گل بتو خرسندم تو بوے کسے داری

اب اس پھول میں حقیقت و معرفت جلوہ گر ہو گئی ۔ غرض کہ ایک ہی جوہی کے پھول کو مختلف آدمیوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھا اور ہر ایک نے اپنے اپنے مذاق و احساس کے مطابق اس کا اظہار کیا ۔ اگرچہ ہر ایک کا انداز اظہار جداگانہ ہے لیکن سب کے سب صادق البیان ہیں ۔ اگر کوئی شخص کہے کہ شاعر کا بیان حقیقت واقعہ کے خلاف اور غیر فطری ہے بھلا جوہی کا پھول سپید پوش پری یا نور و سرور کا منبع یا بوئے یار کا حامل کس طرح ہو سکتا ہے ۔ تو اس کور مذاقی کا کیا علاج؟ شاعر کا ظرف کس قدر وسیع اور اس کا احساس کتنا لطیف و اعلیٰ ہے ؟ اس نے ایک معمولی پھول کو فرش سے اٹھا کر عرش پر رکھ دیا ۔ اس کے کلام سے آنکھوں کو نور کانوں کو لطف ترنم اور دل سرور حاصل ہوتا ہے یہی شاعر کا ایک تخلیقی کارنامہ ہے اس کی دنیا میں جوہی کے بجائے نور و سرور کے پھول کھلتے ہیں

"می باید شنید"

دی شب اندر بوستانِ نوبہار — داشتم پاکیزہ روے درکنار

درچمن من بودم و دلدار بود ! — لیک نرگس برسرم بیدار بود

گفتم اے نرگس خدارا چشم پوش ! — تا نہ بینی عیبِ رند بادہ نوش

چوں زبیباکی کنم بوس و کنار — چوں تو باشی پیش من آئینہ وار

گفت اے رفعت مگر دیوانۂ — از شعارِ اہلِ دل بیگانۂ ؟

درچمن ہر نیک و بد را دیدہ ام — از کہ چشم خویش را پوشیدہ ام؟

عیب جوئی گر شعارِ من بدے — ہر خسے در گلشنم دشمن بدے

ہاں

(ازجناب آرزو صاحب)

بظاہر تو یہ معمولی سہ حرفی لفظ ہے لیکن اس میں ہزاروں امیدیں، نہاں ہیں - وہ کون ہے جو اس کا متمنی نہیں کہ شاہد مقصود کی زبان سے " ہاں " سنے -

گودیوں کھیلتا بچہ جب اپنی شفیق ماں کو یہ کہتے ہوئے سن پاتا ہے تو ایسا خوش ہوتا ہے جیسے ساری دنیا کی نعمتیں مل گئیں کھیلتا کودتا لڑکا والدین سے کسی چیز کی فرمائش کرنے کے بعد اس راحت افزا لفظ کو سن لیتا ہے تو پھولا نہیں سماتا -

حرماں نصیب بیمار فرقت گھڑیاں گن گن کر رات گزارتا ہے اور سینکڑوں آرزوؤں کو پہلو میں لئے ہوئے ؎

علی الصباح چو مردم بہ کار و بار روند
بلاکشان محبت بہ کوئے یار روند!

کی گردان کرتا ہوا کوچۂ جاناں میں پہنچتا ہے اور امید و بیم کی کشمکش میں حیران و سراسیمہ اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ اگر وہ مسیح دم بکمال نازو ادا " ہاں " کہدے تو جاں بلب کی رگ پے میں تازہ روح اور نئی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے - اور مایوس حیات کو انتظار کے دن گزارنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے -

پیر فرتوت جس کی کمر بھی بار الم سے دوہری ہو گئی ہو تبقاضائے سن معمولی سی بیماری یا پیام مرگ لائی ہوئی بیماری کا شکار ہوتا ہے، تو یہی وہ لفظ ہے جو زندگی کی تازہ امید دلا کر نئی حیات بخشتا ہے - ورنہ کسی اپنے یا بیگانے حکیم یا ڈاکٹر کی زبانی اگر اس کے خلاف سن پاتا ہے تو زندگی سے ہاتھ دھو کر قبل از مرگ واویلا کرنے لگتا ہے - غرض یہ عجیب طلسمی لفظ یا افسوں ہے کہ ہر انسان خواہ بچہ ہو، جوان ہو - بوڑھا ہو - امیر ہو - فقیر ہو - اس کا گرویدہ اور متمنی نظر آتا ہے -

---

نہیں

(ازجناب ابوظریف صاحب)

اس مظلوم لفظ سے مجھے بڑی ہمدردی ہے - مظلوم اس لئے کہتا ہوں کہ طبقۂ عشاق ایک سرے سے سارا ہی اس کا دشمن ہے اور یہ امر محتاج تشریح نہیں کہ دنیا کے نوجوان طبقہ میں شاید ہی کوئی ہستی ایسی ہو جو کسی کی عاشق نہ ہو اول تو ہو گی ہی نہیں لیکن اگر بالفرض محال کوئی ہو بھی تو اس کی اوسط تعداد زیادہ سے زیادہ اتنی ہو سکتی ہے جتنی کہ بی اے پاس کی مندر میں یا پی ایچ ڈی کی مسجد میں یا بیرسٹرایٹ لا کی گوردوارہ میں تو یہ تعداد اپنی قلت کے سبب اس قدر حقیر اور ناقابل توجہ ہے جیسے ایک پنڈت جی کی نظر میں اچھوت - پس جس لفظ سے دنیا بھر کے نوجوان یعنے جو بلا پس و پیش عشاق بھی ہیں معہ اپنی نہایت اہم اکثریت کے دشمنی پر تُل گئے ہوں وہ مظلوم نہیں تو کیا ظالم ہے مگر واہ رے " نہیں " تیرا بھی کیا جگرا ہے - ساری اکثریتیں ایک طرف اور تو اکیلا ایک طرف - جہاں معشوق کی زبان سے نکلا اور تمام عشاق کے دلوں کو برماتا ہوا نکل گیا - رہ گئے سارے دیکھتے کے دیکھتے احمق کہیں کے - پھر یہ مقابلہ آج سے نہیں - صدیوں سے جاری ہے - اتنی طویل مدت سے! اتنی زبردست اکثریت سے! اتنی بے پناہ طاقت سے! ایک اکیلا " نہیں " برسرپیکار رہے اور بحمد اللہ کامیاب! اس طرح جہاں ایک طرف یہ مظلوم ہے وہاں دوسری طرف جری - دلیر - بہادر - نڈر - بلکہ کمانڈر - بلکہ کمانڈر چیف کا بھی باپ یعنے فاتح بلکہ فاتح اعظم نپولین اور طارق اعظم سے زیادہ شاندار فاتح - پھر مجھے اس سے ہمدردی کیوں نہ ہو؟ وہ میری ہمدردی کا مستحق ہے بلکہ آپکی ہمدردی کا بھی بشرطیکہ آپ عاشق نہوں - جس کو اس شاندار فاتح سے ہمدردی نہ ہو میں اسے بزدل سمجھتا ہوں بلکہ نرا عاشق سمجھتا ہوں یہ اپنے اندر محبوبیت بھی رکھتا ہے مگر صرف اس وقت اس کی محبوبیت اپنے عروج و کمال پر ہوتی ہے جب " ان " کی زبان سے نکلے " نہیں "

"خانم" ــــــــــ (مصنفہ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے ایل ایل بی وکیل (جودھپور)

میری بقایا فیس

مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی سے ادبی حلقہ بخوبی واقف ہے۔ آپ کا رنگ ظرافت بھی کسی تشریح و تعارف کا محتاج نہیں۔ "خانم" آپ کی بہترین غیر مطبوعہ تصنیف ہے۔ "میری بقایا فیس" اسی بہترین تصنیف کا ایک دلچسپ باب ہے۔ ہم مرزا صاحب کے سپاس گزار ہیں کہ انہوں نے کائنات کے سالنامہ کے لئے اپنی غیر مطبوعہ کتاب کا ایک باب مرحمت فرمایا جسے یقین ہے کہ قارئین کائنات پوری دلچسپی سے پڑھیں گے اور بہت پسند کرینگے لیکن اس پسندیدگی کا اظہار اگر "خانم" کے آرڈروں کی صورت میں کیا جائے تو زیادہ قابل استحسان ہوگا۔ کم از کم اتنے آرڈر مرزا صاحب کو ضرور پہنچ جائیں جس سے موصوف کی بقایا فیس پوری ہوجائے۔ کیوں ٹھیک ہے نہ؟ غالباً اس تشریح کے بعد یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ کوئی صاحب اس مضمون کو بلا اجازت نقل نہ کریں۔ (مدیر)

مارواڑ کی ایک جھلک

نئے وکیلوں کا عموماً قاعدہ ہے کہ اپنی فیس کا معیار بلند رکھتے ہیں ایک سو بیس روپیہ مانگیں گے تو کوڑی کم نہ کریں گے۔ یہ اور بات ہے کہ پیشگی صرف بیس لے کر کام شروع کر دیا۔ اور اس دوران میں اتفاقیہ اگر موکل کا کام بن گیا تو وہ تو ہوا رفوچکر اور وکیل صاحب کے رجسٹر مقدمات کے "بقایا" کے خانہ میں سو روپے لکھے کے لکھے رہ گئے موکل آج آتا ہے نہ کل۔ روپے آج آتے ہیں نہ کل۔ وکیل بیچارہ حسرت سے ان بڑی بڑی رقموں کے خوبصورت صفروں کو دیکھتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ مگر وکیل کی بیوی کیا کرتی ہے؟!

(۱)

اجی وکیل صاحب!۔۔۔۔ اجی مرزا صاحب"۔۔۔ خانم نے طنزیہ پکار کر مجھ سے کہا "اجی وکیل صاحب!"

میں نے جواب میں مڑ کر دیکھا "اوہو!" میں نے دل میں کہا نہ معلوم انہوں نے سمجھا کیا ہے مجھے۔ آج یہ پھر رجسٹر والا قصہ لیکر بیٹھینگی ۔۔۔۔ مگر آج ۔۔۔"

خانم نے رجسٹر کے ورق کو روشنی کی طرف کر کے مجھ سے بغیر نظر ملائے کہا "یہ مہینہ کیسے پورا ہوگا؟"

"روزے رکھے جائیں گے" میں نے بھی بے توجہی سے پلنگ کا تکیہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"جی!" خانم نے سخت طنز سے اپنے چہرے کو غصہ سے بگاڑنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "جی روزے رکھ لیئے جائیں گے فاقہ کرنا منظور ہے۔ بھوکوں مرنیکی تمنا ہے۔ مگر بقایا وصول نہیں کیجائیگی ۔۔۔۔ کہو وہ کیوں؟ ۔۔۔ محض اس لئے کہ میں کہتی رہتی ہوں ۔۔۔ کہو میرا کیا ہے۔ کوئی میں اپنے گھر تو بھیج نہیں دیتی ہوں۔ دقت اب اسی کی ہورہی کہ گو دگو دکے اور لڑ لڑ کے بقایا وصول کراتی رہوں"

میں نے کچھ جواب تو دیا نہیں مگر ہاں دل میں کہا ۔۔۔ یہ بدصورت شوہروں کی خوبصورت بیویاں! اللہ ان سے سب کو اور خصوصاً نئے وکیلوں کو امان میں رکھے۔

"ارے!" خانم نے ایک دم سے رجسٹر کا ایک ورق لوٹ کر گویا حواس باختہ ہو کر کہا "ارے! یہ ۔۔۔۔ یہ کیا؟ ۔۔۔"

میں پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔ رجسٹر میرے سامنے زور سے رکھا گیا جس کو اصطلاحاً سر پر دے مارنا کہا جا سکتا ہے۔ میں نے رجسٹر کی طرف دیکھا اور پھر خانم کی طرف۔ ایک سو روپیہ کی بالکل ہی

ناقابل وصول رقم تھی۔ اور اس خوبصورت رقم کو میں ناقابل وصول لکھکر کاٹ بھی چکا تھا۔ اس رقم کو کس حسرت سے خانم نے دیکھکر مجھ سے پوچھا ہے :۔

"یہی بقایا کی وصولی ہو رہی ہے ؟ "

میں نے دل میں سوچا کہ ایک شوہر کی شان میں بیوی کا یہ رویہ نہ صرف قابل اعتراض بلکہ شاید ناقابل معافی ہے۔ بیوی کی یہ بدتمیزی ہے ایک کماؤ شوہر کی اس میں توہین مضمر ہے۔ میری شان کے خلاف ہے اور یہ "پوائنٹ آف آنر" ہے اور اس بات پر تو شاید لڑنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ سوچکر میں نے بھی ذرا دل میں ٹھان کر کہا :۔

" تو اس سے کیا مطلب ہے آپ کا ؟ " (غصہ آ رہا تھا)

خانم نے کہا مطلب میرا یہ ہے کہ یہی وصولی کے طریقے ہیں؟ کہ لیکر بیٹھ گئے قلم۔ اور کاٹ دیں بڑی بڑی رقمیں اور لکھ دیا سُرخ روشنائی سے کہ رقم ناقابل وصول ہے "

" پھر کیا مطلب " میں نے اس مکھی کو دیکھکر کہا جو خانم کی پلکوں سے فٹ بال کھیلنے کی مشق بہم پہنچا رہی تھی۔

خانم نے مکھی پر حملہ کرتے ہوئے کہا " مط.... لب، میرا یہ ہے کہ یا تو یہ رقمیں وصول کیجئے اور یا پھر ڈالیئے اس وکالت کو چولھے میں اور چل کے کیجئے نوکری۔ بلا سے دس پانچ جو قسمت کے ہوں گے وہ بندھے کے بندھے مہینہ پر تو آ جایا کریں گے ... میں باز آئی ایسی وکالت سے۔ بقایا دنیا میں سنا ہے مگر ایسا کہیں سننے میں نہیں آیا جیسا ہمارے یہاں کہ سینکڑوں روپے ناقابل وصول! ..... تو میرا کہنا یہ ہے کہ اسے وصول کیجئے مہربانی کر کے ورنہ.... "

" ورنہ ..... ! ؟ " میں نے چونک کر کہا "

" ورنہ یہ کہ نوکری کرو " خانم نے کہا۔

اب میں نے دل میں کہا کہ نہیں سے لڑنا شروع کروں یا کچھ آگے بڑھکر ؟ ذرا معاملہ تیزی پر آ جائے جب ٹھیک رہے گا۔ چنانچہ یہ طے کر کے میں نے کہا :۔

" تمہاری عقل کہاں گئی ہے ؟ ..... یہ تم کو کیا ہو گیا ہے.... آخر کیسے وصول کروں ؟ نہیں دیتے کمبخت۔ کیا سر اپنا دے ماروں؟

" پھر جب یہ معاملہ ہے تو میں پوچھتی ہوں کہ یہ سینکڑوں کی رقم بقایا رکھی کیوں گئی تھی۔ کیا اسی دن کے لئے کہ جب وصولی کا وقت آئے گا تو ناقابل وصول قرار دیدی جائے گی ؟ اور اس طرح بیدردی سے کاٹ کر پھینک دی جائے گی ؟ "

اب ذرا جناب اس جہالت کو دیکھئے۔ نئے وکیلوں اور پرانے اور کامیاب وکیلوں میں اگر فرق ہے تو یہی کہ پرانے اور کامیاب وکیل سو مانگتے ہیں اور وہیں کے وہیں رکھا لیتے ہیں اور نئے یا تھرڈ کلاس وکیل سو مانگتے ہیں اور دینے والا اگر بیس بھی دیدیتا ہے تو روپیہ لیکر کام شروع کر دیتے ہیں۔ کام ہوتا رہتا ہے اور روپیہ بھی تھوڑا بہت وصول ہوتا رہتا ہے۔ مگر کہیں مقدمہ قبل تمام وصولی کے ختم ہو گیا تو بقایا ہضم! ہار گیا تو کس منہ سے مانگا جائے اور جیت گیا تو خدا کے فضل سے موکل ملے گا ہی نہیں۔ اور ملیگا تو چھاتی ٹھونک ٹھونک کر کہے گا " وکیل صاحب آپ کا روپیہ ؟ ... آپکا روپیہ؟ ابھی میں ذمہ دار ... کوڑی کوڑی لیجئے گا ... سب " مگر روپیہ آج آتا ہے نہ کل۔ کبھی چھینے جھپٹے ہتھے چڑھ گیا۔ یا اس نے پچھلا بقایا صاف کر کے کوئی نیا مقدمہ سپرد کر دیا تو اس سے بھی زائد بقایا ڈالدیا۔ چنانچہ خانم کے اس سوال پر میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ وہ اس وقت لڑنے پر آمادہ ہے۔ اس لئے میں نے جلکر کہا :۔

" جو مقدمے آتے ہیں وہ کوئی چھپ کر تو آتے نہیں۔ تم خود دیکھتی سنتی ہو کہ بغیر بقایا کے معاملہ ہی نہیں جمتا اور پھر مجھ سے لڑنا چاہتی ہو "

" خیر " خانم نے کہا " جو آپ چاہیں کہ سب کی سب بقایا کی رقم کاٹ کر پھینک دیں تو یہ تو میں حشر تک نہیں ہونے دونگی ... "

یہ کہکر اٹھی اور قلم لیکر رجسٹر میں درستی کرنا شروع کی۔ ناقابل وصول رقم کو پھر دوبارہ قابل وصول کے خانہ میں ڈال دیا۔ میرا جو ریمارک تھا اسے کاٹ دیا۔ میری طرف کامیابی سے خانم نے دیکھکر کہا " جو ہوا سو ہوا۔ اب آئندہ اگر کوئی مقدمہ ایسا لیا گیا کہ بقایا کا جھگڑا ہو تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔ خواہ کوڑی نہ آئے مجھے منظور۔ مگر ایک کوڑی بقایا نہیں چھوڑی جائے گی ..... صاف صاف کہدیا جائے گا کہ یا تو سب کے سب دام ابھی دو۔ ورنہ بھیا جاؤ اور تم دوسرا وکیل کر لو "

اس لکچر کے بعد جب مجھ سے خانم نے کہا کہ میں یہ عہد کروں تو

مجھ سے سچ مچ کی لڑائی سی ہوگئی ۔ میں نے اچھی طرح سمجھایا کہ اگر یہ عہد کر لوں گا تو کوئی مقدمہ نہ آئے گا ۔ میں بھلا کیسے عہد کر لوں مگر وہاں تو تریا ہٹ تھی ۔ کیسی کیسی میری جان جلی ہے ۔ بحث اور حجت نے طول یہاں تک کھینچا کہ لیکی وہ تو ہولڈال کی طرف !

ارے ! میں نے دل میں کہا کہیں یہ سچ مچ چل نہ دے ۔ میں فوراً نرم پڑگیا اور ” وسنو تو “ یہ کہکر میں نے روکا ۔ اور پھر نشیب و فراز سمجھائے مگر توبہ کیجئے ۔ اب لڑنے کا تو خیال دل سے نکال ہی چکا تھا لہٰذا تنگ آکر میں نے آخر کو عہد کر ہی لیا ۔ اور پختہ وعدہ کرلیا کہ کوئی مقدمہ اب نہ لونگا تاوقتیکہ پوری کی پوری فیس پیشگی نہ وصول کرلوں ۔ مجھ سے کہا گیا کہ قسم کھاؤں ۔ بڑی موٹی قسم تجویز کی مگر آخر کو خود خانم کے سر عزیز کی قسم کھانا پڑی

اس جھگڑے کو ختم کرکے میں نے کہا کہ اب مجھے تم سو رہنے دو ۔ رات بھر کا جاگا اور تھکا ہارا ہوں ۔ کوئی بھی آئے مگر مجھے نہ جگانا چاہے لاٹ صاحب کیوں نہ آجائیں ۔ یہ کہکر میں پلنگ پر دراز ہوگیا مکھیوں نے ناک کو فٹ بال فیلڈ بنانا چاہا تو مجبوراً چادر اوڑھ لی ۔

میں اپنے خیالات میں غرق ہی تھا کہ خانم نے کہا ” کیا سو رہے ہو؟ “

” اور نہیں کیا دوڑ رہے ہیں ؟ “ میں نے جھلا کر کہا ۔

” توبہ “ خانم نے کہا ” میں نے پوچھا اور جو کوئی مقدمہ والا آیا تو؟ “

” تو اب سونے بھی دوگی “ زور سے میں نے کہا ۔ اس طرح کہ خانم بڑبڑاتی چلی گئی ۔

بات دراصل یہ تھی کہ میں جانتا ہی تھا کہ اگر کوئی چڑیا آگئی تو خانم ہے نہ آخر وکیل کی بیوی ۔ یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ٹھیرا کہ بہلا پھسلا کر چھت پر بھیج دیا کہ ابھی وکیل صاحب آتے ہیں اور یہ کہکر نیچے سے زنجیر ڈالدی ۔ مبادا کہ کسی دوسرے وکیل کا نام اس کو یاد آجائے اور چلتا بنے ۔ جملہ معترضہ تو ہے مگر اس سلسلہ میں ایک اور حضرت جو کسی اور کام سے ملنے آئے تھے محض اسی شبہ میں بند ہوگئے کہ ہو نہو ان کا کوئی مقدمہ ہے اور اس وقت تک نہ کھولے گئے جب تک کہ میں نہ آگیا ۔ یہ لغو کارروائی میرے یہاں دراصل خانم کی جدت سے اور میری اپنی چشم پوشی سے اب بھی ہوتی ہے ۔ قصہ مختصر یہ کہ مجھے اطمینان تھا کہ اگر کوئی مقدمہ والا آیا تو وہ کہیں جا نہیں سکتا ۔

---

(۲)

میں چادر اوڑھے بجائے سونے کے اب غور کر رہا تھا کہ ایک تو ویسے ہی کونسے مقدمے آتے ہیں جو اب اس عہد کے بعد آئیں گے ۔ اس معاملہ کو سوچکر تمام بڑے بڑے بقایا داروں کی خیالی شکلیں سامنے آئیں ۔ واللہ کیا ستم ہے ۔ اگر آپ واقعی رجسٹر مقدمات دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو کہ کس طرح پبلک نے ہم معصوموں اور غریبوں کا جگر چھلنی کر رکھا ہے ۔ ہمارا حق المحنت ، ہماری گاڑھی کمائی کا کمایا ہوا اور حلال کیا ہوا پیسہ کس بیدردی سے اچھے اچھے لوگ مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور کوئی ہم سے کہے کہ ہمارے ساتھ ایسا ہوا ہے ہم فوراً مشورہ دیتے ہیں ۔ کہ دعوےٰ کر دو ۔ مگر خود غصہ کو پی جاتے ہیں ۔ غم کھاتے ہیں تکلیفیں جھیلتے ہیں مگر اف نہیں کرتے ۔ ہماری کیسی گاڑھی اور کیسی محنت کی کمائی کا پیسہ کس طرح اور کس طریقہ سے اور کن وجوہ سے اور کیسے کیسے لوگ اور کس طرح بیوجہ مار لیتے ہیں ! یہ سب کچھ دیکھئے ۔ سنئے اور انصاف کیجئے ۔

میں نے کچھ سوتے کچھ جاگتے میں آواز سنی ” اجیم بگس جی “ ۔

اگر میں اپنے وطن سے بھاگ جانا چاہتا ہوں تو صرف اسی بدعت پر ۔ ایڈیٹروں کا تو مرزا صاحب مرزا صاحب لکھتے لکھتے نب ٹوٹا جاتا ہے ۔ اور یہاں مجھے یہ نام دیا گیا ہے ۔ پھر گستاخی ملاحظہ ہو کہ اس پتہ سے خط لیکر ڈاکیہ بھی ایک روز چلا آیا ۔ ” اجی ہم اجیم بگس جی ہیں ؟ “ بگڑ کر میں نے ڈاکیہ سے کہا کہ ” تم یہ خط لائے کیسے ؟ گویا تم بھی کہہ رہے ہو کہ میں ” اجیم بگس “ ہوں ۔ اسی طرح اور لوگوں کے ناموں کی مٹی پلید ہوتی ہے ۔ مثلاً ” رس گلا “ آپ اندازہ لگائیے کہ یہ کیا نام ہوگا دراصل لفظ ” رزق اللہ “ کا شاعری اصول کے ماتحت شاید رس نکالنے کی کوشش کی ہے ۔ قصہ مختصر میں نے برابر والے کمرے سے خانم اور کسی اور کی گفتگو سنی ۔ اُکھڑی اُکھڑی :-

” اجیم بگس جی ۔ ۔ ۔ ۔ وکیل ۔ ۔ ۔ بگس ۔ ۔ ۔ ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ بیٹھئے ۔ ۔ مقدمہ ۔ ۔ ۔ وکیل ۔ ۔ ۔ ۔ مگد ما ۔ ۔ ۔ اوپر ۔ ۔ ۔ ابھی ۔ ۔ ۔ ۔ “

اس اُکھڑی اُکھڑی بات چیت کے ساتھ یا بعد ہی خانم کا منشا

جلد آپ اوپر چلکر بیٹھیئے۔ وکیل صاحب آتے ہیں " سنا اب بالکل قریب ہی سے آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ آنے والے حضرت اوپر نہیں گئے بلکہ کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے پوچھا خانم سے:۔

" آپ ..... آپ ..... "

خانم نے پکار کر ملازم لڑکے کو آواز دی ..." سگ!... بڑے لالہ"

لڑکے نے کہا بہت اچھا۔ اور خانم نے کہا " اچھا آپ یہیں بیٹھیئے۔ یہ کہکر وہ چلی گئی۔ شاید یہ سوچکر کہ جب یہ حضرت بھاگنے لگیں گے تو مجھے جگا دے گی۔ میں واقعی رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ لہذا پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ابھی اٹھنا پڑے گا۔ ملازم نے لاکر بیڑیاں دیں اور سیٹھ جی نے (یہ سیٹھ صاحب تھے) سوالات کئے۔ ملازم بیوقوف نے بتا دیا کہ میں سو رہا ہوں۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ خانم کون ہے۔ میرے جاگنے کے بارہ میں کوئی قابل اطمینان جواب نہ دیا تو لالہ جی نے خانم کو پھر طلب کیا اب میں سوچ رہا تھا کہ جب معلوم کر لونگا کہ کیا معاملہ ہے تب اٹھونگا خانم آئی تو لالہ جی نے کہا:۔

" ہمارا بڑا ضروری مقدمہ ہے "

" کیا بات ہے؟ " خانم نے کہا۔

" بات یہ ہے کہ ہم اپنی لڑکی کا "چھڑایا" چاہتے ہیں (یعنی خلع یا طلاق) میں نہیں کہہ سکتا کہ میں خلع کا زیادہ حامی ہوں یا خود خانم۔ دونوں ٹھیرے ایک قسم کے سوشل ریفارمر۔ خانم نے جلدی سے پوچھا:۔

" کیوں؟ کیا ہوا؟ .... کیا جنوائی بُرا ہے... کیا... "

بات کاٹ کر سیٹھ صاحب نے کہا " لڑکا تو بُرا " چوکھا " ہے مگر ہمارا اسکا (سمدھی) مونچھیں اینٹھتا ہے "

" لڑکی اور لڑکے میں تو لڑائی نہیں ہے؟ " خانم نے کہا۔

" کچھ نہیں لڑکی لڑکے میں کچھ بھی لڑائی نہیں "

" تو پھر آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے "

بس خانم کا یہ کہنا تھا کہ تڑپ کر میں دلائی پھینک بھاگ گئے یا پھاند پڑا۔ ذرا غور تو فرمائیے کہ اس سے زیادہ کیا نالائقی ہو سکتی ہے ایک وکیل کی بیوی کی کہ خواہ مخواہ مقدمہ خراب (جی ہاں خراب) کر دے۔ پہنچا میں آنکھیں ملتا ہوا۔

" جے رام جی ری " میں نے سیٹھ صاحب سے کہا یعنے سلام علیکم۔

" جے رام جی ری " لالہ صاحب نے جواب دیا۔

خانم کو تو میں نے چلتا کیا۔ کہ کہیں معاملہ نہ خراب کر دے اور پھر ادھر دنیا بھر کی باتیں شروع کیں۔ معلوم ہوا کہ سیٹھ جی کا سمدھی پرلے درجہ کا دغاباز، بدمعاش اور مغرور ہے۔ کیوں؟ اجی حضرت ہمارے سیٹھ صاحب سے اکڑتا ہے! غضب ہے خدا کا کہتا ہے کہ اب لڑکی تمہاری نہیں ہماری ہو گئی۔ زبردستی بدا (وداع) کرا لیجاؤں گا۔ چنانچہ اس مغرور نے مقدمہ بازی کی ٹھیرائی ہے۔ لڑکے کی طرف سے ایک دعوے کر دیا ہے " واسطے دلا پانے حق زوجیت " مطلب یہ کہ داماد نے دعوے اس بات کا کیا ہے کہ میری بیوی مجھے ملنا چاہیئے۔

میں نے سیٹھ جی سے کہا کہ ایسے ضدی اور مغرور شخص کو ضرور بالضرور کچھ کرکے دکھانا چاہیئے۔ پھر میں نے اچھی طرح ان کو سمجھایا کہ چونکہ شادی مکمل ہو چکی ہے اور ہندوؤں میں " چھڑایا " ہوتا نہیں۔ لہذا چھڑایا تو مشکل ہے ——— اس کے جواب میں سیٹھ صاحب نے کہا " مگر ہم تو اپنی چھوری (لڑکی) بدا نہیں کرنا چاہتے کوئی قانونی پینچ نکالو "

میں سوچنے لگا تو سیٹھ جی بولے کہ " وکیل صاحب! جو اگر تم چھڑایا کرا دو ہماری لڑکی کا تو ہم آپ کو خوش کر دیں " جب ہم نے کہا " یعنے؟ " تو انہوں نے اپنی ہتھیلی پر ایک کا ہندسہ بنا کر دو صفر لگا دیئے یعنے ۱۰۰ روپیہ۔

پھر سیٹھ جی نے پوچھا " چھڑایا کرا دوگے؟ "

حالانکہ یہ ناممکن ہے۔ لیکن ایسے موقعوں پر میں اپنے ضمیر کو سمجھانے کے لئے سوچتا ہوں کہ میں نپولین کا پیرو ہوں یعنے لفظ ناممکن کو لغت کی کتابوں میں سے کاٹ کر پھینک دو۔ چنانچہ ایک سمجھدار وکیل کی طرح میں نے کہا:۔

" ممکن تو خیر یہ بھی ہے مگر اس میں خرچ کچھ زیادہ ہے اور کامیابی کی امید بھی ذرا کم ہے "

سیٹھ صاحب بولے " چھڑایا نہیں ہو سکتا تو دعویٰ تو خارج ہونا چاہیئے "

میں نے " نہ " تو حامی بھری (کیونکہ آپ خود خیال فرمائیں کہ دعوے

کس قدر حق بجانب تھا، اور نہ انکار کیا۔ بلکہ یہ کہا کہ "سیٹھ صاحب سب کچھ ہو جائے گا مگر روپیہ سو سے کام نہیں چلے گا۔ روپے لگینگے آپ کے دو سو۔"

"اس سے کم نہیں؟"

"کوڑی کم نہیں" میں نے یہ سوچتے ہوئے جواب دیا کہ دیکھوں کہاں ٹھیکتے ہیں سیٹھ جی۔

"تو پھر دعویٰ تو خارج ہو جائے گا؟" سیٹھ صاحب نے کہا۔

"کیوں نہیں ہو جائیگا، ہو تو جانا چاہئے"، میں نے مکاری سے کہا "اور پھر نہ ہو تب ہم دوسری ترکیب بتا دیں گے"

سیٹھ جی بولے "آپ دعوے خارج کرا دیجئے ہم دو سو روپے دینگے بلکہ سو روپیہ اور دینگے۔ مگر بات یہ ہے کہ سو اب دیں گے دو سو جیتنے کے بعد دینگے"

میں نے سیٹھ کو غور سے دیکھا اور دل میں کہا "او موذی کیا تو کسی سے سازش کر کے آرہا ہے۔ کیا تو پھر میاں بیوی میں چپقلش کرائے گا۔ میں عہد کر چکا ہوں کہ ہرگز ہرگز بقایا نہ رکھونگا چنانچہ میں نے سیٹھ صاحب سے کہا "سیٹھ جی! ہمارے یہاں بقائے والا معاملہ بالکل نہیں ہے۔ ہمارے یہاں تو نقد کام ہوتا ہے اور بہترین ہوتا ہے۔ ہم اپنی فیس کا بقایا رکھتے ہی نہیں۔ ہمارے ہاں قاعدہ ہی نہیں ہے"

سیٹھ جی نے میرے اصول کی تعریف کی۔ اپنے اصول پر جمے رہنے کی تاکید کی۔ لیکن بعد میں یہ کہا کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ سو روپے نقد دیئے جائیں اور سو روپے دو تین پیشیوں کے بعد دیدیئے جائیں۔ اور مقدمہ کامیاب ہونے کی صورت میں سو روپیہ بطور انعام یا تحفہ یا نذرانہ رہے۔

اب آپ ملاحظہ فرمائیے کہ میں بھلا کیسے راضی ہوتا۔ اپنی رفیقہ کے سر عزیز کی قسم! کون سر؟ وہ جو مجھکو اپنی جان سے زیادہ عزیز اور پیارا ہے۔ وہ سر جس کی خوشبو روح میں تیرتی چلی جاتی ہے۔ وہ سر جو سینہ سے لگ کر مردہ قالب میں ایک طوفان خیز جان ڈالتا ہے۔ "ارے ازلی لالہ... یعنے سیٹھ۔ تیری یہ مجال ہے کہ میری فیس میں سے کچھ بھی بقایا رکھ سکے" میں نے دل میں کہا "کیا تو نے ٹھیکہ لیا ہے کہ اپنی لڑکی کی طرح وکیل اور مجسٹریٹ کے یہاں بھی "چھڑا پے" کے بیج بوتا جائے گا!" چنانچہ میں نے پھر لالہ صاحب سے کہا "ہمارے ہاں بقایا کا حساب کتاب نہیں ہے" یہ کہتا ہوا میں اٹھکر خانم کے پاس آیا۔ کیفیت سنائی۔ سو روپیہ ابھی دیتا ہے بقایا پھر دے گا۔ خانم کی عقلمندی دیکھئے کہتی ہیں "تو پہی لے لو"

"تو کیا پھر بقیہ کا تقاضا نہ کروں؟" میں نے پوچھا

"کرنا کیوں نہیں؟ مل جائے تو مل جائے نہ ملے نہ سہی۔ تم لیلو سو روپیہ پر۔ ابھی" خانم نے کہا۔

میں آیا سیٹھ صاحب کے پاس۔ اظہار خصوصیت کے سلسلہ میں ان کی استدعا منظور کی۔ سیٹھ صاحب نے دس دس کے چھ نوٹ دیئے اور کہا:-

"یہ پچاس تو آپ کی فیس کی طرف آئے۔ پانچ نوٹ اور یہ دس روپے کا ایک نوٹ۔ آپ کا کرایہ بھاڑا وغیرہ۔ باقی رہے پچاس تو وہ شام کو میں دے جاؤنگا"

میں روپے چپ چاپ لیکر خانم کے پاس پہنچا اور روپیہ دیکر کہا کہ بولو کیا کہتی ہو؟ یہ بقایا کے اندر بقایا منظور ہو تو روپے رکھو ورنہ ابھی کچھ نہیں گیا ہے۔ آپ خود غور فرمائیے کہ بھولا بھٹکا کبھی کوئی آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا آنکلا تو اس کو بھلا کون ٹھکراتا ہے اور پھر خانم! اجی توبہ کیجئے! رقم آئی چھوڑ دے! ناممکن ہے چنانچہ دیوار کی طرف منہ کر کے جا ہی لیتے میں روپیہ مٹھی میں دابا۔ میں نے دوبارہ تقاضا کیا تو کہا "ہوں" میں نے ذرا اور کسا تو کہا "کہدو اس سے کہ شام تک روپیہ ضرور پہنچ جائے ورنہ....؟

"ورنہ مقدمہ نہ لیں گے اور روپیہ واپس کر دینگے" میں نے کہا۔ "یہی کہدوں نہ؟"

"واپس کیوں کر دیں گے؟" خانم نے کہا "بس یہ کہدو کہ اگر روپیہ تم نے نہ بھیجا تو بس تم جانو گے"

چنانچہ میں نے لالہ صاحب سے جا کر کہدیا کہ بقیہ روپیہ شام تک ضرور بالضرور بھیجدیجئےگا ورنہ میں نہیں جانتا پھر تو یعنے تم جانو گے"

سیٹھ جی نے مجھے اطمینان دلایا اور کہا بھلا کوئی بات بھی ہو شام تک روپیہ پہنچ جائے گا۔

میں نے کہا پہنچ جائے نہیں بلکہ آجائے "

"میں خود دے جاؤنگا" یہ کہکر سیٹھ جی نے مزید اطمینان دلایا اور "جے شری ماتا جی ری" یعنی گڈ بائی کرکے چلتے بنے۔

ادھر سیٹھ صاحب گئے اور ادھر میں نے خانم سے کہا لانا تو رجسٹر! رجسٹر لیکر میں نے پچاس نقد لکھنا چاہے اور ڈیڑھ سو بقایا۔ خانم نے لکھوائے کہ سو نقد وصول لکھو اور بقایا کچھ نہیں۔ میں نے کہا یہ کیسے تو اس نے کہا "کچھ قسم کا بھی پاس ہے" اوہو! میں نے کہا غلطی ہوئی۔ چنانچہ میں نے ارشاد کی تعمیل کی۔ بقایا کی تو قسم کھا چکا تھا۔ اب یہاں یہ لکھنا کہ شام تک وہ بقیہ پچاس نہیں آئے تحصیل حاصل ہے۔

میں نے جو خانم سے دوسرے روز صبح کہا کہ اب تو خود تم نے میری قسم گڑبڑ کروادی۔ اب کہو تو وہ پچاس بقایا لکھدوں؟ تو اس نے جلکر کہا کہ "کل لکھدو بقایا"۔ مجبوراً پہلی مرتبہ میں نے اپنا رجسٹر غلط چھوڑا۔ سیٹھ جی بالکل غائب ہوگئے۔ چھ سات روز بعد ان کا خط آیا۔ جس میں سخت معذوری کا اظہار کیا تھا اور مجھے یقین دلایا تھا کہ پیشی کے روز سب رقم دیدونگا۔

تاریخ مقررہ سے ایک دن پہلے میں پہنچا۔ سیٹھ جی اسٹیشن پر استقبال کے لئے موجود تھے۔ قلی کے بجائے اسباب میرا خود اٹھایا حالانکہ مالی معاملات میں مجھے قلی بنا سکتے تھے۔ باہر آیا تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی ادائی کا سوال درپیش۔ یعنی اونٹ پر چڑھو۔ میں نے یہ سوچکر کہ اپنی ہڈی پسلی توڑنے سے بہتر ہے (ایک مرتبہ گر چکا ہوں اونٹ سے) کہ اپنا جوتا توڑوں۔ میں پھر کا معاملہ اور شام کا وقت تھا پیدل ہی آگیا سیٹھ جی نے مجھے قاعدہ سے لیجا کر اپنے گھر میں ٹھیرایا۔ یہ کوئی یوپی تو ہے نہیں کہ سب مسلمان بھنگی ہوگئے۔ مہمان خانہ اور زنان خانہ کا صحن ایک ہی ہوتا ہے۔ کھانا ایک ہی برتنوں میں کھایا جاتا ہے۔ تھالی گھر والیاں ہی پروستی ہیں اور بعد کھانے کے یہی خوفناک جھوٹی تھالی اٹھا بھی لیتی ہیں اور سامنے میدان کی ریت پر برتن لیجا کر "سکہ منجن" کرتی یعنی سوکھی ریت سے مانجھتی بھی خود ہی ہیں۔

گھر پہنچکر میں اطمینان سے بیٹھا۔ سیٹھ جی نے اب میرا گھر والوں سے تعارف کرایا۔ یا یوں کہئے کہ کچھ میں نے خود ہی اندازہ کرلیا اور کچھ انہوں نے کرادیا۔

سیٹھانی جی تو زبردست گھونگٹ میں روپوش تھیں۔ عزیزم "چھوری" یعنی فساد کی جڑ سے میرا تعارف اس طرح کرایا کہ "وہ چھوری یہ ہے"

میں نے چھوری کو دیکھا۔ کوئی پندرہ برس کی عمر تھی۔ ماتھے پر بالوں میں بور[1] پہنے۔ سونے میں لدی ہوئی۔ اچھی خاصی صورت شکل کی بھولی سی لڑکی تھی۔ بڑے تمیز سے ایک لوٹے میں چائے اور تھالی لیکر پہنچی۔ لوٹا تو چائدانی خیر تھا ہی۔ تھالی بجائے چائے کی پیالی کے رہی۔ میں نے چائے پی۔ چائے پیتا جاتا تھا اور مکان کے در و دیوار کی رنگین گلکاری اور نقش و نگار دیکھتا جاتا تھا کہ کس طرح بیدردی سے یہ لوگ اوندھی سیدھی آرائش پر روپیہ خرچ کرتے ہیں۔

دوسرے روز مقدمہ کی پیشی تھی۔ بھلا آپ ہی بتائیے کہ میں کیا عذر کروں۔ جوان اور بیاہتا لڑکی۔ پھر آخر کونسا عذر ہے جو پیش کیا جاسکے۔ لہذا میں نے سوچ سمجھکر سیٹھ جی کو مشورہ دیا۔ کہ "نٹ جاؤ" یعنی شادی ہی سے منکر ہوجانا بہتر ہے۔ تاکہ بار ثبوت مدعی پر رہ جائے۔ میں نے دل میں سوچا کہ جب تک یہ بات ثابت ہوگی کہ شادی ہوئی تھی۔ اس وقت تک کافی عرصہ لگ جائے گا۔ گواہ آئیں گے۔ ان پر اوندھی سیدھی جرح ہوگی۔ بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مقدمہ ملتوی کرایا جائے گا۔ عذرداریاں بیچ میں اٹھادیں گے۔ درمیانی اپیلیں لیں گے۔ قدم قدم پر

---

[1] "بور" بیر کی شکل کا ایک زیور ہوتا ہے۔

احکام کی نگرانیاں کریں گے۔ اس میں اگر ہار گئے تو دوسرا جھگڑا پیش کر دیں گے کہ لڑکی نابالغ اور ضرورت سے زیادہ چھوٹی ہے یا مہر کچھ اور کریں گے۔ اور جو ابدعوے بار بار ترمیم کریں گے۔ اور اس وقت تک تو بقایا فیس بھی وصول ہو جائے گی۔ اور پھر اگر کوئی دوسری عیاری اس دوران میں چل گئی تو کسی قانونی پوائنٹ پر عجب نہیں کہ مقدمہ ہی جیت جائیں۔ یہ سب باتیں سوچ کر ہم جوابدعوے میں صفا "نٹ گئے"۔ یعنے لکھدیا دعوے کے جواب میں کہ مدعی جھوٹا ہے اور کوئی شادی وادی نہیں ہوئی لہٰذا دعوئے مدعی معہ خرچہ خارج فرمایا جاوے۔

اب اس پہلی پیشی پر ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ کچہری پہنچا تو ایک اور سیٹھ صاحب نے صدر کے ایک وکیل کی غیر مانوس شکل دیکھکر فوراً پہچان لیا۔ میرے قریب آ کر اور کچھ مشکوک نظروں سے دیکھکر کہا "مجروشا" (یعنے صاحب مجرا عرض ہے) میں بھی جواب میں آداب بجا لایا۔ وہ بولے "آپ کون .... وکیل ہو"؟ جب میں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا تو فوراً انہوں نے مجھ سے کہا کہ ایک مقدمہ میں مجھے وکیل کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا "چشم ما روشن ......" اور بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو غنیم ہے۔ میں نے ان سے معافی چاہی اور کہا کہ سیٹھ جی ہم تو تمہارے خلاف ہیں۔

میرے موکل صاحب میرے لئے پان لینے گئے تھے۔ اس دوران میں ان سیٹھ جی نے جو یہ سنا تو بجائے مجھ سے علیحدہ ہو جانے کے نیا دھندا چھیڑ دیا۔ اپنے ہونہار صاحبزادے کو بلا کر مجھے دکھایا۔ دو چار باتیں کرنے کے بعد بولے کہ ہمارا "راجی یا"، یعنے راضی نامہ کرادو پھر اس کے بعد بنائے مخاصمت بتائی۔ مجھے معلوم ہوا کہ سراسر خطا میرے موکل کی ہے۔ وہ محض اپنی ضد اور خودسری کی وجہ سے چھ برس ہونے آئے لڑکی کو رخصت نہیں کرتے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ لڑکی اور لڑکے میں نہ تو منافرت ہے نہ لڑائی بلکہ ایک دوسرے سے ضرورت سے زیادہ رضامند ہیں۔

جب میرے موکل صاحب آئے تو میں نے خود انہی کی زبانی انکی (خود کے) موذی پن کی تصدیق کی۔ سراسر انہی کی زیادتی تھی اور شرارت اور مقدمہ بازی پر تلے ہوئے تھے۔ صرف دو ایک مرتبہ لڑکی کو دو چار روز کے لئے بھیجا تھا اور اب کسی طرح رخصت نہ کرتے تھے سمدھی نے جو زیور وغیرہ چڑھاوے میں دیا تھا وہ ہضم تھا۔ اور اب علی الاعلان کہتے تھے کہ ہم لڑکی کی دوسری جگہ شادی کر دیں گے یہ سب کچھ تھا مگر جناب ایک وکیل کو بھلا اس قسم کی باتوں سے کیا تعلق۔ نہ تو وکیل کوئی سوشل ریفارمر ہوتا ہے اور نہ ہمدرد قوم۔ وہ ٹھیرا ایک غریب مزدور۔ لہٰذا مجھے بھلا اس سے کیا بحث کہ حق پر کون ہے اور ناحق کون لڑ رہا ہے۔ یا انصاف ہے کیا بلا۔ مجھے تو اکھاڑ پچھاڑ کر کے عدالت کے سامنے یہ ثابت کرنا تھا کہ شادی ہی ایک سرے سے نہیں ہوئی۔ آپ کو علم نہیں کہ اس قسم کے جھگڑوں کا کیا رنگ ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ جواب میرا بالکل پوچ اور لچر ہے۔ مگر جناب پتہ اس کا آپ کو جب چلے جب آپ سے کوئی وکیل الجھ پڑے۔ اور وہ آپ سے پوچھنے لگے کہ اچھا بتاؤ تو سہی کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے تو تمہاری بیوی کے کان کس کس جگہ چھدے ہیں، چہرے پر کے تل ہیں۔ کس سال، کس مہینہ اور کس دن شادی ہوئی تھی۔ مہر کتنا بندھا تھا۔ اور کتنا موجل تھا، کتنا معجل؟ کس مکان میں شادی ہوئی تھی۔ قاضی جی کی ناک کتنی موٹی تھی۔ گواہوں کی ڈاڑھیوں کا سائز بتاؤ؟؟ وغیرہ وغیرہ۔ غرض مطلب یہ کہ اگر کوئی وکیل آپ نے نہ کیا ہو تو آپ ضرور مقدمہ ہار جائیں اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ نہ معلوم کتنے نکاح اسیطرح ثابت ہونے سے رہ جاتے ہیں۔

میں نے اپنے سیٹھ جی سے جب راضی نامہ کے بارہ میں پتہ چلایا تو معلوم ہو کہ وہ اس کا خیال بھی دل میں لانا گناہ سمجھتے ہیں۔ میں نے بھی کہا شاباش۔ ڈٹے رہو درست اسی طرح۔

اس پیشی پر کوئی خاص کارروائی نہ ہوئی۔ چلتے وقت سیٹھ جی نے آئندہ مرتبہ کا کرایہ بھاڑہ اور بقایا فیس کے ملا کر کل تیس ۳۰ روپے دیئے۔ اور باقی کے بارہ میں بہت سی قسمیں کھائیں۔

میں گھر پہنچا۔ روپے خانم کو دیئے اور اب جا جا کر رجسٹر میں

اندراج کروں۔ مگر خانم نے کہا کہ بقایا لکھنے کی ضرورت نہیں ہے وہ سب دیدے گا۔ ادھر میں نے سیٹھ جی کو ایک خط لکھدیا کہ اگر میرا کل کا کل بقایا نہ پہنچا تو مجبوراً میری گاڑی چھوٹ جائیگی جب کوئی بقایا نہیں ادا کرتا اور باہر کا مقدمہ ہوتا ہے تو وکیل لوگ یہی ترکیب کرتے ہیں کہ عدالت کو تار دیدیتے ہیں کہ ہماری گاڑی چھوٹ گئی۔ یہ اس وجہ سے کہ کہیں ہائیکورٹ میں شکایت نہ ہو جائے۔ کیونکہ بقایا ادا نہ ہونے کی وجہ سے وکیل کام کرنے سے انکاری نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس خط کا یہ اثر ہوا کہ سیٹھ جی کا منی آرڈر آگیا۔ اور انہوں نے پورے سو روپے ادا کر دیئے۔ وہ جو فوراً دینا تھے۔ اب مجھے وہ سو روپے اور وصول کرنا رہ گئے جو انہوں نے کہا تھا کہ وہ ایک پیشی کے بعد دیدوں گا۔

دو ایک پیشیاں ہوئیں۔ اس دوران میں سیٹھ صاحب میری کارگزاریوں سے بیحد خوش تھے۔ میں نے سیٹھ جی کے داماد کے ایک خاص گواہ کا اس طرح فوٹو لیا تھا کہ وہ دونوں ہاتھ جھٹک جھٹک کر ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے گواہ کو وہ تیار رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ بہتر ہے خود تصویریں ہی لی جائیں۔ چنانچہ سیٹھ صاحب سے کہدیا کہ اس مقصد کے لئے درجن بھر پلیٹیں لاؤنگا۔ تصویروں کی جس طرح میں ضرورت ہوگی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کے داموں سے پلیٹیں آئی تھیں لہذا میں نے خود سیٹھ صاحب کی اور ان کے گھر والوں کی سب کی تصویریں لیں۔ خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ تصویر جو سیٹھانی جی نے کھچوائی۔ اس تصویر میں ان کا چہرہ وغیرہ کچھ نہیں آیا۔ کیونکہ بالکل گھونگھٹ ڈھکا ہوا تھا۔ سیٹھ جی نے کہا تھا کہ تصویر میں ان کے منہ کی چنداں ضرورت ہی نہیں ایسے ہی کھینچ لو۔

تیسری پیشی کے بعد ایک اور دلچسپ قصہ پیش آیا۔

ہمارے سیٹھ صاحب کا داماد میرے پاس ملنے آیا۔ ان حضرت نے ایک اور تجویز پیش کی۔ وہ یہ کہ میں ان سے بھی فیس لیکر مقدمہ بگاڑ دوں۔ آپ ان کی عقل کی داد دیجئے۔ میرا مقدمہ از خود اتنا کمزور تھا کہ بگڑنے سے بدتر۔ لیکن میرے لئے گیا، پھر وکیل کے لئے یہ فعل نہ صرف باعث شرم بلکہ وکالت کے لئے بھی سخت مضر ہے میں نے ان جوان عاشق سے کہا کہ سیٹھ جی تم ایسی باتیں مجھ سے مت کرو۔ میں ان معاملات میں بڑا اکھڑ ہوں۔ اور کبھی ٹس سے مس نہ ہونگا جب انہوں نے یہ دیکھا تو مجھے دوسرے طریقہ سے راضی یا قائل کرنا چاہا یعنے معاشرتی منطق سے۔ یہاں میں کچھ قائل سا ہو گیا جب اس نے نفرین آمیز لہجہ میں مجھ سے کہا کہ کس طرح میں اس کی چہیتی بیوی کو اس سے چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں اور کس طرح جھوٹ سچ ملا کر دیدہ دانستہ لڑکی کی زندگی بھی خراب کر رہا ہوں۔

میں نے سب کچھ تسلیم کیا۔ ان مجبور رنجور نوجوان سے ہمدردی کی۔ ان کی حالت زار پر رحم کھایا۔ میرا دل پسیج گیا۔ ہر طرح کی دوسری امداد دینے کا بھی وعدہ کیا۔ مگر یہ بھی آخر میں کہدیا کہ یہ سب کچھ ہے مگر مقدمہ لڑنے میں ہرگز ہرگز کوتاہی نہ کرونگا۔ کسطرح بیچارہ اپنی بیوی کے غم میں مبتلا ٹھنڈی سانسیں بھرتا میرے پاس سے ناکام لوٹا ہے کہ میرا دل دہل گیا۔ اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھکر جو خانم کی طرف دیکھا ہے تو روح کانپ گئی۔ اگر میرے ساتھ یہی گزرے تو؟ خانم نے مجھے متفکر اور کبیدہ سا دیکھکر وجہ پوچھی اور میں نے بتلائی تو اسے بھی بڑا رحم آیا۔ لیکن میں نے جب یہ تجویز کی کہ پیسہ واپس کر کے مقدمہ سے سبکدوش ہو جاؤں تو خانم نے مجھ سے کہا کہ یہ بالکل فضول بات ہے کیونکہ وہ کوئی دوسرا وکیل کرلے گا۔ بات بھی ٹھیک تھی۔ . . . . فاعتبروا . . . . ؟

خیر سے مقدمہ کو کھینچ تان کر میں اب اس نوبت پر لایا کہ احتیاطاً لڑکی کی عمر کا سارٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا جائے۔ کچھ اس قسم کا (اگر ممکن ہو) کہ لڑکی رخصت نہیں ہو سکتی۔ یا عمر کم کرانے کی کوشش کی جائے۔ اس دوران میں سیٹھ صاحب سے دس پانچ دس پانچ کر کر کے کچھ روپے بھی وصول ہو چکے تھے۔ اور ہو رہے تھے۔

اس دوران میں لڑکی کے شوہر نے پھر میرے پاس سفارش بہم پہنچائی۔ جب میں نے انکار کر دیا تو چونکہ آدمی اعتبار کا اور پیشتر سے مجھے جاننے والا تھا۔ اس نے مجھے اشارتاً بتایا کہ ہم لڑکی کو زبردستی اڑا لیجائیں گے۔ بھلا اس سے مجھے کیا غرض جو میں حائل ہوتا

شوق سے لیجائیں ایک اور مقدمہ ہمارے سیٹھ صاحب فوجداری کا بھی کھڑا کر دیں گے اور اسے بھی زوروں کے ساتھ لڑوں گا۔ میرے لئے اس سے بہتر وعدہ ہی کیا ہو سکتا تھا۔ ان کی حماقت تھی جو مجھ سے اس بات کو پوشیدہ رکھتے تھے۔

اس کے بعد پھر مجھ سے خود لڑکا ایک روز ملنے آیا۔ وہ جانتا تھا کہ جس شخص کو اس نے اپنا سفارشی بنا کر میرے پاس بھیجا تھا اس کے اور میرے تعلقات کیا تھے۔ لہذا پہلے تو اس جوان رعنا نے اپنی بیوی کے عشق کی داستان سنائی۔ کس طرح وہ اپنی بیوی کے ہجر میں بے کل ہے۔ کس طرح اسے دنیا اندھیر معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد مسکرا کر صاف صاف مجھ سے کہا کہ میں اپنی بیوی کو زبردستی چھین لیجاؤں گا۔ اور مجھ سے وعدہ چاہا کہ میں اس میں مزاحم نہ ہوں۔

قبل اس کے کہ میں اس کا جواب دیتا میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری تو یہ رائے ہے مگر خود تمہاری بیوی کی کیا رائے ہے؟ اس کا جواب اس غریب نے مجسم بیکلی بن کر اس طرح پہلو بدل کر اور بے تاب ہو کر دیا ہے کہ بیان سے باہر۔ مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ خود میرے پاس آنا چاہتی ہے۔ اور بس نہیں اس کا کہ چلی آئے۔ جب میں نے شبہ کیا تو مجھ سے کہا کہ خود لڑکی سے پوچھ لینا۔ چنانچہ میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ اگر واقعی تمہارا کہنا صحیح ہے تو میں ہرگز نہ تو لڑکی کے باپ سے کہونگا اور نہ خود مزاحم ہونگا۔ یہ بھی سمجھا دیا کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ تمہاری اس کارروائی کے بعد اگر تمہارے خلاف مقدمہ فوجداری چلایا جائے تو میں اس کی پیروی نہ کروں۔ کان کھول کر سن لو کہ تمہارے اوپر مقدمہ چلایا گیا تو تمہیں جیل بھجوانے کی انتہائی کوشش کروں گا۔" اس پر وہ ہنسنے لگا اور کہا کچھ مضائقہ نہیں چنانچہ اسے رخصت کر کے میں نے سوچا کہ اب لڑکی کا عندیہ معلوم کرنا چاہئے

اب وہ موقع آیا کہ لڑکی کے بیانات ہوں۔ چنانچہ میں نے لالہ جی سے کہا کہ تم اپنی لڑکی کو یہ باتیں سکھاؤ پڑھاؤ۔ سیٹھ جی نے انکار کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات میں فریقین کو کچھ ایسی باتیں لازمی طور پر بتانا پڑتی ہیں جن کا ذکر شاید ہسپتال یا عدالت کے کمرہ کے باہر کسی طرح جائز نہیں۔ اس قسم کی باتیں نہ تو ماں باپ لڑکی سے کہکر اپنا اطمینان کر سکتے اور نہ کوئی دوسرا وکیل کا اطمینان کرا سکتا ہے کہ بیان دینے میں کوئی لغزش تو نہ ہوگی۔ لہذا چار و ناچار وکیل ہی اپنے ذمہ یہ خدمت لیتا ہے۔ چنانچہ مجھے لڑکی سے تنہائی میں راز کی باتیں کرنے کا موقع دیا گیا۔ وکیل اور ڈاکٹروں سے بھلا کیا شرم اور پردہ۔ تنہائی میں مجھ سے بات چیت ہوئی۔ میں نے جب اسے سب باتیں سمجھا کر آزمانا چاہا اور کہا "نٹ جائیو"، یعنے شادی سے انکار کر جائیو تو اسے کچھ پورے طور پر آمادہ نہ پایا۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ چپ ہے تو میں نے چپکے چپکے اسے قصہ سنایا کہ تیرا میاں میرے پاس آیا تھا۔ پھر اس کے بعد تمام راز کی باتیں اس سے کہیں اور پوچھیں۔ اس کے پاس ایک جواب خاموشی تھا۔ گو ایک بے زبان لڑکی کی خاموشی سے بھی بہت کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن میں نے اس سے کہا کہ "صاف صاف بتا کہ تو اپنے میاں کے پاس جانا چاہتی ہے یا نہیں؟" زبان سے اس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ حرکات و سکنات سے پہلے بھی جواب دے چکی تھی اور اب بھی دے رہی تھی۔ مگر میں تو صاف جواب چاہتا تھا۔ اس لیئے میں نے سخت رازداری کا وعدہ کیا مگر پھر بھی وہ نہ مانی تو میں نے اس کے باپ سے پکار کر کہہ دیا کہ یہ جواب نہیں دیتی اور کچھ نہیں بتاتی۔

سیٹھ صاحب کی حماقت ملاحظہ ہو۔ وہیں سے پکار اٹھے:-

"کیا پوچھتے ہو؟"

"تمہارا سر پوچھتا ہوں" میں نے کہا "مرد آدمی کوئی قانونی بات پوچھتا ہونگا۔ تمہارا گڑا ہوا مال تو پوچھتا نہیں"

"کیا بات ہے؟" وہیں سے فرما رہے ہیں۔

"تمہارے بتانے کی نہیں ہے" میں نے بگڑ کر کہا۔

سیٹھ جی نے مجبوراً لڑکی کو ڈانٹا کہ بتاتی کیوں نہیں مگر اس نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ "زمیں جنبد نہ جنبد..." پر مضبوطی سے عمل پیرا تھی۔ میں نے تنگ ہو کر کہا کہ تو نہیں بتائیگی تو اگلی ہی پیشی پر تیرا چھٹرا پا ہو جائیگا اور پھر تو عمر بھر میکے ہی میں بیٹھی رہیگی بول جلدی تیرا چھٹرا پا کرا دوں۔

اس کے جواب میں اس نے سیٹھ جی کی طرف دیکھا کہ وہ اس کی

طرف تو نہیں دیکھ رہے۔ پھر سر ہلا کر انکار کیا یعنے نہیں چاہتی کہ طلاق ہو جائے۔

اب میں نے اس سے یہ بھی کہدیا کہ تیرا میاں تجھے زبردستی پکڑ لیجائے گا۔ اور بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔ پھر اس کے میاں کی گواہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے تصویر نکال کر اس کو دکھائی اور عمداً گواہ کی تصویر پر انگلی رکھکر پوچھا کہ یہ ہے تیرے میاں کی تصویر؟ کچھ اس طرح گھبرا کر اس نے انکار کیا اور اپنے شوہر کی تصویر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا کہ اب آگے کسی سوال کی ضرورت ہی نہ رہی۔ میں نے نہ تو لڑکی کو کچھ سمجھایا اور نہ بیانات پختہ کرائے۔ عدالت میں لڑکی سے شادی کا انکار کرانا دراصل خود لڑکی کو قانونی گرفت میں دیدینا تھا۔

اسی پیشی پر میں نے عدالت سے لڑکی کے بیانات اور ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے لئے مہلت مانگی۔

میں سیٹھ جی کو سمجھا ہی چکا تھا کہ لڑکی کو صدر لیکر چلو تو کئی کام کئے جائیں۔ ڈاکٹرنی سے سرٹیفکیٹ لیں۔ حکام بالا اور دربار میں عرضیاں فریاد کی گزاریں۔

شام کو ہم تینوں، یعنے سیٹھ جی، ان کی لڑکی اور میں اسٹیشن پہنچے۔ بہت پیشتر، یعنے کوئی ڈھائی تین گھنٹے پہلے، کیونکہ مجھے ایک اور شخص سے اسٹیشن پر ملنا تھا۔ پھر سیٹھ جی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ گرم پوریاں میرے لئے خاص طور پر اسٹیشن پر تیار کرائی جائیں گی انہی وجوہ سے ہم گاڑی کے وقت سے اتنے پہلے پہنچ گئے تھے۔

اسٹیشن پہنچکر سامنے کے دھرم شالہ کے برآمدہ میں چارپائی پر میں بیٹھ گیا۔ کھمبنہ سے لگ کر لڑکی بیٹھ گئی۔ سیٹھ جی میرے لئے پوریاں تلوانے میں مشغول ہوئے۔ میں جب بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ برآمدہ کے اس سرے پر جو پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دھرمشالہ کے اس طرف لڑکی کا شوہر کھڑا مجھے اشارہ کر رہا ہے۔ میں اس کے پاس گیا تو کیا عرض کروں کس شان سے یہ حضرت کھڑے مسکرا رہے تھے۔ بانکی مہاجنی پگڑی باندھے، اور تلوار کمر میں، اس طرح کہ ہیمو کی روح تڑپتی ہوگی۔ آنکھیں جھکائے مجھ سے کہا "آپ نے ہماری سانڈنی بھی دیکھی؟" میں نے کہا "نہیں" تو اس نے بتایا کہ وہ جو اونٹ برآمدہ کے سامنے بیٹھے ہیں جہاں ہماری چارپائی پڑی ہے اسی کے سامنے اس کی سانڈنی بیٹھی چارہ کھا رہی ہے۔ میں نے پوچھا کہ "پھر اس سے تیرا کیا مطلب ہے؟" تو وہ جواب ہاتھ جوڑنے اور قدموں پر گرنے لگا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ "یاد رکھیو۔ اگر تو نے ہاتھ ڈالا چھوکری پر تو تجھے جیل بھجوا دونگا۔" اس کے جواب میں اس نے بھی خوشامدانہ ہنسی ہنسکر اور گڑگڑا کر کہا کہ جلدی سے اپنے سیٹھ جی سے کہئے کہ ٹکٹ لے آئیں۔ مطلب یہ کہ میں ان کو یہاں سے دفان کر دوں۔ میں سوچتا ہوا چلا آیا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں کہدوں سیٹھ جی سے کہ وہ ٹکٹ لے آئیں اور یہ چھوکری کو لے اڑے؟ پھر میں نے سوچا کہ ان جھگڑوں سے پہلے یہ بھی غور کرنا ہے کہ کہیں میری گرما گرم پوریاں نہ رہ جائیں۔ لہذا پہلے تو میں نے گرم گرم پوریاں کھائیں۔ اس کے بعد میں نے لالہ جی کو ٹکٹ خریدنے سٹیشن بھیجا۔ ان کے جانے کے فوراً ہی بعد میں نے دیکھا کہ برآمدہ کے اس سرے پر سیٹھ جی کے داماد نے کھمبنہ کی آڑ سے سر نکالکر جھانکا۔ اور مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں گھبرایا۔ اور تو کچھ میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں خود اٹھکر اور لڑکی سے یہ کہکر کہ یہیں بیٹھی رہیو۔ اشٹیشن کی طرف چلدیا۔ اُدھر سیٹھ جی ٹکٹ خرید چکے تھے۔ اب جو منہ پھیر کے دیکھتا تو وہ بوی کا شیدائی "بے ضابطہ بداگی" میں سرگرم تگ و دو تھا۔ اور منزل مقصود سے قریب تر۔ میں نے دل میں کہا کہ اکیلے اکیلے یہ تماشا دیکھنا ٹھیک نہیں۔ لہذا سیٹھ جی کو جو اب ٹکٹوں کو غور سے دیکھتے اور سنبھال سنبھال کر جیب میں رکھتے ہوئے میری ہی طرف آرہے تھے میں نے بڑے زور سے چلا کر پکارا۔ کہ "دوڑو" ادھر رخصتی اس حد تک عمل میں آچکی تھی کہ "دولہا دلہن" سانڈنی کی پشت پر تھے اور وہ کھڑی ہوا ہی چاہتی تھی جو سیٹھ جی نے یہ روح فرسا نظارہ دیکھا ہے اور ادھر لڑکی کے چلانے کی آواز آئی ہے تو بس کچھ نہ پوچھئے "لینا۔ پکڑنا۔ دوڑنا" کہتے ہوئے ہم دونوں جھپٹے۔ مگر واہ رے جانباز!

۵ برق تھی، صرصر تھی، یا تھا زلزلہ
واہ رے جانباز تیرا حوصلہ!

وہ پرتھوی راج کی طرح اپنی سمیکتا کو اگلے آسن پر بٹھا سانڈنی کو جو "ڈھانگٹ" بیکراٹرا ہے تو نہ میری رن رفتاری کام آئی، نہ سیٹھ جی کی معہ توند کے صبا رفتاری۔ "لینا۔ پکڑنا۔ دوڑنا" کہتے رہ گئے ـــــــ جب تک دوسرا اونٹ کرایہ پر لیں اور لوگوں کو اچھی طرح سمجھائیں کہ "کس کو کون لے کر بھاگ گیا؟" سانڈنی کی گرد بھی ہوا ہو چکی تھی۔ داماد کی پگڑی البتہ سسر کے ہتھے چڑھی جو نہ معلوم کس طرح اس افراتفری میں کھل کر گر پڑی تھی۔ اور لڑکی کا ایک جوتا۔ ہمارے سیٹھ جی اِدھر اُدھر اتنا دوڑے جتنا ایک مارواڑی کو دوڑنے کا حق بھی نہیں ہے مگر لا حاصل۔ سانس پھولی ہوئی۔ توند تمام جذبات کے مدوجزر کا آئینہ تھی۔ اور غصہ میں بولنا چاہتے تھے تو سوائے "پھق پھق" کے منہ سے کچھ نہ نکلتا تھا۔

میری بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ یہ واقعہ بیکانیر کے علاقہ میں ہوا۔ کیونکہ دھرمشالہ بیکانیر کی سرحد میں ہے۔ بالفاظ دیگر اگر فوجداری کا مقدمہ چلایا جائے تو اسی ریاست میں چلے اور میری خدمات سے سیٹھ جی کچھ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ افسوس!

سیٹھ جی اونٹ کرایہ کر کے بیکانیر کے علاقہ کے قریب کے تھانہ کو روانہ ہوئے۔ مجھے بھی لیجانا چاہتے تھے مگر میں جا کر کیا کرتا۔ میری اور انکی دونوں کی بدحواسی ملاحظہ ہو کہ اپنا اور لڑکی کا اور میرا۔ یہ تینوں ٹکٹ انہی کی جیب میں رہ گئے۔ منجملہ دو سو کے ابھی پچاس روپے اور میرے باقی تھے۔ لہٰذا اب وہ ڈوبے اور ٹکٹ گھاٹے میں گیا۔ یعنے اپنے پاس سے کرایہ دیکر گھر پہنچا۔

اگلی پیشی پر تار دیکر سیٹھ جی نے مجھے پھر بلایا۔ میں پہنچا اور عدالت میں حاضر ہوا۔ وہاں نہ مدعی، نہ اس کا وکیل اور نہ پیروکار فوراً میں نے ایک قابل وکیل کی طرح درخواست کر کے مقدمہ میں یکطرفہ ڈگری کرائی یعنے دعویٰ مدعی معہ خرچہ خارج۔ "لیجئے" میں نے سیٹھ صاحب سے کہا "مبارک ہو۔ دعوی مدعی معہ خرچہ خارج۔ مقدمہ جیت گئے۔ اب دلوائیے بقایا فیس"

ادھر میں نے مبارکباد عرض کی۔ اور ادھر عدالت کا چپڑاسی مبارکباد کا سلام کرنے لگا۔ اب سیٹھ صاحب ہیں کہ نتھنے پھلائے کھڑے بھنّا رہے ہیں۔ غصہ میں چڑچڑا کر سیٹھ جی نے سر ہلایا۔ میں نے سیٹھ جی کی استدعا پر عدالت کو مطلع کیا کہ صاحب مقدمہ تو ہم جیت گئے مگر مدعی لڑکی کو جو چھین لے گیا "بھلا عدالت سے سوائے ایک تمسخر آمیز ہنسی کے اس کا کیا جواب ملنا تھا۔ اگر لڑکی کو جبراً پکڑ لے گیا تو عدالتیں موجود ہیں۔ باضابطہ کارروائی اور چارہ جوئی کرو۔

اب ذرا غور فرمائیے کہ کس طرح قانونی پوائنٹ پر میں نے ایسا مقدمہ جیتا کہ جس کی کسی طرح توقع نہ تھی۔ مگر سیٹھ جی کی حماقت ملاحظہ ہو کہ بیکانیر کے تھانہ میں جا کر رپٹ لکھائی تو وہ بھی کس قدر خوبصورت! بجائے اس کے کہ یہ رپٹ لکھواتے کہ ہماری لڑکی کو ایک غیر شخص بھگا لے گیا۔ وہاں لکھا دیا کہ میرا داماد میری لڑکی کو لے کر بھاگ گیا۔ وہاں پولیس والوں نے سیٹھ جی سے روپیہ الگ اینٹھا اور جب حقیقت حال کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ ہوا کھائیے۔ اچھا ہوا لے گیا۔ اس کی بیوی تھی۔ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے جان سے کہا کہ یہ کیا حماقت کی؟ تو فرماتے ہیں "بھولے سے ایسا ہو گیا"۔ اب بتائیے! میرے پاس اس "بھولے سے" کا کیا علاج؟ کہنے لگے کہ کسی طرح اپنی عدالتوں سے وارنٹ کٹوا دو تو سو روپیہ دیں۔ میں نے کہا پہلے بقایا تو لاؤ۔ تو بولے وارنٹ کٹنے کے بعد سب دیدینگے۔ نہ سیٹھ جی نے بقایا دیا ہے نہ دیں۔ اور نہ اب تک وارنٹ کٹا ہے نہ کٹے۔ سیٹھانی جی روتی تھیں اور کہتی تھیں میرا مقدمہ پٹ کر دیا۔ ذرا غور تو کیجئے کہ صاف جتا دیا اور اس پر یہ!

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ میں نے ایسا مقدمہ فتح کیا جس کو دیکھکر سب وکیل جواب دے چکے تھے۔ بڑے سے بڑے وکیل نے کہدیا تھا کہ دعویٰ مدعی خارج نہیں ہو سکتا کیسی کھینی

۱؎ سانڈنی کی سرپٹ چال

میں نے محنت کی اور کیسی میری گاڑھی کمائی کا روپیہ سیٹھ جی نے مار لیا ہے۔ ایک نہ دو بلکہ پچاس روپے! کوڑی بقایا کی نہیں دیتے۔ بلکہ شاکی ہیں کہ صاحب معاملہ بگڑ گیا۔ بڑی ہیٹی ہوگئی کیا ترکیب کی جائے۔ میں بھلا اس کا کیا جواب دوں۔ سوائے اس کے کہ بھیا سیٹھ جی تم بقایا میرا لاؤ۔ جو روہ میری جان کھائے جاتی ہے۔ جب بقایا ادا کردو گے تو پھر ہم بھی کوئی ترکیب سوچیں گے۔

اس مقدمہ کے سلسلہ میں کچھ اور کام بھی وہاں مل گیا تھا اور اسی کام کے لئے جو وہاں جانا ہوا تو اپنے مہربان سیٹھ جی کے یہاں ٹھیرا۔ سیٹھانی درد بھرے لہجہ میں شکایت کرنے لگیں کہ اندھیر ہے اس دنیا میں۔ میری لڑکی اور کوئی زبردستی لیجائے! اور سنوائی نہ ہو۔ میں نے کہا کہ سیٹھانی جی سنوائی ایسے ہوگی کہ بقایا فیس دلواؤ۔ انہوں نے سفارش بھی کی مگر سیٹھ جی نے بقایا فیس نہ دینا تھی نہ دی۔ بلکہ مجھے جیتے ہوئے مقدمہ کی نقل فیصلہ اور پرچہ ڈگری دکھا کر بولے کہ ابتو اس کی اجرائے ڈگری کراؤنگا خرچہ مقدمہ کے بیس تیس ڈگری میں پائے تھے۔ مجھ سے بولے کہ وکیل صاحب اب ضد ہے تو ضد ہی سہی۔ اجرائی ضرور کرادونگا بولو کیا فیس لوگے؟

میں نے سیٹھ جی سے کہا کہ میں بھلا آپ سے اب اس معاملہ کی کیا فیس لونگا۔ میرا آپ کا واحد معاملہ ٹھیرا۔ مفت کردونگا۔ بس بقایا ادا کردو۔ مگر وہ بندۂ خدا بقایا نہیں دیتا۔ اس شرط پر بھی نہیں دیتا۔

رجسٹر مقدمات کو جو دیکھتا ہوں تو خانم نے خود مبلغ ترپن روپیہ کا بقایا لکھدیا ہے۔ (میری تو قسمت تھی) کیوں! اجی یہ بھی اگر قابل وصول نہیں تو پھر اور کونسا بقایا وصول ہوگا۔ خانم کا کہنا بالکل درست ہے۔ کہ یہی ٹھیرا تھا کہ دعوائے خارج کرادو۔ تو ہم نے کرا دیا دعوائے خارج۔ اب ہم کیا جانیں کہ کوئی انہیں یا ان کی لڑکی کو پکڑ لے گیا۔ قصہ مختصر یہ بقایا خانم کے نزدیک قابل وصول ہے۔ تھوڑے دنوں بعد ہی ترپن روپے کی رقم وصول نہ کرنے کی پاداش میں پھر دیکھئے گا کہ میری ناک میں تیر ڈالا جائے گا۔

اب آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ میری فیس کا بقایا میرے لئے کس طرح وبال جان ہو رہا ہے۔ کہاں سے یہ ترپن روپے لاؤں جو بقایا صاف ہو۔

یہ ہے جناب میری فیس کی داستان درد۔ کس طرح ہم لوگ یعنی وکیل اپنا خون پانی ایک کرکے مقدمات جیتے ہیں اور کس طرح ہمارے ساتھ لوگ ظلم کرتے ہیں۔

دعا کیجئے کہ خداوند تعالیٰ میرے یہ ترپن روپے کسی تدبیر سے وصول کرادے۔ کیونکہ جتنی بقایا کی رقمیں ہیں انمیں سے سب میں زیادہ اسی کے وصول ہونے کی خانم کو توقع ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس رقم کو بقایا کے خانہ میں ہرگز ہرگز میں نے نہیں ڈالا۔

(**نوٹ**:- ہم بھی ناظرین سے سفارش کرتے ہیں کہ اپنے اپنے شہر کی مسجدوں میں جمعۃ الوداع کے روز دعا کریں کہ یہ رقم وصول ہوجائے یا پھر اللہ میاں سیٹھ جی کو ایک اور بیٹی کا باپ بنادے!)

تلاش

اداس زندگی کو خوشی کی تلاش ہے۔ قیدی کو رہائی کی تلاش ہے۔ میخوار کو دختر رز کی تلاش ہے۔ جاں نثار پروانوں کو شمع کی تلاش ہے۔ سوگواروں کو سکون کی تلاش ہے۔ مریض کو شفا کی تلاش موت کو صرف بہانہ کی تلاش ہے۔ طالب علم کو علم کی تلاش ہے۔ ظالم کو ظلم کی تلاش ہے صنف ذکور کو صرف حسن ظاہر کی تلاش ہے۔ صنف نازک کو صرف مطمئن زندگی کی تلاش ہے۔ غرض ہر ایک سرگرم تلاش ہے ——لیکن—— میں اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں جس کو کسی طرح نہیں پاسکتی۔ دنیا یہ سنکر طعن آمیز ہنسی ہنسے گی... کیا مضائقہ ہے مجھ پر ایک جھوٹا قہقہہ لگالے... مگر مجھے تو ہر معبد میں معبود حقیقی کی تلاش ہے۔

(مس ایس احمد حسن۔ دکن)

کائنات لاہور



اردو علم ادب کے زبردست بہی خواہ

اردو زبان

اردو زبان صحیح معنوں میں ہندوستانی زبان کہی جاسکتی ہے کیونکہ ہندوستان کی دیگر صوبہ دار زبانوں (ہندی۔ بنگالی پنجابی۔ کشمیری۔ پشتو۔ مدراسی۔ مرہٹی وغیرہ) کے مقابلہ میں بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ گیارہ سال پہلے کے اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ ملک میں نو کروڑ کے قریب) انسان اردو زبان بولتے ہیں۔ بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ اس گیارہ سال کے دوران میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں کچھ نہ کچھ مزید اضافہ ہوا ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تعداد کسی دوسری ہندوستانی زبان کو میسر نہیں۔

آج کل بعض ارباب سخن اور نقادان فن، اردو زبان کی توسیع و اصلاح کی طرف توجہ مبذول فرما رہے ہیں۔ اور رسائل اردو ان کی معاونت کر رہے ہیں۔ لیکن قابل نظریات یہ ہے کہ بعض حضرات تو اصلاح کے پردہ میں اعتدال سے متجاوز اور بعض شخصیت سے مرعوب نظر آتے ہیں۔ مثلاً نجم صاحب امروہوی نے جہانگیر بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں "اصول تنقید" کے عنوان سے جناب سیماب اکبرآبادی کی ایک غزل کو ہدف اعتراضات بنایا ہے اور اسی سلسلہ میں آپ اردو کے بڑے بڑے اساتذہ پر برس پڑے ہیں۔ جن میں ولی۔ میر۔ غالب۔ داغ۔ اقبال۔ وغیرہ سب شامل ہیں۔ نجم صاحب نے ولی کا ایک شعر لکھا ہے جس کے متعلق ان کی رائے ہے کہ آج تک اس شعر کے صحیح معنی معلوم ہی نہیں ہوسکے۔ شعر یوں لکھا گیا ہے ؎

یہ تل تجھ مکھ کے کعبہ میں مجھے اسود حجر دِستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہ کا اثر دِستا

اس شعر کا دوسرا مصرعہ نجم صاحب نے غلط لکھا ہے۔ لیکن انہیں دوسرے مصرعہ پر کوئی اعتراض نہیں۔ صرف "دِستا"، ناگوار ناقابل فہم اور لائق اعتراض ہے۔ یہ تو نجم صاحب کو معلوم ہوگا کہ اردو کن کن زبانوں سے مل کر بنی ہے؟ ان میں ایک پنجابی زبان بھی ہے۔ جو اردو سے بہت قریب ہے اور جس کے ہزاروں الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ بعض اصل املا اور اصل مفہوم کے ساتھ۔ بعض کسی قدر تغیر و تبدل کے ساتھ۔ یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ ہر لفظ جو کسی دوسری زبان سے آتا ہے وہ اکثر و بیشتر ابتدا میں اصل املا اور اصل مفہوم کے ساتھ ہی استعمال ہوا کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اس میں اصلاح و ترمیم ہوتی ہے۔ حضرت ولی اردو کے ابتدائی دور کے شعراء اول کی صف سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس زمانہ میں الفاظ نے کوئی اصلاحی صورت اختیار نہ کی تھی۔ چنانچہ یہ پنجابی لفظ بھی "دِستا" کا "دِستا" ہی رہا جو آج "دکھتا"، لکھا اور بولا جاتا ہے۔ "دِستا" کے معنے "دکھائی دیتا"، "نظر آتا"، "سوجھتا"، ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ اے محبوب تیرے چہرہ میں جو کعبہ کی طرح پاک صاف۔ نورانی اور قابل احترام ہے یہ حسین اور سیاہ تل مجھے ایسا نظر آتا ہے جیسے حجر اسود جسے بے ساختہ چومنے کو جی چاہتا ہے یا جسے بوسہ دینا فرض ہے۔ حسن طلب تو ملاحظہ فرمائیے اور واللہ کیا ندرت ہے! لیکن نجم صاحب ہیں کہ یہاں فہم و درک سے مستعفی ہوئے جاتے ہیں۔ ولی کے محبوب نے بھی اس حسن طلب پر شاید اتنی بیزاری کا اظہار نہ کیا ہوگا جتنی نجم صاحب کی تحریر سے ظاہر ہو رہی ہے

اسی طرح علامہ اقبال کی نظم "شمع اور شاعر" کا ایک شعر آپ کو قابل اعتراض نظر آتا ہے۔ اور خیر سے اسے بھی آپ نے غلط تحریر فرمایا ہے۔ شعر اس طرح لکھا گیا ہے ؎

اب نور پیدا ہے کیا گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا!

دوسرے مصرعہ کا وزن ہی غت ربود کر گئے۔ جس سے وہ نہایت "بے محل" "بے موسم" بلکہ "بے فصلی" بنکر رہ گیا۔ خیر چونکہ دوسرے مصرعہ کو تو وہ غلط لکھنے کے عادی ہی ہیں۔ اور اس پر اعتراض بھی نہیں کیا کرتے۔ اس لئے ہم بھی اس کو چھوڑتے ہیں باقی رہا اعتراض تو وہ قابل توجہ ضرور ہے۔ نجم صاحب فرماتے ہیں کہ موسَم دراصل موسِم ہے اور برہم کا ہم قافیہ نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے انہوں نے عربی، فارسی لغات سے ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اہل لغت نے اصل زبان میں اسے فتح سین سے غلط قرار دیا ہے لیکن اردو میں یہ غلط ہرگز نہیں۔ اس کی صحت و عدم صحت کے لئے عربی فارسی لغات سند نہیں ہوسکتیں اردو میں تمام فصحائے حال اسے سین مفتوح سے پڑھتے بولتے اور لکھتے ہیں۔ اور ایک لفظ موسَم ہی پر کیا منحصر ہے۔ بہت سے عربی الفاظ اردو میں حرکت واملا چھوڑ مفہوم بھی جدا رکھتے ہیں مثلاً "حرکت۔ حرکات۔ علامہ۔ قطامہ۔ ظلمات" وغیرہ اگر کوئی بچہ کھانا کھاتے میں شوربے کی چھینٹوں سے اپنے کپڑوں اور دسترخوان کو آلودہ کرنا شروع کردے تو اس سے کہتے ہیں "یہ کیا حرکت؟" یعنے "یہ کیا بدتمیزی کی"۔ کیا آپ اس وقت اظہار غصہ کرتے ہوئے بچہ سے یہ فرمائیں گے کہ "یہ کیا شوربے کو حرکت دے رہے ہو؟" اور اگر آپ فرما بھی دیں تو کیا بچہ آپ کے مفہوم کو سمجھ لے گا؟ ہمارا تو خیال ہے کہ شاید بچہ کی والدہ صاحبہ بھی سمجھنے سے قاصر رہیں گی۔ اسی طرح "علامہ دہر" یا صرف "علامہ" ذرا کسی شریف عورت کو تو کہہ دیکھئے جو آپ کی ساری لغت دانی کو توم کے نہ رکھدے۔ پس موسَم فتح سین سے کم از کم اردو میں غلط اور قابل اعتراض ہرگز نہیں اور برہم کا قافیہ بن سکتا ہے۔

البتہ علامہ اقبال کا یہ شعر ضرور قابل نظر ہے ؎

کی ترک تگ و دو قطرے نے تو آبروے گوہر بھی ملی
آوارگی فطرت بھی گئی اور کشمکش دریا بھی گئی!

اس شعر کا مطلب مدیر "ادبی دنیا" اپنے رسالہ بابت ماہ ستمبر ۳۲ء میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

"قطرہ دریا میں ہوتا ہے تو پانی کی کروٹوں میں مبتلا رہتا ہے۔ جب وہ پانی بخارات بن کر برستا ہے تو پریشان ہوجاتے ہیں۔ لیکن جب وہی قطرہ اپنی اس کھینچ تان سے آزاد ہو کر سیپ کے اندر سکون اختیار کرلیتا ہے تو موتی بن جاتا ہے۔ اور گرانقدر ہوجاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ چھچھورے پن میں تکلیف ہوتی ہے اور وقار پیدا کرنے میں عزت ہے۔"

بار بار پڑھئے اور بحر غور وفکر کی "کروٹوں میں مبتلا" ہوجائیے۔ گوہر معنی ہاتھ آجائے تو ہمارا ذمہ! قطرہ کا پانی کی کروٹوں میں مبتلا ہونا نئی دریافت ہے۔ پھر "جب پانی بخارات بن کر برستا ہے تو پریشان ہوجاتے ہیں" اب یہ دریافت کیجئے کہ کون بزرگ پریشان ہوجاتے ہیں؟ ۔ حضرت شاعر؟ ۔ یا جناب شارح؟ یا دونوں صاحبان؟ ان دونوں منزلوں کو طے کرنے کے بعد تیسری منزل جو حاصل کلام ہے یہ ہے کہ "چھچھورے پن میں تکلیف ہوتی ہے"، کیوں صاحب! تکلیف کس کو ہوتی ہے؟ کم از کم چھچھورے آدمی کو تو اپنے چھچھورے پن سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ ہاں اس کے چھچھورے پن سے دوسرے شرفا کو ضرور تکلیف پہنچتی ہے۔

خدا جانے اس بے معنی اور الجھی ہوئی شرح سے (اگر اسے شرح کہا جاسکے تو) ناظرین "ادبی دنیا" کہاں تک مستفید ہوئے ہونگے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں شاعر اپنے مفہوم کو بطریق احسن ادا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ یا ایک ایسا نظریہ پیش کررہا ہے جو بالبداہت غلط ہے۔

ترک تگ ودو سے کبھی کسی کو عزت و آبرو نہیں ملی۔ بلکہ تگ ودو کرنے سے آبرو نصیب ہوتی ہے۔ مگر یہاں جد وجہد کے چھوڑ بیٹھنے کا نتیجہ کامیابی بتایا جارہا ہے۔ یعنے دوڑ دھوپ ترک کردینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قطرہ موتی بن گیا۔ حالانکہ تگ ودو کرنے اور بخارات بن کر اڑنے اور پھر منزل مقصود (سیپی) تک پہنچنے ہی کا نتیجہ موتی بننا ہوتا ہے۔ اسی جد وجہد کی بدولت ایک قطرہ بمقدار، گوہر آبدار بن کر عزت پاتا ہے۔ غالباً شاعر

نے اسی مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب قطرہ اپنی تگ و دو سے منزلِ مقصود پر پہنچ گیا تو پھر اس نے تگ و دو ترک کر دی کیونکہ منزلِ مقصود پر پہنچ جانے کے بعد کسی تگ و دو کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وہ تو تگ و دو کے صلہ کا وقت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس قطرہ کو نہ صرف آبروئے گوہر مل گئی بلکہ آوارگی فطرت اور کشمکش دریا سے بھی نجات مل گئی۔ آوارگیٔ فطرت اور کشمکش دریا سے نجات پانا بھی ایک انعام ہے اسی جد و جہد کا۔ ایک صلہ ہے اسی تگ و دو کا۔ اگر وہ تگ و دو نہ کرتا تو قیامت تک بھی موتی نہ بن سکتا۔

علامہ اقبال کے اس شعر کا یہ مفہوم بھی اسی وقت صحیح کیا جا سکتا ہے جب محض اسی شعر کو . . . . پیشِ نظر رکھا جائے لیکن اگر یہ شعر کسی مسلسل نظم کا ہے تو سیاق و سباق پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔

ایڈیٹر صاحب "ادبی دنیا" نے اسی نمبر میں ایک اور شعر کی شرح اس سے بھی زیادہ "دلچسپ" رنگ میں تحریر فرمائی ہے۔ شعر ہے ؎

زخمۂ رگہائے گل ہے ساز شبنم ساز ہے
یا ہوا سے کہہ رہا باتیں سراپا ناز ہے

اس شعر کے حاشیہ پر بائیں جانب "درصفت جھینگر کی" بھی لکھا ہوا ہے۔ جسے دیکھکر ہمیں عہد مغلیہ کے کائستوں کی فارسی دانی یاد آ گئی۔ ایک مشہور فقرہ ہے "درینجا لُٹیا نہادہ بود تُنے تو نا اٹھائیے؟" بعینہٖ یہی صنعت "درصفت جھینگر کی" میں رکھی گئی ہے۔ ورنہ یوں تو "در صفتِ زنجرہ" یا "جھینگر کی تعریف میں" بھی لکھا جا سکتا تھا مگر اس طرح عنوان نرا فارسی یا خالص اردو بن کر رہ جاتا اور یہ شاید انہیں منظور نہ تھا۔

یہ تو رہا عنوان کا لطیفہ۔ اب ذرا شرح ملاحظہ فرمائیے:-

"۔۔۔۔ شاعر جھینگر کو جس کے پروں پر رات کو شبنم گری تھی اور جو بظاہر شبنم نما معلوم ہو رہا تھا پھول کی پتی پر بیٹھا دیکھکر تعجب سے سوال کرتا ہے کہ یہ جھینگر گل کے ستار کی مضراب ہے۔ یا شبنم سے بنا ہوا باجہ؟ یا اگر یہ بھی نہیں تو کیا پھر کوئی مجسمہ ناز ہے جو ہوا سے ہم سخن ہے؟"

ایڈیٹر صاحب "ادبی دنیا" کی دوسری جدید ترین دریافت یہ ہے کہ جھینگر کے بھی "پر" ہوتے ہیں۔ ممکن ہے چند روز بعد مینڈک کے بھی پر ثابت ہو جائیں۔ کیونکہ مینڈک اور جھینگر ایک ہی جیسی رفتار یا "پرواز" رکھتے ہیں۔ اگر ممدوح کی تحقیقاتِ جدیدہ کی یہی جولانیاں رہیں تو یقین کے درجہ تک امید ہے کہ آئندہ نوبل پرائز کے لئے آپ ہی کا نام تجویز کیا جائے گا۔ اور اس طرح آپ نوبل پرائز پانے والے چوتھے ہندوستانی محقق، ادیب اور شاعر ہوں گے۔

ہاں تو جھینگر نے پروں سمیت جو رات بھر پھول کی پتی پر بسرا کیا۔ اور وہ قطرات جو دن کو "پانی کی کروٹوں میں مبتلا" تھے رات کو شبنم بنکر برسے تو جھینگر "بظاہر" شبنم نما معلوم ہونے لگا۔ اور شاعر اسے دیکھکر بے اختیار ایک نظم "در صفت جھینگر کی" لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر جب جھینگر کے * پروں کو اور پھر اس پر شبنم کے موتیوں کو دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا اور تعجب سے پوچھنے لگا کہ یہ کیا ہے؟! زخمۂ رگہائے گل ہے؟ ساز شبنم ساز ہے؟ یا ہوا سے "کہہ رہا باتیں" سراپا ناز ہے؟!! ابھی وہ اسی تعجب و حیرت میں مبہوت کھڑا "کہہ رہا باتیں" تھا۔ کہ اتنے میں غیب سے ایک آواز آئی کہ اے شاعرِ خوش گفتار نہ گھبرا یہ پردار جھینگر ہے!!...

اب قابلِ ملاحظہ امر یہ ہے کہ جب ایسے ایسے ذمہ دار بزرگ "ادب و شعر" پر ایسی خامہ فرسائی اور طبع آزمائی فرمائیں تو عوام کی اصلاح ذوق و زبان کیونکر ممکن ہے ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلا — کارِ طفلاں تمام خواہد شد

مُلا سے ہماری مراد پروفیسر تاجور صاحب ہرگز نہیں۔ ہم انہیں ایک اچھا خاصہ شاعر و ادیب سمجھتے ہیں۔ گزارش صرف اس قدر ہے کہ وہ یا ان کے اسسٹنٹ، اشعار کی شرح کسی فرصت کے وقت فرمایا کریں کیونکہ ان کے ہزاروں

ناظرین انہی کی تحریر کو سند قرار دیں گے اور دیتے ہوں گے۔

مولانا اظہر صاحب بی اے ایل ایل بی نے ایک مضمون "اصلاح زبان اردو" کے عنوان سے "چمنستان" راولپنڈی بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں سپرد قلم فرمایا ہے۔ جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ اردو۔ فارسی۔ عربی۔ ہندی اور انگریزی کے الفاظ کی باہمی تراکیب میں "عطف و اضافت" کا استعمال صحیح قرار دیا جائے۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں وسعت زبان کیلئے روک اور غیر ضروری قیدیں ہیں۔ ایسے عطف و اضافت کی اساتذہ کے کلام سے کئی مثالیں بھی انہوں نے پیش کی ہیں اس سلسلہ میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ جناب نشتر جالندھری اور جناب عابد مسیح بی اے نے "تحصیلدار۔ سمجھدار۔ پھلدار۔ چمکدار" وغیرہ الفاظ کو غلط قرار دیا ہے۔ اگر انہیں غلط بھی قرار دیا جائے تو غلط العام کے اصول سے فصیح ہیں۔ ہم اظہر صاحب کی رائے سے ایک حد تک متفق ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ان الفاظ کو اردو ترکیب سے آسانی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے تو پھر فارسی یا عربی ترکیب کی کیا ضرورت ہے۔ جیسے فوق البھڑک سے بھڑکیلا۔ چمکدار سے چمکیلا۔ بلاشبہ جو الفاظ فارسی ترکیبوں سے مستعمل ہو کر اردو میں گھل مل گئے ہیں اور زبان زد عوام و خواص ہو کر غلط العام کے دائرہ میں آ چکے ہیں جیسے تحصیلدار (وامثالہم) انہیں غلط یا قابل ترک نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ مگر اس کے ساتھ ہی جناب اظہر صاحب سے ہم عرض کریں گے کہ جدید مخلوط ترکیبیں گھڑنے اور مخلوط مرکبات کے اختراع و ایجاد کرنے کی عام اجازت دینا غیر ضروری ہے۔ ورنہ توسیع زبان کا مقصد حاصل ہونے کے بجائے فصاحت زبان کو سخت نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ مانا کہ اردو زبان کی ایک بڑی خوبی اس کا اختصار بھی ہے۔ لیکن اس اختصار کیلئے ایسی ترکیبیں ایجاد کرنا جس سے ذوق سلیم مجروح ہو جائے۔ اور جو سماعت پر بار گراں معلوم ہوں کسی طرح درست نہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بعض لوگ ذرا سے اختصار کی خاطر کیسی کیسی کریہہ ترکیبیں استعمال کرتے ہیں "ٹکڑے جات اراضی" اور "ٹکڑا ہائے زمین" اس کی نادر مثالیں ہیں۔ کیونکر ممکن ہے کہ جدید تراکیب میں نفیس اور پاکیزہ اختراعات ہی آپ کے سامنے آئیں؟

یہ صحیح ہے کہ مرزا غالب نے "پیشکش گورنمنٹ" اور "بہ سبیل ڈاک" لکھا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ اردو کے ایک مسلمہ شاعر اور استاد تھے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرزا غالب ایرانی نژاد تھے۔ ان کی مادری زبان فارسی تھی۔ اور کثرت سے فارسی تراکیب استعمال فرماتے تھے۔ اس کے ثبوت میں ان کا سارا ابتدائی اردو کلام پیش کیا جا سکتا ہے جس میں حروف ربط کے سوا شاید ہی کوئی اردو لفظ ملے۔ پھر عصر غالب سے لیکر آج تک کے طویل عرصہ میں اردو زبان نے جو ترقی و وسعت حاصل کر لی ہے وہ بھی آپ سے پوشیدہ نہیں آج آپ "پیشکش گورنمنٹ" کی جگہ "پیشکش حکومت" فرما سکتے ہیں۔ کیونکہ "حکومت" اب اردو۔ فارسی۔ عربی میں یکساں طور پر "گورنمنٹ" کے مرادف۔ ہم معنی اور قائم مقام ہے۔ اسی طرح "بہ سبیل ڈاک" کی جگہ "ڈاک کے ذریعہ" کہہ سکتے ہیں جس میں کوئی طوالت اور ثقل نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غالب نے غلط لکھا ہے۔ علی ہذا القیاس "ڈگری یافتہ" کا مفہوم "سندیافتہ" سے ادا ہو سکتا ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم محض اس لئے کہ اساتذۂ متقدمین کے کلام میں اس کی خال خال نظیریں مل سکتی ہیں ایسی گنگا جمنی ترکیبوں کو رواج دینے کی کوششیں کریں۔ ہمارے خیال میں مخلوط تراکیب و مرکبات کی ترویج سے فائدہ کا امکان کم اور نقصان کا احتمال زیادہ ہے اس لئے جہانتک ہو سکے ایسی خلط ملط سے اردو زبان کو محفوظ رکھنا چاہئے۔ ہاں جو ترکیبیں عام فہم اور کثرت نوشت و خواند سے اردو الفاظ میں گھل مل کر روزمرہ بن چکی ہیں انہیں چھونے۔ چھیڑنے اور ترک کر دینے کی سعی لاحاصل ہے۔ البتہ نشتر صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے کہ "تابعدار" کی جگہ "تابع" کافی ہے اور "راشی" (یعنی رشوت خوار) کی جگہ "مرتشی" ہونا چاہئے۔ ایسے اغلاط کی اصلاح ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔

(سراج)

مذہبی جنون

(از جناب ایم اسلم صاحب لاہور)

فرانس میں خاندان ویلائس برسر حکومت تھا۔ اور کیتھولک مذہب کا پابند۔ اس وقت چارلس نہم کا زمانہ تھا اور اس کی بہن مارگرٹ ڈی ویلاس کے حسن و جمال کے یورپ میں چرچے تھے۔ فرانس کا ایک علاقہ جسے گسکنی یا نیوار بھی کہتے ہیں خاندان بوربان کے زیر نگیں تھا۔ اور اس وقت ہنری ڈی بوربان جو ایک بہت زندہ دل شہزادہ تھا وہاں حکمراں تھا۔ یہ لوگ "ہیگونات" مذہب کے پیرو تھے۔ کیتھولک اور ہیگونات مذہبی نقطۂ نظر سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ خاندان ویلائس کی خواہش تھی کہ کسی طرح ہیگونات فرقے کے لوگوں کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ بادشاہ چارلس نہم کی والدہ ملکہ کیتھرائن نے اپنی حسین و جمیل بیٹی "مارگرٹ ڈی ویلاس" کی شادی "ہنری ڈی نیوار" کے ساتھ کر دی۔ اس چال سے ہیگونات فرقے کے لوگ بےفکر ہو کر پیرس اور فرانس کے دوسرے شہروں میں رہنے لگے اور وہ بھی جو جان کے خوف سے باہر چلے گئے تھے واپس آ گئے۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ ملکہ کیتھرائن کی یہ چال ایک روز ایسے گل کھلائے گی کہ دنیا کانپ اٹھے گی اور یورپ کے درباروں میں تہلکہ پڑ جائے گا۔

"ہنری ڈی نوار" کی شادی جس دھوم دھام سے "مارگرٹ ڈی ویلاس" سے ہوئی اس کی نظیر فرانس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ "ہنری ڈی نیوار" بھی اب فرانس کے شاہی محل میں آ رہا۔ اور اس کے ساتھ اس کے تمام درباری اور دیگر عہدہ دار بھی پیرس میں آ گئے۔

اس شادی کے چند روز بعد سلطنت نیوار کے ایک بہت جلیل القدر عہدہ دار ایڈمرل کو لگنی کو جس وقت وہ شاہ فرانس سے مل کر واپس آ رہا تھا دن دہاڑے کسی نے گولی مار کر زخمی کر دیا۔ اس واقعے سے ہیگونات فرقے کے لوگ آگ بگولہ ہو گئے اور طرح طرح کی دھمکیاں دینے لگے۔

ملکہ کیتھرائن اور "ڈیوک ڈی گائز" جو بادشاہ کا ایک قریبی رشتہ دار اور شہزادی مارگرٹ کا عاشق بھی تھا، اس قسم کے ہنگامہ پرور واقعات کے دل سے متمنی تھے۔ ایک روز ملکہ اور ڈیوک دونوں بادشاہ کے پاس گئے اور مختلف بیوزن وجوہ پیش کر کے بادشاہ کو اس امر پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ ہیگونات لوگوں کے قتل کی اجازت دیدے لیکن بادشاہ ان کے خیال سے متفق نہ ہوا۔ ملکہ بیتاب ہو کر بولی

"تو معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک روز اپنے خاندان کی لٹیا ڈبو کر رہو گے"

"وہ کیسے؟" بادشاہ نے اپنی ماں سے پوچھا۔

"یہ اپنے دل سے پوچھو!" ملکہ بولی "بہرے تو ہو نہیں جو کچھ یہ لوگ سر بازار کہہ رہے ہیں وہ تو تم نے بھی سنا ہوگا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں؟" بادشاہ نے مسکرا کر کہا۔ "یہی نہ کہ ایڈمرل کولگنی کو جس شخص نے زخمی کیا ہے یا ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اسے تلاش کر کے سزا دی جائے۔ تو اماں جان! انصاف طلب کرنا تو کوئی جرم نہیں"

بادشاہ نے ہنس کر ڈیوک کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"کیوں جی آپ کی کیا رائے ہے۔ میرے خیال میں اماں جان تو تب خوش ہونگی کہ میں کسی ترکیب سے نصف درجن ہیگونات قتل کروا ڈالوں"

"نصف درجن!" ڈیوک نے مسکرا کر کہا۔

"تو اور کیا؟" بادشاہ نے کہا "اور وہ بھی اس شرط پر کہ اس معاملہ میں میرا نام اشارتاً بھی نہ آنے پائے۔"

"بیشک"، ڈیوک نے کہا "اگر جہاں پناہ اجازت دیں تو کل ہی سارا ملک حضور کے تاج و تخت کے دشمنوں سے پاک ہو سکتا ہے۔"

"کل ہی!" بادشاہ نے ڈیوک کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جہاں پناہ!" ڈیوک بولا "کل ۲۴ اگست ہے اور یہ وہ متبرک دن ہے کہ اس روز "سینٹ بارتھا لومیو" نے مذہب کی خاطر اپنی کھال تک اتروا دی۔ لیکن اپنے عقیدہ سے منحرف ہونا منظور نہ کیا۔"

"اور تم"، بادشاہ نے کہا "میرے دشمنوں سے میرے ملک کو پاک کر دو گے۔"

"اگر حضور حکم دیں تو میں اپنی جان بھی قربان کرنے کو حاضر ہوں" ڈیوک نے گردن جھکا کر کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم مارگرٹ کے شوہر شہزادہ ہنری اور اس کے دوست کونٹ کانڈی کو اس محل میں قتل کر دو۔"

"حضور مطمئن رہیں" ڈیوک نے سینے پر ہاتھ رکھکر کہا "ملک میں کوئی فتنہ فساد نہیں اٹھے گا۔"

"تو پھر کیا دیر ہے؟" بادشاہ بولا "میرے کتے ابھی تک بھوکے ہیں۔ جاؤ! جلدی جاؤ!"

ملکہ کیتھرائن۔ ڈیوک ڈی گائز اور دیگر سرداران فرانس نے اسی شب ایک خفیہ مجلس مشاورت میں یہ فیصلہ کیا کہ اب یہ کام بہت جلد ہو جانا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ بادشاہ پھر انکار کر دے۔ چنانچہ اسی روز خاص خاص لوگوں کے ذریعہ سب کیتھولک لوگوں سے کہلا دیا گیا کہ وہ اپنی ٹوپیوں میں کسی پرندے کا سپید پر لگالیں اور جس وقت سینٹ جرمن کے گرجا کا گھڑیال زور زور سے بجنے لگے اسی وقت اپنے مذہب کو ملحدوں (ہیگوناٹ) سے پاک کرنے کے لئے مسلح ہو کر گھروں سے نکل آئیں۔

اگلے روز نصف شب کے قریب سینٹ جرمن کے گرجے کا گھڑیال بجنے لگا۔ اور کیتھولک مذہب کے لوگ مسلح ہو ہو کر گھروں سے نکلنے لگے اور ہیگوناٹ لوگوں کو قتل کرنے لگے۔ "ڈیوک ڈی گائز" چند سپاہیوں اور دوستوں کو ساتھ لئے کر "ایڈمرل کولگنی" کی قیام گاہ کی طرف گیا۔ یہ لوگ جس بازار سے گزرتے۔ خون خون کی آواز سنتے۔ رات کی تاریکی میں بدنصیب ہیگوناٹ لوگ ننگ دھڑنگ بازاروں میں جان بچانے کے لئے بھاگے پھرتے اور کیتھولک لوگ بھیڑیوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگتے اور پرلے درجہ کی سفاکی سے انہیں قتل کرتے۔

ایڈمرل کے مکان پر جب یہ لوگ پہنچے تو وہاں پہلے ہی کچھ گڑبڑی لگ رہی تھی۔ کچھ لوگ مشعلیں ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ ایڈمرل کے مکان سے چیخ پکار۔ تلوار کی جھنکار اور گولیوں کی آواز آ رہی تھی

ڈیوک نے پوچھا "مار لیا کافر!"

"ابھی نہیں" اوپر سے کسی نے جواب دیا۔

"اب دیر کیا ہے" ڈیوک نے پھر پوچھا۔

"ہٹو! ہٹو!" اوپر سے پھر کسی نے کہا۔ اور ساتھ ہی ایک بہت بھاری لاش کھڑکی میں سے نیچے گری۔ یہ ایڈمرل کولگنی تھا۔ بدن زخموں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ اور ہر زخم سے خون نکل رہا تھا۔ ڈیوک ایک آدمی کے ہاتھ سے مشعل لیکر پاس آیا۔ اور ایڈمرل کے سینے پر جسے سب لوگ مردہ سمجھ رہے تھے پاؤں رکھ کر بولا۔

"پاجی دیکھا! آج میں نے اپنے باپ کا انتقام لیا!"

اس وقت ایڈمرل نے آنکھیں کھولدیں اور ڈیوک کی طرف دیکھ کر بولا "گائز میں بے گناہ ہوں۔ میں تمہارے باپ کا قاتل نہیں آج جو سلوک تم نے مجھ سے کیا ہے کسی روز اسی طرح تمہارا قاتل تمہارے سینے پر پاؤں رکھکر تمہارا گلا کاٹے گا۔"

ڈیوک یہ خوفناک الفاظ سنکر ایک طرف ہٹ گیا۔

جس وقت محل میں ملکہ کیتھرائن اور ڈیوک ڈی گائز اپنے رازداروں کے ساتھ صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ اتفاق سے شہزادی مارگرٹ کی بڑی بہن شہزادی کلاڈ بھی ادھر آنکلی اور ان لوگوں کی باتوں کی کچھ بھنک اس کے کان میں بھی پڑ گئی۔ کلاڈ نے موقع پاکر مارگرٹ سے کہدیا کہ آج شب وہ "ہنری ڈی نیوار" سے کہدے کہ محل سے باہر نہ جائے

مارگرٹ اور ہنری ڈی نیوار کہنے کو تو میاں بیوی تھے لیکن دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ رہتے۔ مارگرٹ تو اس لئے ناخوش تھی کہ اس کی شادی ایک غیر مذہب والے سے کیوں کی گئی۔ اور ہنری کو یہ گلہ تھا کہ مارگرٹ اس کی بیوی ہو کر اس کے دشمنوں سے

میل رکھتی ہے۔ لیکن ان باتوں کی ذمہ دار خود ملکہ کیتھرائن ہی تھی کیونکہ وہ تو صرف "ہنری ڈی نیوار" کے خون کی پیاسی تھی اور محض نیوار کے شاہی خاندان کی بربادی کے لئے یہ ترکیب اس نے کی تھی رہی یہ بات کہ اسے اپنے داماد سے کیوں دشمنی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی جوتشی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ایک روز نیوار کا بادشاہ فرانس کے تخت و تاج کا مالک بنے گا۔

خیر مارگرٹ نے موقع پاکر اپنے شوہر ہنری کو خطرے سے آگاہ کردیا۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد لوگوں کی چیخ پکار سنکر کمرہ سے نکلی۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ محل میں بالکل خاموشی تھی لیکن بازاروں میں بہت شور و غوغا تھا۔ بندوق اور پستول کے چلنے کی آواز ہر طرف سے آرہی تھی۔ اس وقت اسے اپنے شوہر کا خیال آیا۔ ایک تو یوں بھی وہ اس کی جان بچانا اپنا اخلاقی فرض سمجھتی تھی دوسرے اس کو یہ بھی خیال تھا کہ اگر دشمنوں نے اس کے شوہر ہنری ڈی نیوار کو قتل کردیا تو پھر وہ کبھی فرانس کی ملکہ نہ بن سکے گی۔

وہ کچھ خوفزدہ سی ہوکر محل کے مختلف حصوں میں گھوم رہی تھی کہ اچانک ملکہ کیتھرائن کی ایک مصاحبہ اسے مل گئی۔ شہزادی نے اس سے اپنے شوہر کے متعلق پوچھا تو اس نے دبی زبان سے صرف اتنا جواب دیا کہ بادشاہ کے کمرے میں جاؤ۔

مارگرٹ جلدی جلدی محل کے اس حصہ میں گئی جہاں اس کا صاحب تخت و تاج بھائی رہتا تھا۔ بادشاہ کے کمرے کے آگے ایک عہدہ دار بیٹھا تھا۔ شہزادی کو آتے دیکھکر وہ تعظیم کے لئے کھڑا ہوگیا۔ لیکن جب مارگرٹ اندر جانے لگی تو وہ راستہ روک کر بولا "حضور اندر تشریف نہیں لے جاسکتیں"۔

"کیوں؟" شہزادی نے تعجب سے کہا۔

"بادشاہ سلامت کا یہی حکم ہے"

"لیکن میں تو بادشاہ فرانس کی بہن ہوں"

"خانہ زاد مجبور ہے"

"بیوقوف" مارگرٹ نے غصہ سے کہا "میں ملکہ نیوار ہوں"

"بیشک! لیکن آج کوئی بھی بادشاہ سلامت کے کمرے میں نہیں جاسکتا"

مارگرٹ مایوس ہوکر وہاں سے پلٹی اور دل میں سوچنے لگی کہ اب شوہر کو کس طرح بچاؤں! اب اسے اپنی ماں کی چال کا اصل مطلب معلوم ہوا۔ ملکہ کیتھرائن کے لئے ہیگونانٹ سرداروں کے قتل کرنے کی اس سے بہتر اور کوئی ترکیب نہیں تھی۔ کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ان لوگوں کے بادشاہ سے کردے۔ لیکن خیر اس وقت تیاسوں کا موقع نہیں تھا۔ مارگرٹ کچھ اس طرح پریشان حال محل کے مختلف کمروں میں گھوم رہی تھی کہ اسی وقت اسے ایک کمرے میں سے کسی کے سوز و گداز سے مناجات کرنے کی آواز سنائی دی اور وہ کان لگا کر سننے لگی

"ہنری ڈی نیوار" بادشاہ کے کمرے میں خاموش بیٹھا تھا اور بادشاہ کچھ طیش میں آیا ہوا کمرے میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا باہر سے متواتر بندوق کے چلنے کی آواز اور لوگوں کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی "ہنری" بہت بہادر اور دلیر تھا۔ وہ ہر معرکہ میں اپنے سپاہیوں کے دوش بدوش دشمن کا مقابلہ کیا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ بے بس تھا۔

اچانک بادشاہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھکر بولا۔

"ہنری! شکر کرو کہ آج تم محل میں ہو"

"شکر کیسا؟" ہنری نے کہا۔

"تو گویا تمہیں ابھی تک کچھ معلوم ہی نہیں" بادشاہ نے پوچھا۔

"فی الحال تو بالکل بیخبر ہوں" ہنری نے مسکراکر کہا۔

یہ سنکر چارلس اسے دریچہ کے پاس لے گیا اور بولا۔

"لو ذرا دیکھو" چارلس نے کہا۔

ہنری گردن باہر نکالکر دیکھنے لگا....

چاندنی رات تھی دریا میں ایک بہت بڑی کشتی پڑی تھی اس میں کچھ لوگ تلواریں برہنہ لئے کھڑے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں مشکیں باندھ باندھ کر لوگوں کو لایا جارہا تھا ان گرفتاران بلا میں جوان بوڑھے بچے سب شامل تھے۔ جب یہ چھوٹی کشتیاں بڑی کشتی کے پاس پہنچتیں تو جلاد جو بڑی کشتی میں کھڑے تھے ان لوگوں کی گردنیں مار مار کر انہیں دریا میں پھینک دیتے۔ شہزادہ ہنری گھبراکر پیچھے ہٹا اور بادشاہ سے پوچھنے لگا۔

"آخر یہ ظلم و ستم کیوں ہو رہا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟"

بادشاہ فرانس قہقہہ لگا کر بولا:-

"ہنری! آج ہیگوناٹ قتل ہو رہے ہیں"

اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اور انگلی سے ایک طرف اشارہ کر کے

"وہ دیکھو! وہ سامنے جو شعلے اٹھ رہے ہیں۔ یہی تمہارا ہوٹل ہے نہ"

ہنری کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تک نہ تھی۔ وہ غصہ سے بولا:-

"کاش آج میں محل میں نہ ہوتا"

"واللہ تم بڑے خوش قسمت ہو" بادشاہ نے کہا "جو آج محل میں ہو۔ کیوں بھائی! تم تو ہیگوناٹ نہیں ہو؟"

"جہاں پناہ کیا فرما رہے ہیں؟" ہنری نے کہا۔

"میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم کیتھولک ہو یا ہیگوناٹ؟"

"تو میرے خیال میں قتل کرنے سے پیشتر یہی سوال میرے آدمیوں سے بھی پوچھا جاتا ہوگا؟" ہنری نے کہا

"تو اور کیا" بادشاہ نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "میں کیتھولک ہوں اور جو کیتھولک ہے اس کے لئے آج زندگی ہے اور ہیگوناٹ کے لئے موت! سمجھ گئے ہنری!!"

"سمجھ گیا جہاں پناہ" ہنری نے دانت پیس کر کہا۔

"تو پھر بولو۔ تم کیتھولک ہو یا ہیگوناٹ؟"

"جہاں پناہ" ہنری نے کہا "میں ہیگوناٹ ہوں! اور کسی کی مجال نہیں جو میری طرف تیکھی نظر سے دیکھ سکے۔"

"کیا کہا؟ کیا کہا؟؟" بادشاہ نے گرج کر پوچھا۔

"اگر آج میں محل سے باہر ہوتا" ہنری نے کہا "تو ہیگوناٹ کے لئے زندگی اور کیتھولک کے لئے موت ہوتی۔ سن لیا جہاں پناہ!"

"اتنی جرأت" بادشاہ نے ایک پستول اٹھا کر کہا "اور پھر ہمارے سامنے!"

"تو گویا آج آپ مجھے بھی قتل کر دینگے؟ اور مارگرٹ کو کیا جواب دیجئے گا؟" ہنری نے مسکرا کر کہا۔

یہ سن کر بادشاہ نے دریچہ میں سے ہاتھ نکال کر پیہم دو تین فائر کئے۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی کسی نے کمرے کا پردہ ہلا کر پوچھا

"شاباش! مار دیا نہ موذی کو؟!"

ہنری نے جلدی سے آگے بڑھ کر پردہ اٹھا دیا اور اپنی ساس ملکہ کیتھرائن کو دیکھ کر مسکرایا اور کہا۔

"خوب! داماد کو قتل کرنے کی سازش میں ساس بھی شریک ہے اور واللہ یہ عقدہ بھی آج ہی کھلا کہ شہزادی مارگرٹ مجھ سے کیوں کشیدہ خاطر رہتی ہے؟ گویا یہ بھی آپ ہی کی کرامت ہے اور پھر مارگرٹ سے میری شادی بھی میری رعایا کی تباہی کی ایک تجویز تھی۔"

پیشتر اس کے کہ ملکہ کوئی جواب دے، دروازہ کھلا اور شہزادی مارگرٹ پریشان حال اندر آئی۔ اور ہنری کے پاس کھڑے ہو کر بھائی کو خطاب کر کے بولی۔

چارلس! شرم تو نہیں آتی ہوگی جو میرے شوہر اور اپنے بہنوئی کو یہاں قید کر رکھا ہے۔ اگر تم نے ہنری پر ہاتھ اٹھایا تو اس کے ساتھ ہی میں بھی جان دیدوں گی۔"

چارلس کو اپنی بہن مارگرٹ سے بیحد الفت تھی بہن کے مونہہ سے یہ الفاظ سنکر اس کی پیشانی عرق انفعال سے تر ہوگئی۔ اور مارگرٹ شوہر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بادشاہ کے کمرے سے باہر لے آئی۔

(نوٹ: "بہادر ہنری نے اس سفاکی، اپنی قوم کی تباہی اور فریب ہی کا جواب بہنوئی اور ساس کو کیسے دیا" اس کے متعلق جناب بسمل صاحب ضرور کچھ لکھیں)

مزاحیات

خیال ان کا رہتا ہے سر پر سوار
اسی سے وہ مجھ کو گدھا جانتے ہیں
سحر اٹھتے ہی آہ کرتے ہیں ہم
ترے غم کو ہم ناشتا جانتے ہیں
ہے معشوق میرا جو مجھ سے بڑا
اسے لوگ میری ددا جانتے ہیں

(سید حسین ناز)

نوادرِ یگانہ

(حضرت یگانہ لکھنوی کے حقیقت نگار قلم سے)

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں — یادش بخیر، بیٹھے تھے کل آشیانے میں
افسردہ خاطروں کی خزاں کیا، بہار کیا — کنجِ قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

پالا امید و بیم سے ناگاہ پڑ گیا! — دل کا بنا بنایا گھروندا بگڑ گیا!
شربت کا گھونٹ جان کے پیتا ہوں خونِ دل — غم کھاتے کھاتے مونہہ کا مزہ تک بگڑ گیا!
الٹی تھی مت، زمانۂ مردہ پرست کی — میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا!

بے اجل منزل فانوس پہ مرنے والے — جان کیا دیتے ہیں اک رسم ادا کرتے ہیں
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی — لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

فطرتِ مجبور کو اپنی نگاہوں میں ہی شک — وا رہے گا کب تلک توبہ کا در میرے لئے

گناہِ بے حقیقت کو قلم نے کتنا چمکایا!!
بھڑک اٹھتا ہوں میں جب دیکھتا ہوں فردِ عصیاں کو!

جذباتِ معصوم

امی پیاری! تیرا وہ نو شگفتہ پھول جسے تو نے مدتوں خونِ دل سے سینچا۔ اور جس کے لئے دن رات ایک کر دیا۔ آج بادِ خزاں کے ایک ہی جھونکے سے کھلا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بکھرا جاتا ہے۔ یہ درد تجھے جانکاہ تو ضرور محسوس ہوگا لیکن ہر جوان میت کی ماں اس روح فرسا رنج سے آشنا ہے۔ جب میری یاد تجھے از خود رفتہ بنا دے تو دل کی تسکین کے لئے اتنا یاد رکھنا کافی ہے کہ ——— "دنیا فانی ہے"

پیاری اماں! میری یاد میں آنسو نہ بہانا۔ اپنی جان کو ہلاک نہ کرنا۔ میری قبر پر پھول نہ چڑھانا۔ میں اپنی زندگی میں تیرے احسانات سے ذرہ بھر بھی سبکدوش نہ ہو سکا۔ میں نے بارہا ایسی خطائیں کیں جو تیرے لئے ناگوار تھیں میں ان خطاؤں پر نادم ہوں۔ اچھی اماں! مجھے یاد نہ کرنا۔ میری روح کو صدمہ ہوگا۔ مجھے اپنی خطاؤں کا احساس ہوگا۔ مجھے اپنے دامن کے بدنما دھبہ کی طرح دھو دینا۔ ایک پراگندہ خواب کی طرح بھلا دینا اور ایک غیر دلچسپ واقعہ کی طرح اپنے دل سے محو کر دینا۔

اے مادرِ وطن! اے میرے گہوارۂ طفولیت! اے میری شبابی مسرتوں کی حامل! اپنے آغوش پروردہ بچہ کا آخری سلام قبول کر۔ تیرا بچہ نزع کی حالت میں اپنے آنسوؤں سے، اپنے مجبورِ ضبط آنسوؤں سے تیری پاک مٹی کو گوندھ رہا ہے۔ وفورِ جذبات، فراوانیٔ احساس مجھے کچھ کہنے نہیں دیتے۔ تیرے پاک اور بیداغ دامن پر میں نے جوانی کی امنگوں سے اندھا ہو کر، بارہا ایسی خطائیں اور معصیتیں کیں جن پر آج نادم ہوں اور انتہا سے زیادہ پشیمان۔ اے پیاری سرزمینِ وطن! تیرے مقدس دامن پر میں ایک بدنما دھبہ اور ایک کریہہ داغ بنکر رہا، تیری کوئی خدمت نہ کر سکا پھر بھی اپنی آخری خوابگاہ کیلئے تیری ہی آغوشِ راحت کیطرف متوقع نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کاش تو ایک مشفق ماں کی طرح میری فراموش گاریوں کو بھول جائے اور اپنے پہلو میں تھوڑی سی جگہ دیدے کہ میں مدت سے بیٹھکانا ہوں۔

اے میری خوابیدہ قسمت! میں ہمیشہ تجھ پر شاکر رہا۔ میرے دستِ تدبیر نے کبھی تجھے بیدار کرنے کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ اب جبکہ اپنے نفس کی آخری آمد و رفت کو شمار کر رہا ہوں۔ اور کوئی لمحہ گزرتا ہو کہ میں تجھے ہمیشہ کیلئے الوداع کہنے والا ہوں، کیا تو یہ پیغام اس ہستی کو پہنچا دے گی جسے "محبت کا جواب محبت" کے اصول پر ناز ہے جو کبھی شرمندۂ معانی و عمل نہ ہو سکا۔ گویا یہ اصول عمل کیلئے نہیں محض وضع ہونے کیلئے تھا۔ . . . اگر وہ مجھے یاد رکھ سکی ہو. . . . اگر میری یاد گزشتہ دنوں کے صدقہ میں کسی فراموشگار دل میں ابھی تک محفوظ ہو تو اے میری خوابیدہ قسمت! آہستہ سے، بہت آہستہ سے کہ صرف "وہ" سن سکیں یہ پیغام پہنچا دے کہ اے قرارِ دل اور راحتِ روح! میرے بیقرار دل اور بے چین روح کو اپنے ناقابلِ فراموش التفات پیہم سے چین اور قرار بخشدے۔ کہ میں دوامی ہجر کے لئے پا بہ رکاب ہوں۔

اے معبودِ حقیقی! تو نے جس مقصد کیلئے مجھے دنیا میں بھیجا تھا۔ میں اس کی تکمیل و حصول میں قاصر رہا۔ میں نادم ہوں اپنی تقصیرات پر۔ اس دلچسپ رنگین دنیا کے دلفریب نقش و نگار نے فرائضِ عبودیت کو بھلا دیا۔ میں شرمسار ہوں اپنے سہو و تغافل پر۔ افسوس میں نے وہ نہیں کیا جو کرنا چاہئے تھا۔ اور آہ!! میں نے وہ کیا جو نہیں کرنا چاہئے تھا۔ فردِ عمل کیا ہے جرائم کی فہرست ہے! خیر مولا مجھے سوائے امیدِ رحمت کے اب دوسری کوئی چیز مطمئن نہیں کر سکتی۔ مگر "لا تقنطوا" کا وعدہ ابھی تک مجھے یاد ہے۔ میں بندہ تھا اپنے وعدہ کو پورا نہ کر سکا۔ تو خدا ہے اپنے وعدہ کو پورا کر دے!......"

(شوکت معصوم)

ایک خاتون کی شادی پر

از قلم جادو رقم
حضرت اختر شیرانی
مدیر "خیالستان"
لاہور

(جس کو دعویٰ تھا کہ وہ دنیا میں "صرف شاعرانہ زندگی" گزارنے آئی ہے)

اے کہ تھا انس تجھے عشق کے افسانوں سے
شعر کی گود میں پلتی تھی جوانی تیری
رشکِ فردوس تھا ہر حسن بھرا خواب ترا
نکہت شعر سے مہکی ہوئی رہتی تھی سدا
شرکتِ غیر سے بیگانہ تھے نغمے تیرے!

زندگانی تری آباد تھی رومانوں سے
تیرے شعروں سے ابلتی تھی جوانی تیری
ایک پامال کھلونا تھا یہ مہتاب ترا
نشہ فکر میں بہکی ہوئی رہتی تھی سدا
عصمتِ حور کا افسانہ تھے نغمے تیرے!

شعر کی خلوت رنگیں تھی پریخانہ ترا
غائب از چشم تھی جنت کی بہاروں کی طرح
صحبتِ غیر سے گھبراتی تھی تنہائی تری

مست خوابوں کے جزیرے میں تھا کاشانہ ترا
دستِ انساں سے تھی محفوظ ستاروں کی طرح
آئینہ سے بھی تو شرماتی تھی تنہائی تری

صبح کی طرح سے دوشیزہ تھی ہستی تیری
نغمہ و خواب کی فردوس میں تو رہتی تھی!
تیرے اشعار تھے جنت کی بہاروں کے ہجوم
دردِ شعری کے تاثر سے تو مغموم تھی تو

بوئے گل کی طرح پاکیزہ تھی ہستی تیری
یکسر الہام و ترنم تھا جو تو کہتی تھی!
تیرے افکار تھے یا چاند ستاروں کے ہجوم
اس زمیں کا مگر اک غنچۂ معصوم تھی تو!!

موجِ کوثر کا چھلکتا ہوا پیمانہ تھی تو!
غیر ہونٹوں کے تصور سے بھی بیگانہ تھی تو!

اب گوارا ہوئی کیوں غیر کی صحبت تجھ کو؟
اوجِ تقدیس کو پستی کی ادا بھا گئی کیوں؟
بلبلِ مست نوا، دشت میں کیوں رہنے لگی؟

کیوں پسند آ گئی ناجنس کی شرکت تجھ کو؟
تیری تنہائی کی جنت پہ خزاں چھا گئی کیوں؟
نغمہ تری جگہ مرثیہ کیوں کہنے لگی؟

کائنات ظہور



شر کتا معصوم

شعور و رومان کے وہ خواب کہاں ہیں تیرے؟
وہ نقوش گل و مہتاب کہاں ہیں تیرے؟

کونسی طرفہ ادا بھا گئی اس دنیا میں؟
خلد کو چھوڑ کے کیوں آ گئی اس دنیا میں؟

ہو گئی عام تو نورِ مہِ تاباں کی طرح!
آہ! کیوں جل نہ بجھی شمعِ شبستاں کی طرح!

اپنی دوشیزہ بہاروں کو نہ کھونا تھا کبھی!
وہ کلی تھی تو جسے پھول نہ ہونا تھا کبھی!

عفتیں مرتے جوانی کو مٹا جاتی ہیں!
پھول کمھلاتے ہیں، کلیاں کہیں کمھلاتی ہیں؟

کس کو معلوم تھا تو اس قدر ارزاں ہو گی!
زینتِ محفل و پامالِ شبستاں ہو گی!

جذبِ عفت کا میسر تھا جو عرفاں تجھ کو
کیوں نہ مرغوب ہوا شیوۂ "جاناں"[1] تجھ کو

تیرگی حرص کی حوروں کو بھی بہکا ہی گئی
تیرے لبستر پہ بھی آخر کو شکن آ ہی گئی

ہوس آلودہ ہوئی پاک جوانی تیری
غیر کی رات ہے اب اور کہانی تیری

اب نہیں تجھ میں فرشتوں کی سی عفت باقی
حور تھی تجھ میں، گئی، رہ گئی عورت باقی!

ہاں وہ عورت جسے بچوں کا فسانہ کہیئے!
بر ربطِ نفس کا اک فحش ترانہ کہیئے!

جس میں ہے زہرِ عفونت کا وہ پیمانہ کہیں!
اک گناہوں کا بھبکتا ہوا میخانہ کہیں!

سوگوار اپنی جواں موت پہ ہونے دے مجھے!!!
مسکرا تو! مگر اس حال پہ رونے دے مجھے!!

---

[1] "جاناں"، میر عبدالرحیم خان خاناں کی صاحبزادی تھیں جو نہایت حسین، نہایت عفیفہ اور پاکدامن تھیں ان کے حسن و جمال کا شہرہ سن کر شہنشاہ جہانگیر نے شادی کا پیغام دیا۔ لیکن اس نادرۂ روزگار عصمت مآب خاتون کی عفت پرستی کا یہ عالم تھا کہ اپنے دانت توڑ کر اور گیسو تراش کر شہنشاہ کی خدمت میں بھجوا دیئے۔ مطلب یہ تھا کہ جس حسن و جمال ظاہری کی شہرت حضور شاہ تک پہنچی ہے اور جس کی بنا پر شادی کا پیغام دیا گیا ہے وہ حاضر ہے۔ شادی مجھے منظور نہیں۔ جہانگیر اس قدر متاسف اور متاثر ہوا کہ معلوم ہوتا تھا پیغام بھیج کر پچھتا رہا ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے بادشاہ اسے پہلے سے بھی زیادہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھنے لگا۔۔۔ اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

کائنات:- شاعر اس نظریہ کا قائل ہے کہ عصمت و عفت کی حفاظت دوشیزگی و تجرد ہی میں ہو سکتی ہے۔ یہی نظریہ "پشیمان شباب" اور "عصمت شباب" دو معرکۃ الآرا افسانوں میں مصنف نے پیش کیا ہے۔

شکار کرنے کو آئے شکار ہو چلے

کپتان جان، علی اور میں، دن بھر کجلی بن میں مارے مارے پھرے لیکن شیر تو شیر کسی شغال تک کا نشان نہ پایا حالانکہ اس جگہ درندے بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ لفٹنٹ گنبز کی پارٹی ہمیں خوب آڑے ہاتھوں لے گی کیونکہ سوائے چند خراشوں کے جو خاردار جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے نصیب ہوئی تھیں ہم اور کچھ حاصل نہ کر سکے تھے۔

کوئی شام کے سات بجے ہوں گے کہ ایک میدان سا نظر آیا جسکے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی برساتی ندی بہتی تھی اس کی آواز نے ہمارے پژمردہ دلوں کے ساتھ تم باذنی کا کام کیا اور ہم بے تحاشا ادھر دوڑ پڑے ندی کے اس پار ایک کچا راستہ تھا جس کے دونوں جانب درختوں کی قطاریں عجب بہار دکھا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مقام پر پھولوں کی افراط ہے کیونکہ بھینی بھینی خوشبو نے دماغ کو طبلۂ عطار بنا رکھا تھا۔ ساری فضا مہک رہی تھی۔ جان صاحب پھولوں کے رسیا ہیں انہوں نے علی سے کہا "تم جب تک روٹی پکاؤ۔ میں دو قدم جا کر اس قدرتی منظر سے لطف اندوز ہوتا ہوں"

علی۔ (گھبرا کر) "صاحب خدا کے لئے ادھر نہ جانا۔ ۔ ۔"

جان۔ "خیر تو ہے تم نے تو مجھے خوفزدہ کر دیا۔ ۔ ۔"

علی۔ "ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ یہاں بھوت پریت اور بدروحیں رہتی ہیں"

جان۔ (قہقہہ لگا کر) "کنکھجوروں اور بچھوؤں کی قسم یہ سب بیہودہ باتیں ہیں کیا تم سمجھتے ہو کہ میں بدروحوں سے ڈر جاؤں گا"

علی۔ "میں اور کچھ نہیں کہتا ہاں یہ ضرور ہے کہ وہاں جانے میں جان کا خطرہ ہے۔ ۔ ۔ اُف۔ ۔ ۔ ۔ وہ دیکھئے۔ ۔ ۔ سامنے ایک خبیث روح لگڑ بگڑ (چرخ) کی صورت بن کر مجھے۔ ۔ ۔ ۔ ڈرا رہی ہے"

جان۔ "علی تم یہاں ٹھیرو۔ میں اس روح سے ملاقات کرنے جاتا ہوں۔ واپسی پر بھوک خوب لگی ہو گی"

یہ کہکر جان اس راستہ کی طرف چل پڑا۔ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس وقت بہت سے گھنے جنگل تھے۔ لیکن تہذیب و تمدن کی رو نے انہیں حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور ان کی جگہ مزروعہ زمینوں اور فلک بوس عمارتوں نے لے لی۔

اس راستہ پر قدم رکھتے ہی جان کو ایسا معلوم ہوا کہ شیر کی ہلکی ہلکی گرج، ہاتھی کی چنگھاڑ۔ سانپ کی پھنکار۔ مچھروں کی بھنبھناہٹ اس کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ سورج بہت دیر ہوئی غروب ہو چکا تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور قدرت کی وہ قہار افواج جو دن بھر سر چھپائے خاموش پڑی رہیں اس وقت چیختی چلاتی اپنے اپنے بلوں اور بھٹوں سے نکل آئی تھیں۔ جان خوفزدہ تو ہوا۔ مگر پھولوں کی دھن میں قدم بڑھائے چلا گیا۔ ۔ ۔ ۔ دفعتہً درختوں میں ایک انسانی صورت نظر آئی۔ یہ ایک نہایت حسین چینی لڑکی کا چہرہ تھا جس کے لانبے لانبے سیاہ بال عارض گلفام پر پریشاں تھے اس نے مسکرا کر جان کی طرف دیکھا اور دائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی سے جس میں ایک ہیرے کی انگشتری چمک رہی تھی، اپنی طرف بلایا۔

کپتان صاحب بہادر مجرد تھے اور صنف نازک کے بڑے مداح ان کا خیال تھا کہ عورت مصور فطرت کا بہترین شاہکار ہے نیز یہ کہ عورت کے بغیر اندھیرا تھا وہ مسکرائی تو اس کے دانتوں کی چمک سے یہ دنیا جگمگا اٹھی۔ ایسے رنگین طبع نوجوان سے سوائے اس کے اور کیا توقع ہو سکتی تھی کہ ایک زرخرید غلام کی طرح اس حسینہ کے احکام کی تعمیل کرے۔ چنانچہ وہ کھانا اور شکار سب کچھ بھول گیا اور اس لڑکی کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسے احاطہ تک پہنچ گیا جس کے چاروں طرف لکڑی کی باڑھ تھی اور عین وسط میں ایک چوبی دروازہ تھا۔ لڑکی نے دروازہ کھولا اور جان پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتی ہوئی اندر داخل ہوئی یہ بھی جلدی سے اندر پہنچا مگر سونے کی چڑیا غائب تھی۔ اس وقت وہ احاطہ میں تھا جہاں ہر طرف تباہی اور بربادی کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ اور ایک ہیبتناک

ویرانی مسلط تھی جسے دیکھکر جان پریشان سا ہونے لگا دس گز کے فاصلہ پر ایک بنگلہ نما مکان تھا جسکے دروازوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ مکڑیوں، ابابیلوں اور چمگادڑوں کے سوا انسانی حیات کے آثار مفقود تھے۔ ایک نامعلوم جذبہ کے ماتحت وہ اس ویران و شکستہ مکان کے اندر چلا گیا۔ سب سے پہلے ایک بڑا ہال کمرہ تھا جسکے بے شمار دروازے چاروں طرف کھلتے تھے فرش۔ چھت۔ دیواریں ریت سے پٹی پڑی تھیں۔ قرائن سے پایا جاتا تھا کہ سالہا سال سے کسی انسان نے یہاں قدم نہیں رکھا . . . . . تو کیا وہ چینی لڑکی یہاں نہیں آئی؟ . . . اگر نہیں آئی تو کہاں گئی؟ . . . کیا وہ بقول علی کوئی روح تھی۔ کیا اب میں یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکتا؟ . . . یہ حقیقت ہے یا میرا واہمہ مجھ فریب دے رہا ہے . . . . اسی قسم کے خیالات جان کے دل میں چکر لگا رہے تھے . . . . . ."

اب وہ ایک دوسرے دروازہ میں سے گزرا جو اسے ایک زینہ تک لے گیا۔ اس کے نیچے ایک چھوٹی سی مصنوعی جھیل تھی۔ جس کے کناروں پر سرکنڈے کھڑے تھے۔ جان کو ان سرکنڈوں میں ایک لمبی سیاہ تھوتھنی دکھائی دی اور پھر اُلّو کی سی منحوس آواز کانوں کے پردے پھاڑتی ہوئی چاند تک جا پہنچی۔ یکایک پانی میں حرکت ہوئی۔ لہریں اٹھنے لگیں۔ ایک انسانی ہاتھ اوپر نکلا اور زور زور سے ہلا جسکے ہلنے سے پانی میں آواز پیدا ہوئی جان نے اس ہاتھ کو غور سے دیکھا۔ یہ نازک اور سفید تھا جسکی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی . . . . . .

اف . . . خداوندا! یہ تو اسی چینی لڑکی کا ہاتھ ہے۔ جسکے اشارے اسے یہاں تک کھینچ لائے تھے۔ عین اسی وقت ایک خوفناک شیطانی قہقہہ کی آواز بازگشت فضا میں پھیل گئی . . . . . وہ گھبرا کر مڑا، مگر سوائے درختوں کی سائیں سائیں کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی تھرتھراتا، کانپتا وہ زینہ پر چڑھتا چلا گیا۔ ابھی آدھی سیڑھیوں پر تھا کہ دوسری طرف سے کسی کے نیچے اترنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ فوراً رک گیا۔ آہٹ کی رفتار تیز ہیم اور ایک سے زیادہ آدمیوں کی معلوم ہونے لگی۔ جان فہمیدہ اور ذہین آدمی تھا وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ کوئی پھرتیلی اور نازک عورت بھاگ رہی ہے اور دو تین مرد اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ پھر اس عورت کے قدم رک گئے اور ان اشخاص نے جیسے اسے آلیا . . . . یکایک ایک چیخ . . . ایک دردناک چیخ جس نے جان کو دو سکنڈ کے لئے مبہوت کر دیا۔ زینہ کے اوپر والے حصہ سے بلند ہوئی۔ خوف کی وجہ سے وہ بالکل ساکت ہو کر رہ گیا گویا اس پر بجلی گر پڑی . . . . . ذرا سنبھلتے ہی جان وہاں سے بھاگا بس ایک ہی جست میں باڑ کو پھلانگ گیا اور جب تک ہمارے پاس نہ آپہنچا، دم نہ لیا۔

کچھ روز بعد جب اس نے یہ ذکر سنایا تو ایک ہسپانوی سوداگر مسٹر وانڈر گچٹ نے کہا کہ میں نے اس بنگلہ کے متعلق سنا ہے وہاں ایک فرانسیسی سوداگر رہتا تھا جسکی ایک چینی عورت سے شادی ہوئی تھی شادی سے کچھ عرصہ بعد وہ قتل ہو گیا اور اس کے رشتہ داروں نے اسکی بیوی پر شک کر کے اسی بنگلہ میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور لاش جھیل میں پھینک دی۔ اس روز سے یہ بن اور بنگلہ آسیب زدہ سمجھے جاتے ہیں۔

(پیرزادہ احتشام الدین احمد عبرت - بی۔ اے)

مرزا جی

اگر آپ سنجیدہ ظرافت کو پسند کرتے ہیں اور مزاحیہ افسانے اور مذاقیہ مضامین پڑھنے کے شائق ہیں تو مرزا جی پڑھیئے اردو زبان میں اس شان کی ایسی دلچسپ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد اگر طبیعت پریشان ہو یا رات کی تنہائی سے دل گھبراتا ہو تو مرزا جی پڑھیئے۔ مسلسل۔ سلیس۔ دلنشین اور شوخ عبارت۔ بہت گرماگرم اور چٹپٹے فقرے آپ کو اگر ہنسا نہ دیں تو پھر آپ بھی مرزا جی سے کم نہیں۔ حجم ۱۲۳ صفحے۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶۔ اعلی درجہ کا ولائتی کاغذ۔ سہ رنگہ سرورق باتصویر۔ قیمت کچھ بھی نہیں یعنے صرف دو روپے چار آنہ۔ پتہ:- نسیم بکڈپو۔ بازار بارودخانہ لاہور

صدرِ بلدیہ

(جناب ماسٹر ممتاز حسین صاحب بٹس کھنڈل سیالکوٹ)

وحیدالدین اور اس کا بیٹا اختر مسعود اپنے آراستہ پیراستہ کمرے میں بیٹھے ترکی سگار پھونک رہے تھے۔ ان کا مکان استانبول کے مغربی حصہ میں واقع تھا اور سلطانی بازار کی گہماگہمی مکان کی خوبصورت کھڑکیوں سے بخوبی نظر آتی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم ترک اندر داخل ہوا۔

"حضرات! میرا نام شوکت پاشا ہے ـــــ شوکت پاشا صدر بلدیہ ـــــ آپ نے سنا ہوگا۔ میں آپ کے ہاں پناہ کی جستجو میں آیا ہوں۔ ایک بدمعاش نے میری زندگی تلخ کردی ہے۔ برب کعبہ میں اس سے اکتا چکا ہوں۔

"تشریف رکھیئے" وحیدالدین نے کہا۔

نووارد نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سیاہ بانات کی ٹوپی اتار کر میز پر رکھدی۔ زرد رنگ کی قیمتی چھڑی برابر والی کرسی کے سہارے کھڑی کردی۔ دستانے اتار دیئے۔ اور اپنی آسمانی رنگ کی پتلون سے گرد صاف کرنے لگا۔

"فرمایئے؟" وحیدالدین نے پوچھا

"ذرا دروازہ سے جھانک کر دیکھئے" شوکت پاشا نے اختر مسعود سے کہا۔ "وہاں کون ہے؟

اختر مسعود۔ "ایک معزز آدمی چہل قدمی میں مصروف ہے"

شوکت پاشا۔ "اسے یہاں لے آیئے۔ میں پہلے پہل اس کو دعوت دے رہا ہوں۔ مگر وہ ضرور آئے گا۔

وحیدالدین۔ (دروازہ پر پہنچکر) شوکت پاشا آپکو اندر بلاتے ہیں

نوجوان ترک مسکرایا اور وحیدالدین کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔ اس کی اور شوکت پاشا کی پوشاک ایک تھی۔ وہی آسمانی رنگ کی پتلون، زرد چھڑی۔ سیاہ بانات کی ٹوپی۔ مگر اس کا چہرہ حسین و پرشباب تھا اور ایک سفید رنگ کا پھول اس کے کوٹ کے کالر میں آویزاں تھا۔ نووارد نے شوکت پاشا کو ادب سے سلام کیا اور ایک کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ صدر بلدیہ اسے دیکھکر آگ بگولہ ہوگیا۔ اور کہنے لگا "میں اسے ڈیڑھ ہاتھ اونچی رسّی میں لٹکوا دونگا۔ میں اسے بیس برس کے لیئے جیلخانہ میں بند کرادونگا۔ (وحیدالدین سے) آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے!

وحیدالدین۔ "اس نے آپ کے لباس کی نقل کی ہے"

صدر بلدیہ۔ "صرف یہی نہیں۔ وہ ہر گھڑی میرا تعاقب کرتا ہے میرے مکان کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔ بلدیہ کے جلسوں میں مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتا ہے۔ کوئی تقریب ہو سایہ کی طرح میرے ساتھ ہوتا ہے۔ رب کعبہ کی قسم! ـــــ"

وحیدالدین۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ یہ ـــ یہ ـــ آفندی"

نووارد۔ "میرا نام محمود ہے"

وحیدالدین۔ "محمود آفندی آپ کو خواہ مخواہ دق کر رہے ہیں؟"

صدر بلدیہ (گرج کر) یہ میرے لیئے ایک لعنت ہے۔ یہ میرا تعاقب کرتا ہے۔ میری نقل اتارتا ہے۔ اپنے آپ کو میرا دوست ظاہر کرتا ہے۔ پبلک جلسوں میں میرا مذاق اڑاتا ہے۔ اور میری شہرت و ناموری کو ذبح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب میں اس کی اس کا سبب دریافت کرتا ہوں تو ایک لفظ کہے بغیر مسکرا دیتا ہے۔

وحیدالدین۔ (محمود سے) آپ شوکت پاشا کی تقریر سن رہے ہیں کیا آپ درست فرماتے ہیں؟"

محمود۔ (مسکرا کر) مجھے صدر بلدیہ کے قرب سے مسرت حاصل ہوتی ہے"

وحیدالدین۔ "کیوں؟"

محمود۔ "میں آپکا مداح ہوں۔ چونکہ بیکار رہوں اس لئے ہر جگہ آپ کے پیچھے لگا رہتا ہوں۔ مجھے آپکی جادو اثر تقریر بہت پسند ہے جب آپ پبلک جلسوں میں بولتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور میں اسے دامن ذوق و گوش میں لینے کے لئے ہر جگہ پہنچ جاتا ہوں"

وحیدالدین سوچنے لگا۔

وحیدالدین: "محمود آفندی! بہتر ہوتا کہ آپ صدر بلدیہ کے بجائے کسی اور کو نشانۂ شوق بناتے"؟

محمود - ناممکن ہے - میں کسی اور کو پسند نہیں کرتا - صبح جب میں بیدار ہوتا ہوں تو میری رگ رگ بیقرار ہوتی ہے اور جب میں اس کو دیکھ لیتا ہوں تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے - آپ یقین کیجئے کہ صدر بلدیہ ایک عجیب اور دلچسپ شخصیت ہے -

اختر مسعود - مگر وہ آپ سے بیزار ہیں -

صدر بلدیہ نے سرخ سرخ آنکھیں نکالکر کہا کہ یہ دھوکہ ہے - یہ فریب ہے - میں ایک وکیل کے آستانہ پر بھی عرض نیاز کر چکا ہوں مگر قانون اس کو مجرم نہیں سمجھتا - میں پولیس میں رپٹ دے چکا ہوں مگر وہ مجبور ہے - آخر یہ کیا چاہتا ہے؟ دولت؟! جو یہ مانگے میں دینے کو تیار ہوں -

محمود نے تصور دولت کی مٹھاس کو ہونٹوں سے چاٹتے ہوئے عجیب انداز میں چہکتے سے کہا دولت، دولت بھی عجیب شے ہے آہ! اگر میری حالت اب سے کچھ زیادہ بہتر ہوتی تو میں آپ کے قصر عالیشان کے قریب کوئی نفیس مکان کرایہ پر لیتا لیکن..."

شوکت پاشا - (مٹھیاں بند کرکے) شیطان بشکل انسان بتاؤ تم کتنی رقم لیکر دفع ہو سکتے ہو - یہ جال ہے - میں جانتا ہوں - مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟

محمود - "میں کوئی جیب کترا یا اٹھائی گیرا نہیں ہوں"

شوکت پاشا - آخر تم کیا ہو؟ یہ لوٹنے کا نیا طریق ہے آفندی!

صدر بلدیہ نے وحیدالدین کو مخاطب کرکے کہا - آپ سن رہے ہیں میں تین ماہ سے اس کی وجہ سے چڑ کر بہ چڑکہ کھا رہا ہوں انتخاب کے موقع پر یہ میرے ووٹروں اور دوستوں سے ایسے سوالات کر رہا تھا جو بظاہر بے ضرر تھے مگر دراصل لغلی گھونسہ سے کم نہ تھے - کمبخت نے حافظہ بھی تو شیطان کا سا پایا ہے - کچھ بھولتا ہی نہیں" - گڑے مردے اکھاڑتا ہے - میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں - مجھ سے غلطی کا ہر وقت امکان ہے - یہ ایسے مواقع کی تاک میں لگا رہتا ہے - اور چھوٹی سے چھوٹی لغزش اور فروگذاشت کو بھی اس دلکش انداز میں میرے دوستوں سے بیان کرتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے - آہ میری نیک شہرت کا پکا دشمن ہے - رب کعبہ کی قسم جی میں تو یہ آتا ہے کہ اس شیطان رجیم کو کچا چبا جاؤں -

وحیدالدین - آپ نے کسی اچھے وکیل سے بھی ملاقات کی ہے؟

صدر بلدیہ - "میں دو قابل وکلا سے مل چکا ہوں - مگر قانون اس روسیاہ کے ہتھکنڈوں سے عاجز ہے - میں جانتا ہوں کہ اس نے اپنی جیب گرم کرنے کے لئے یہ بہروپ بھرا ہے - مگر یہ اسے تسلیم نہیں کرتا - آپ اس سے گفتگو کریں - میں اس سے خلاصی پانے کے لئے ایک ہزار پونڈ نقد دے سکتا ہوں - آپ میرا پتہ جانتے ہیں اس سے فیصلہ کرکے مجھے مطلع فرمائیں -

شوکت پاشا نے ٹوپی اوڑھی - چھڑی اٹھائی اور جانے لگا - محمود آفندی نے بھی اس کی پوری پوری نقل اتارتے ہوئے ٹوپی اوڑھ کر چھڑی بغل میں دبالی - صدر بلدیہ نے جھک کر وحیدالدین سے ہاتھ ملایا - محمود آفندی نے بھی اتنا ہی جھک کر منہ کو خاص ڈھنگ سے مسکرانے پر مجبور کرتے ہوئے اپنے "ممدوح" کی پیروی کی۔ "دیکھئے دیکھئے اس بدذات کو دیکھئے" شوکت پاشا نے دانت پیسکر کہا "یہ بندر مجھے دیوانہ بنا دے گا - اس نے میرے درزی سے بھی آشنائی پیدا کرلی ہے"

وحیدالدین نے محمود آفندی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "آپ دو منٹ کے لئے تشریف رکھئے میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں -

محمود آفندی نے گھڑی دیکھکر کہا "ہمارا کام تین بجے شروع ہوگا - میں پانچ منٹ کے لئے ٹھیر سکتا ہوں" - رفیق محترم! اس نے مڑکر شوکت پاشا سے کہا، میں آپ کی تائید کے لئے وہاں حاضر ہونگا

صدر بلدیہ غصہ سے تھرا اٹھا "اگر تم نے بازار میں قدم رکھا تو تمہارا خون پی جاؤنگا - شوکت پاشا نے زور سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا -

وحیدالدین - آفندی! میں معروف آدمی ہوں کہئے کیا ایک ہزار پونڈ کی رقم کافی نہیں ہے؟"

محمود - ہرگز نہیں - اس زمانہ میں ایک ہزار پونڈ کیا حقیقت،

صدر بلدیہ نے ایک ہزار پونڈ لیکر میری ہتک کی ہے۔ آپ میرے عزیز دوست سے کہہ دیں کہ میں ایک حساس آدمی ہوں۔ ابھی دو ہفتہ ہوئے وہ ایک سو پیش کرتا تھا۔ پھر معاملہ پانچ سو تک پہنچا مجھے ابھی شوکت پاشا کی ذات بابرکات سے الگ ہونا منظور نہیں۔

وحید الدین۔ "آپ منہ مانگی رقم لے سکتے ہیں"۔

محمود آفندی وقت دیکھکر یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ کہ "مجھے اپنا فرض بجالانا چاہیئے۔ میں ایک شریف آدمی کی دوستی کا بیڑا اٹھا چکا ہوں۔ آج صدر بلدیہ ساحل سقوطری کے قریب ایک بازار کا افتتاح کرینگے۔ اگر میں وہاں موجود نہ ہوا تو انہیں نقصان ہوگا۔ معاف فرمائیگا۔

اختر مسعود۔ پھر کب ملاقات ہوگی۔ ہم ہر وقت آپ سے ملاقات اور گفتگو کرنے کے لئے تیار ہیں۔

محمود آفندی نے ٹوپی کو جھاڑتے ہوئے کہا کہ میں آپ کا مشکور ہوں مجھے یقین ہے کہ میرا محترم دوست دوبارہ ایک ہزار پونڈ کے ذکر سے میری ہتک نہیں کرے گا۔ خدا حافظ۔ تسلیم۔

یہ کہکر محمود دروازہ کھولکر باہر نکل گیا اور بھیڑ میں غائب ہوگیا۔

"حیرت انگیز آدمی ہے" اختر مسعود نے وحید الدین سے کہا۔ قانون اس کی چالاکیوں کے مقابلہ میں بے بس ہے۔ اچھا میں بھی آج بازار کی افتتاحیہ رسم دیکھونگا۔

(۲)

اختر مسعود پنڈال میں داخل ہوا تو غازی عصمت پاشا اپنی تقریر سے حاضرین کو مسحور کر رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ اور گھنگرج آواز دلوں کو موہ رہی تھی۔

"غیور ہموطنو! شوکت پاشا اس مفید تحریک کے جنم داتا ہیں۔ آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ استانبول صدیوں تک آپ کے نام پر فخر کرے گا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ پلیٹ فارم پر تشریف لاکر بازار کی افتتاحیہ کارروائی سرانجام دیں۔

غازی عصمت پاشا تالیوں کی گونج میں کرسی پر بیٹھ گئے اور شوکت پاشا صدر بلدیہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ پہلے تو اس نے گھبراکر ادھر ادھر دیکھا اور پھر جلدی جلدی تقریر شروع کردی اس نے غازی عصمت پاشا کی توصیف کی۔ اور سرمایہ داروں کے فرائض پر طویل خطبہ ارشاد فرمایا۔ پھر اس نے خزانچی کو بلایا تاکہ چندہ دینے والوں کی فہرست پڑھکر سنائے۔ اس حاکمانہ ارشاد کی تعمیل میں ایک زرد رو آدمی چشمہ لگائے ہوئے آگے بڑھا اور کوئی پانسو نام پڑھ کر سنائے۔

جب وہ بیٹھ گیا تو لوگوں میں ہلچل سی بپا ہوگئی مگر صدر بلدیہ کی پرشکوہ آواز نے ان کو روک دیا۔ اختر مسعود پنڈال سے رخصت ہو رہا تھا۔ اس نے مڑکر دیکھا تو ایک خوش پوش نوجوان عصمت پاشا کی کرسی کے قریب کھڑا تھا۔ اور صدر بلدیہ اسے زہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

"حضرات"! نوجوان ترک مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں شوکت پاشا کے انمٹ احسانوں پر ہدیہ تشکر پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں"۔ اس نے صدر بلدیہ کو مودبانہ سلام کیا "میں چاہتا ہوں کہ میرا نام بھی فہرست میں درج کیا جائے میں ایک سو پونڈ کی حقیر رقم پیش کرتا ہوں"۔ لوگوں نے تالیوں کی آواز سے پنڈال کو سر پر اٹھا لیا۔ "میں اپنے عزیز دوست کی قابل قدر زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جبکہ صدر بلدیہ نے آبادی سے دور لب ساحل اپنا قصر عالی شان تعمیر کرایا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سرکاری دفاتر اور صدر بلدیہ کی رہائش گاہ کو ایک اعلیٰ درجہ کی سڑک سے ملانا از حد ضروری تھا راستہ میں ملاحوں کی صدہا جھونپڑیاں تھیں مگر میرے محترم دوست کے حکم سے ان کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیا گیا۔ وہ لوگ آج تک اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت چند حادثات بھی ہوئے تھے۔ ایک بڑھیا کو جب اس کے آبائی مکان سے دھکے دیکر نکالا گیا تو وہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہوسکی۔ اور ایک مریضہ نے لب ساحل سرد ہوا اور اوس کی وجہ سے جان دیدی۔ مگر ان حوادث کو اب بھول جانا چاہیئے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ میرے عزیز دوست کو بازار کے معاملہ میں غیر معمولی کامیابی نصیب ہو"۔

نوجوان تقریر ختم کرکے پلیٹ فارم سے اتر گیا۔ حاضرین میں بے چینی کی رو دوڑ گئی۔ بعض لوگ سوالات کے لئے اٹھ کھڑے ہو

مگر عصمت پاشا نے جلدی سے اجلاس برخاست کر دیا اور خشمگیں لہجہ میں صورت حالات بیان کرنے کا حکم دیا۔

(۳)

ایک ہفتہ کے بعد شوکت پاشا نے دوبارہ وحیدالدین سے ملاقات کی اور کہا میرا خیال ہے کہ آپ اس بدمعاش کو قابو میں نہیں لاسکے ؟

وحیدالدین۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ مگر پاشا صاحب میں آپ سے عرض کر دوں کہ آپ بُرے پھنسے ہیں۔

صدر بلدیہ۔ (دانت پیس کر) اس پر لعنت ہو میں اسے خوب جانتا ہوں۔

وحیدالدین۔ اگر آپ خلاصی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا کیسہ گرم کیجئے۔

صدر بلدیہ۔ میں ایک ہزار پونڈ دینے کو تیار ہوں۔

وحیدالدین۔ یہ رقم اس سے بہت کم ہے جو وہ مانگتا ہے اگر آپ اس کی پروا نہ کریں تو ممکن ہے کہ اکتا کر خود بخود چلا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آپکی گزشتہ غلطیوں کو نمایاں کرتا رہتا ہے مگر اس میں آپ کا کیا ہرج ہے بکتا ہے بکنے دو۔"

"آہ شاید آپ میری مجبوریوں سے نا واقف ہیں" شوکت پاشا نے مستقبل کے ہولناک تصور سے لرزتے ہوئے کہا "اس شہر میں میرے صدہا رقیب ہیں۔ جو ہر وقت میری کمزوریوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ اور میری ہر معمولی غلطی کو کاہ سے کوہ بنانے کے لئے کمربستہ ہیں۔ اختر مسعود نے آپ سے بازار کی افتتاحیہ تقریب کا ذکر کیا ہوگا۔ اس کم بخت نے بھرے جلسہ میں میرے دامن شہرت پر سیاہی کے چھینٹے دیئے۔ اور مدت کے گڑے ہوئے مردوں کو منظر عام پر لا کھڑا کیا۔ عصمت پاشا نے اس کی تقریر سے بہت بُرا اثر قبول کیا۔ اور میں بمشکل تمام اس بات کو ٹال سکا۔ اس کی بے حیائی اور ڈھٹائی ملاحظہ فرمایئے کہ جلسہ عام میں کھڑے ہو کر سو پونڈ چندہ دینے کا اعلان کیا۔ مگر اجلاس کے خاتمہ پر جب اسے تلاش کیا گیا تو وہ غائب تھا۔

وحیدالدین۔ آپ اس سے خلاصی پانے کے لئے کتنی رقم ادا کر سکتے ہیں؟

صدر بلدیہ۔ میں تو اسے جیلخانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ مگر چونکہ یہ ہو نہیں سکتا اس لئے ایک معقول رقم دیکر اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے بھی تیار ہوں۔

وحیدالدین:۔ اب تک اس کا طرز عمل قانون کا پابند ہے اس لئے موہوم امیدوں کو دل سے نکال کر اسے کچھ دے کر ٹال دیجئے۔

صدر بلدیہ۔ اس بدذات کو میں راستہ سے ہٹانے کے لئے پانچ ہزار پونڈ تک دے سکتا ہوں۔

عین اسی وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور محمود آفندی اندر داخل ہوا۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟" نوارد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

صدر بلدیہ۔ آپ نے جلسہ میں اس سو پونڈ چندہ دینے کا اعلان کیا تھا؟"

محمود آفندی۔ (بے پروائی سے) مجھے یاد نہیں۔ آپ وہ رقم ادا کر دیجئے مشکور ہونگا۔"

صدر بلدیہ۔ "آپ یہاں اور معاملہ طے کرنے آئے ہیں!"

محمود آفندی:۔ جناب میں آپ کا دوست ہوں اور ہمیں آپس میں لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں، وحیدالدین صاحب فیصلہ کرا دینگے۔

صدر بلدیہ نے اپنی ٹوپی اور چھڑی اٹھائی اور وحیدالدین سے یہ کہکر کہ میں آپ سے دوبارہ ملاقات کرونگا۔ باہر چلا گیا۔ محمود آفندی اٹھکر شوکت پاشا والی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا اور مسکرانے لگا۔

وحیدالدین۔ سنئے! آپ ابھی تک قانون کی گرفت سے آزاد ہیں مگر بہت ممکن ہے کہ چند روز بعد آپ شاہی مہمان خانہ میں پڑے ہوں۔ موجودہ وقت کو غنیمت جانئے اور معاملات کو بخیر خوبی طے کر لیجئے۔

محمود۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ معاف کیجئے گا۔ میں تصورات کے گورکھ دھندے میں کھو گیا تھا۔"

وحیدالدین۔ کہئے آپ کیا چاہتے ہیں؟

محمود کچھ دیر تک کسی گہرے خیال میں چھت کو تکتا رہا۔ پھر گویا ہوا

"لڑائی کے دنوں میں ہماری پلٹن سالونیکا میں مقیم تھی۔ ایک دن دور سے سمندر کی نیلگوں سطح پر کچھ دھبے سے دکھائی دینے معلوم ہوا کہ اتحادیوں کا لشکر جرار آ رہا ہے۔ ہماری توپوں کے دہانے کھل گئے دشمن کا منہ موڑ دیا۔ مگر وہ مرتے ڈوبتے ساحل تک آ پہنچے۔ ہم دشمن سے گتھم گتھا ہو گئے۔ میں شمشیر بکف دشمنوں کے انبوہ میں گھس گیا۔ اور فن سپہ گری کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ میرے جسم پر ساٹھ سے زیادہ زخم آئے مگر قدم آگے ہی بڑھتا گیا۔ دشمن اپنے ساز و سامان اور کثرت تعداد کے باوجود مغلوب ہوا۔ رات میں نے فوجی کیمپ کے بجائے ہسپتال میں گزاری۔ خون زیادہ بہہ جانے سے میں بیحد کمزور ہو گیا تھا اس لئے کئی ماہ زیر علاج رہا۔ ایک دن میں ٹہلتا ٹہلتا ذرا دور نکل گیا۔ اور ایک تاکستان میں پہنچ گیا جس کا رقبہ ایک ایکڑ ہوگا۔ قریب ہی زنگتروں کا باغ اور ایک سبزہ زار تھا ان کا مالک انہیں بیچنا چاہتا تھا۔ میرے دل میں اس جائداد کے خریدنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ مگر آہ! میں ایک قلاش سپاہی تھا۔"

وحیدالدین۔ اس کی کیا قیمت تھی؟

محمود۔ "آٹھ ہزار پونڈ — شوکت پاشا کی ماہوار آمدنی سے بھی کچھ زیادہ — وہ تاکستان ابھی بکا نہیں۔ اور میں ابھی تک اسے خریدنے کے لئے بے تاب ہوں۔

وحیدالدین۔ اگر صدر بلدیہ وہ تاکستان تمہیں خرید دیں تو ان کا پیچھا چھوڑ دو گے؟"

محمود۔ میں زندگی کے باقی دن اسی کنج عزلت میں گزار دونگا۔ آپ کا آج بہت وقت ضائع ہوا (کرسی سے اٹھکر) دوبارہ صدر بلدیہ جب آپ سے ملاقات کریں گے تو میں دروازہ پر منتظر ہونگا۔ . . . ہاں یاد آیا آفندی! آپ نے کبھی سعید ہوٹل میں کھانا کھایا ہے؟ آج شام وہاں ضرور تشریف لایئے۔ اچھا تسلیم۔

(۴)

اختر مسعود اور وحیدالدین جب ہوٹل میں داخل ہوئے تو شام کا اندھیرا چھا چکا تھا اور بیشمار ملکی و غیر ملکی شرفاء داد عشرت دے رہے تھے۔ قریب ہی دو میز خالی پڑے تھے۔ ایک پھولوں سے مزین تھا اور دوسرا سادہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد صدر بلدیہ جھومتے جھامتے تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ رضا انور کوتوال شہر اور نوری پاشا مہتمم جنگی بھی تھے۔ شوکت پاشا کی آنکھوں میں مسرت جھلک رہی تھی۔ وہ بار بار مسکرا رہا تھا۔ اختر مسعود کی نگاہیں اسی پر جمی تھیں — تھوڑی دیر کے بعد محمود آفندی ایک خوش پوش رفیق کے ہمراہ ہال میں داخل ہوا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی صدر بلدیہ کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

محمود آفندی نے صدر بلدیہ کو ادب سے سلام کیا اور کہا میرے محترم پاشا آپ تشریف لے آئے؟

دوسرے آدمی نے کہا "آپ کا سائیس کہتا ہے کہ آپ نے اسے دو مہینہ سے تنخواہ نہیں دی۔ بیچارہ غریب آدمی ہے آپ بال بچوں کو دعا دیگا۔"

شوکت پاشا دانت پیسکر رہ گیا۔ اور اشارے سے وحیدالدین کو بلایا۔ اور دریافت کیا "آپ نے اس شیطان سے کیا طے کیا ہے؟"

وحیدالدین۔ آٹھ ہزار پونڈ۔ (آہستہ سے) اپنی فیس الگ ہے۔

صدر بلدیہ۔ میں ادا کر دونگا۔ میں اس سے اکتا چکا ہوں۔ کل گیارہ بجے نقد روپیہ۔

اختر مسعود اور وحیدالدین ہوٹل سے باہر نکلے تو محمود آفندی بھی انہیں مل گیا۔ وحیدالدین نے کہا کل گیارہ بجے آپکو آٹھ ہزار پونڈ مل جائینگے۔ محمود آفندی اپنی اس کامیابی پر ایک فاتح جرنیل کی طرح مسکرایا۔ "وہ کنج دلکشا۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو۔ انگوروں کے خوشے۔ خوشگوار دھوپ۔ بخدا وہ تاکستان جنت ارضی ہے۔"

مسعود۔ لیکن آپ نے اس کی خرید کا اچھا طریق سوچا۔

محمود۔ اجی شوکت پاشا پہلے معمولی دکاندار تھا۔ ایام جنگ میں اس نے بیس لاکھ روپیہ سے زیادہ کمایا اور میں نے اپنی صحت اور دولت سب قوم کی نذر کر دی۔ چونکہ اس نے ہماری وجہ سے کمایا اس لئے میں نے کچھ تھوڑا سا ٹیکس وصول کرنا ضروری سمجھا۔ اچھا میں کل بارہ بجے حاضر ہونگا اور امید ہے کہ کل شام کا کھانا آپ میرے ہاں کھائیں گے۔

غزل

(از حضرت استاذ السلطان نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل مدظلہ)

لاکھ دل مست ہو مستی کا عیاں راز نہ ہو
یہ وہ شیشہ ہے کہ ٹوٹے بھی تو آواز نہ ہو

خوف ہے موسم گل میں کہ صبا کا جھونکا
طائر ہوش کے حق میں پر پرواز نہ ہو

دل بہت بلبل شیدا کا ہے نازک گلچیں
پھول گلزار کے یوں توڑ کہ آواز نہ ہو

ہو کے وہ مست مے ناز گلے لپٹے ہیں
ہوش کم بخت کہیں تفرقہ پرداز نہ ہو

رخصت نالہ ہے دل کو مگر اس شرط کیساتھ
خواب راحت میں کسی کے خلل انداز نہ ہو

اس گرفتار کی پوچھو نہ تڑپ جسکے لئے
در قفس کا ہو کھلا طاقت پرواز نہ ہو

کیا قیامت ہے وہ دل توڑ رہے ہیں میرا
اس گماں پر کہ چھپا اس میں مرا راز نہ ہو

ذکر گلزار گرفتار قفس سے صیاد
روح بلبل کہیں آمادہ پرواز نہ ہو

اہل دل کو جو لٹاتی ہے صدا نغمے کی
پردۂ ساز میں پنہاں تری آواز نہ ہو

دل نہ فریاد کرے عشق بتاں میں کیا خوب
شیشہ پتھر پہ گرے اور پھر آواز نہ ہو!

تھام لینے دو کلیجہ مجھے ہاتھوں سے جلیل
قصۂ درد جگر کا ابھی آغاز نہ ہو

The "KAINAT" Lahore.



هندوستانی ناچ

اندلس میں اسلامی یادگار

جناب صاحبزادہ میر محمد عامر عباس عالی عباسی - ایف آئی ایچ ایس (پیرس)، کائنات کے سرگرم معاون اور اعلیٰ مضمون نگار ہیں - آپ بغرض تحقیقات تواریخ عنقریب یورپ تشریف لیجانے والے ہیں - (مدیر)

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را ؎
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را ؎

اندلس کے دارالسلطنت میڈرڈ سے بجانب جنوب چار فرسخ کے فاصلہ پر ایک شاندار قدیم نصرانی عمارت "اسکوریل" واقع ہے جس کو شاہ فلپ دوم نے تعمیر کرایا تھا - اس کو دیکھنے کے لئے دور دراز ملکوں سے ہمیشہ سیاح آتے رہتے ہیں - ایسا کیوں ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ اس کی تحیر خیز وسعت و قدامت اور اسپین کے آخری نصرانی عہد کی یادگار دنیا میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے، نہ صرف یہی بلکہ اس کے طویل و عریض کمروں میں اسپین کے نصرانی اور اسلامی عہد کا شاہی کتب خانہ بھی محفوظ ہے - اس واسطے یہ دلدادگان علم تواریخ کی دلچسپی کا خاص مقام ہے - یہ نیویارک لندن - پیرس - اور برلن کی لائبریریوں کے ذخیرہ علمیہ سے کہیں زیادہ قیمتی اور قابل دید ہے -

اس کتب خانہ کے دو حصے کئے گئے ہیں - ایک حصہ عہد مسیحی کی کتب اور دوسرا اسلامی کتب پر مشتمل ہے - جن سب کی مجموعی تعداد ۵۰ ہزار کے قریب ہے - علاوہ بریں عہد سابقہ کے سکے، کتبات سنگی، تصاویر، نقوش، اور کتب صنعتی و کلی کی بہت کافی تعداد موجود ہے - حصۂ اشیا، قبل از اسلام میں وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جن سے اس وقت کے طرز تمدن اور اہل اندلس کے عام رجحان طبع اور قابلیت کا اظہار ہوتا ہے - اسلام کی علم نوازی سے **توریت** اور **انجیل** کے وہ نسخے بھی جو عیسائی بادشاہوں کی تلاوت میں آتے تھے موجود ہیں - دو سو سے زائد کتب مذہبی لاطینی اور یونانی زبان میں موجود ہیں جن کے وجود سے اسلام کی بے تعصبی صاف ظاہر ہوتی ہے - کثیر التعداد نسخے قدیم اندلسی زبان کے بھی رکھے ہوئے ہیں - کتب گلی گویا چھوٹی بڑی تختیاں ہیں - جن پر خشک ہونے سے قبل لوہے وغیرہ کے قلم سے حروف و عبارتیں ثبت کی گئیں اور اس کے بعد آوے میں پکا کر پختہ کر لیا گیا - ان تختیوں پر سلاطین اسپین قبل مسیح کے فرامین و عہد نامجات اور باشندگان کے طرز معاشرت کے حالات تاریخی و جغرافیائی کیفیات، مذہبی و قومی روایات اور اس وقت کے علوم مروجہ کی معلومات کندہ ہیں - صنعتی کتب وہ ہیں جن میں بجائے کاغذ کے مختلف جانوروں کی دیر یا کھالوں سے کام لیا گیا ہے - رسوم متداولہ قدیمہ کی اکثر اشیا بھی پائی جاتی ہیں - دوسرے حصہ میں اندلس کے اسلامی تمدن کی یادگاریں ہیں - دو ہزار عربی کتب اور متعدد الواح سنگی، نقوش اور دیگر نوادر تاریخی موجود ہیں۔

سنہ ۱۴۹۱ء میں جب بنی احمر کا آخری فرمانروا ابو عبداللہ شہر "غرناطہ" دشمن کے سپرد کرنے کو تیار ہوا - تو اس وقت اس کے اور فرڈیننڈ سوم بادشاہ قسطلان کے مابین کچھ شرائط طے ہوئی تھیں جن میں سے بعض اسلامی مدارس اور کتب خانوں کی حفاظت اور سرپرستی کے متعلق بھی تھیں - فرڈیننڈ نے اہل اسلام کی مذہبی آزادی کو تسلیم کر لیا تھا - مگر پھر روگردان ہو گیا - اس ضمن میں فاضل مورخ سر ہمیو لکھتا ہے کہ " روئے زمین پر کسی فرقہ نے بنی نوع انسان کے قتل اور غارت گری، علم و ہنر کی بربادی میں اتنی وحشیانہ حرکات نہ کیں جیسی کہ اندلس کے تابعین مسیحیت نے دکھائیں - ایک صدی کے اندر اندر مسلمانوں اور ان کی علمی و تمدنی یادگاروں سے سرزمین اندلس کا چپہ چپہ خالی کر دیا گیا"

اندلس میں عہد اسلامی کی خاص چیزیں عمارات شاہی، ذخیرہ کتب اور درسگاہیں تھیں جن کو مسیحی حکومت نے نیست و نابود

کردیا۔ محلات، جیلخانوں میں تبدیل کر لئے گئے۔ بیش بہا کتابیں نذر آتش کر دی گئیں۔ مدرسے مسمار کر دیئے گئے۔ مسجدوں کو کلیسا بنالیا گیا۔ ان اعمال شنیعہ اور حرکات مذمومہ کا سلسلہ پوری ایک صدی تک جاری رہا۔ یہانتک کہ اسلام سپین سے رخصت ہوگیا۔ جب کوئی شہر مسلمانوں سے خالی کرایا جاتا تو جاہل مسیحی گروہ بایمائے حکومت چن چن کر کتابیں جمع کرتا اور نہایت فخر کے ساتھ انہیں خاک سیاہ بنا دیتا۔

اسپین کا آخری اسلامی کتب خانہ جو اکتوبر سنہ ۱۵۶۳ء میں نہایت وحشیانہ طریقہ سے جلایا گیا۔ وہ غرناطہ کا شاہی کتب خانہ تھا۔ مورخ "تاریخ کبیر" نے اس کی بربادی پر آنسو بہاتے ہوئے لکھا ہے کہ کتابوں کی فہرست فولیو سائز کی آٹھ جلدوں میں مندرج تھی۔ اس سے ناظرین تعداد کتب کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اتنے عظیم الشان ذخیرہ علم کو جس شخص نے برباد کرکے تشہیر و رسوائی کا دوامی طوق اپنے گلے میں ڈالا وہ اسپین کا پادشاہ کارڈینل زی مینس ہے۔ فرانسیسی مورخ کانڈی لکھتا ہے کہ ان بیش قیمت کتابوں کی ہر ایک جلد اس قدر قیمتی اور صنعت نادرہ سے تیار کی گئی تھی کہ عوام نے جلتے ہوئے ڈھیروں میں سے ان کے پٹھے نکال لئے تھے۔ تاکہ ان سے سونا چاندی اور قیمتی مصالحے حاصل کرلیں۔"

افسوس کہ یہ بربریت اور تعصب یہیں تک ختم نہ ہوا۔ بلکہ کتب خانہ شاہی جلا دینے کے بعد بھی کونٹ سیرن اور ہرننڈو نے یہ قانون نافذ کر دیا کہ کتب عہد اسلامیہ چونکہ تعلیم انجیل کے منافی ہیں اس لئے جہاں سے اور جسقدر بھی کتب ملیں جلا کر خاکستر کر دی جائیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں کی خانہ تلاشیوں سے جس قدر کتب اسلامی ہاتھ لگیں وہ سب چھین کر برباد کر دی گئیں یوں تو دنیا کے بعض کتب خانے (مثلاً اسکندریہ و ایران وغیرہ کے) جلائے جانے کی روایات و حکایات مبالغہ آمیز رنگ میں بیان کی جاتی ہیں کہ چار اور چھ ماہ تک کتابیں جلتی رہیں۔ یہ روایات لغو معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ کتابیں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں لیکن ان کو آتش سوزاں اتنی طویل مہلت نہیں دے سکتی۔ البتہ غرناطہ کا واقعہ غلو سے بالکل پاک ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ کامل دس روز تک کتابوں کے انبار جلتے رہے تھے۔

مندرجۂ بالا کیفیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسپین کے تمدن اسلامی کا کوئی ایسا علمی خزانہ باقی نہ رہا تھا۔ جو متاخرین تک وراثت میں پہنچ سکتا۔ ایک مدت مدید کے بعد جب مسیحی حکومت کا تعصب کم ہوا تو اسلامی عہد کے ذخیرہ علم کی جستجو ہوئی۔ مگر افسوس کہ اب وہاں قرطبہ اور غرناطہ کے خرابہ کے سوا کیا رکھا تھا۔

اسی زمانہ میں اتفاقاً اسپینی جنگی جہاز (؟) کو جو بحر روم میں برسر پیکار تھے۔ مراکش کے دو جہاز مل گئے جو مولائے مراکش کے لئے عربی کتب کا ذخیرہ ممالک مصر و فلسطین سے لئے جا رہے تھے ان کو گرفتار کرکے اسپین لایا گیا اور یہ علمی ذخیرہ "اسکوریل" میں بطور یادگار عہد اسلامیہ رکھدیا گیا۔ مگر چونکہ یہ مال غاصبانہ تھا اور اسپین کی قسمت میں علم کی دائمی بربادی لکھی تھی اس لئے حوادث روزگار نے اس کو بھی محفوظ نہ رہنے دیا۔ یعنے کچھ عرصہ بعد اس ذخیرہ میں آگ لگ گئی۔ علاوہ کتب کے بہت سی نادر اشیاء ضائع ہوگئیں۔ اس وقت جو کچھ موجود ہے وہ آتشزدگی سے بچا ہوا ذخیرہ ہے جس میں تقریباً دو ہزار کتابیں ہیں۔

اہل اسلام کی علمی قدردانی ملاحظہ کیجئے کہ فتح اسپین کے وقت جس قدر علمی و ادبی مواد پایا اس کی ہمیشہ حفاظت کی اور آٹھ سو سال تک بطور امانت احتیاط سے رکھا اور جب فلک شعبدہ باز کے ہاتھوں جلاوطنی پر مجبور ہوئے تب بھی اس میں خیانت روا نہ رکھی اور یہ مکمل جس طرح حاصل کیا تھا اسی طرح چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ وہ انجیل مقدس بھی جو شاہان اندلس پڑھا کرتے تھے اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ لیکن مسلمانوں کو اس مذہبی رواداری کا معاوضہ علم برداران نصرانیت کی طرف سے کیا ملا؟! یہی کہ ایک زریں عہد کا علمی مواد انتہائی جہالت کے ساتھ برباد کر ڈالا گیا؟!!

ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اس وقت جو کچھ بھی "اسکوریل" میں موجود ہے وہ اسپین کا نہیں بلکہ ایک مسلمان والی ملک کے ذوق علمی کا وہ نمونہ ہے جسے مشتے نمونہ از خروارے کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ بھی آتشزدگی سے پسماندہ ذخیرہ ہے۔

(عالی۔ عباسی)

غزل

(از محترمہ نواب گوہر زمانی بیگم صاحبہ محبوبؔ)

غیر سہتے ہیں جفا ہم کو الم ہوتا ہے ایسا دنیا میں بشر سچ یہ ہے کم ہوتا ہے
آگیا دل گل عارض پہ کسی کے شاید خط گلزار میں جو حال رقم ہوتا ہے
کہاں فرصت ہے بھلا داد وفا لینے کی اب سفر اپنا سوئے ملک عدم ہوتا ہے
کونسا دل ہے جسمیں نہیں الفت تیری کونسا سر ترے در پر نہیں خم ہوتا ہے
ہو گیا میں کشش جذبۂ دل کا قائل بتکدے میں بھی رکھوں سر تو حرم ہوتا ہے
کوچۂ عشق میں کیا کام تکبر کا بھلا سرکشی کرتا ہے جو سر وہ قلم ہوتا ہے
وہ لگاتے ہیں بلوں سے یہ تماشا دیکھو اب مرا جام گلی ساغر جم ہوتا ہے
مرنے والو! ہمیں اتنا تو بتا دو للہ! بعد مرنیکے سکوں بھی کوئی دم ہوتا ہے
شیخ جی مجھکو مرے حال پہ رہنے دیجے عاشقوں کا بھی کوئی دین دھرم ہوتا ہے

آکے دنیا میں نہ محبوبؔ کوئی کام کیا
ہم کو رہ رہ کے اسی بات کا غم ہوتا ہے

چند تاریخی حقائق

(جناب استاج المورخین علامہ وحشتی العباسی امرہوی مدظلہ)

بادشاہان مغلیہ دہلی کو راجپوت راجاؤں کی بیٹیاں دیئے جانے کی خاص وجہ سوائے اس امر کے کہ سلطنت اسلامیہ دہلی قدیم رئیسوں کے ساتھ رشتہ قرابت ہوجانے کے سبب استحکام پائے اور شورش و بغاوت منجانب اقوام ہنود رفع ہوجائے اور کچھ نہیں پائی جاتی۔ اب رہا یہ امر کہ بادشاہوں نے اپنی خواہش سے راجاؤں کی بیٹیاں داخل حرم کیں یا رئیسوں نے خود درخواست کرکے اپنی دختران کو محلات شاہی کرایا۔ تفصیل طلب ہے۔ جس قدر کتب بلکہ روزنامچہائے شاہی ہماری نظر سے گزرے ہیں ان سے یہی پایا جاتا ہے کہ مختلف راجاؤں نے درخواست کرکے اپنی بیٹیاں بادشاہان مغلیہ کو نذر کیں۔ چنانچہ اکبرنامہ، تزک جہانگیری، شاہجہان نامہ، عالمگیرنامہ اور منتخب اللباب خانی خاں وغیرہ مطول کتب میں جابجا یہی بیان ملتا ہے۔ اب اس کے بالمقابل فریق ثانی یعنے ریاستی و مقامی کتب و کاغذات کو دیکھا جاتا ہے تو یہ تفصیل کمی کے ساتھ اور مبہم ملتی ہے یعنے صرف ہندی مطول تواریخ مارواڑ اور بیکانیر میں متعدد مقامات پر جہاں ہر ایک راجہ کی اولاد کی تفصیل دی ہے۔ وہاں اتنا ہی درج ہے کہ مہاراج کی فلاں . . . بائی، فلاں . . . شاہزادہ جی کو بیاہی گئی۔ یہ شرح نہیں لکھی کہ آیا بادشاہ کے منشاء اور خواستگاری سے یہ امر واقع ہوا، یا خود رئیس کی تمنا و التجا سے یہ صورت پیش آئی۔ بہرحال ان دونوں صورتوں پر غور کرنے سے اور نیز رسوم و قواعد مروجہ عہود سلاطین اسلام پر نگاہ غائر ڈالنے سے میری رائے میں یہ صحیح و قرین یقین نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ ابتدا میں یا ہر موقع پر منشا تو بادشاہ کی جانب سے ہی ہوتا تھا۔ ورنہ ہر ایک رئیس زادی کو جو صورت و سیرت میں انکی پسند نہ ہوتی وہ ہرگز قبول نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن چونکہ بادشاہ کی طرف سے اس قبیل کی درخواست کا پیش ہونا مناسب حال نہ تھا اس لئے سلاطین کے حسب مرضی رئیس زادیاں پسند ہوجانے کے بعد ان کے والدین سے درخواست پیشکشی دختر کرائی جاتی تھی۔

جے پور۔ جودھپور۔ بیکانیر۔ کشنگڑھ۔ جیسلمیر سے اکثر بار اور ڈونگرپور وغیرہ سے ایک بار بیٹی لی گئی۔ اسمائے ریاستہائے مذکورہ سے واضح ہوگا کہ جے پور کی کچھواہہ نسل سے، جودھپور، بیکانیر اور کشنگڑھ کے راٹھور خاندان سے۔ جیسلمیر کے چندر بنسی بھاٹی فریق سے اور ڈونگرپور کے سورج بنسی اہاڑیہ قوم سے، جو سیسودیوں کی بڑی شاخ کا اور خود ان کا قدیمی نام ہے۔ بادشاہوں کو بیٹیاں گئیں خاندان مغول سے پہلے ایسے واقعات برضامندی جانبین وقوع میں نہ آئے اس رسم کا بانی جلال الدین اکبر تھا۔ جس کو سب سے اول راجہ بھارا مل والی آنبیر (جے پور) کی دختر . . . دی گئی تھی۔ شاہان دہلی میں بدبخت فرخ سیر پر یہ رسم ختم ہوگئی۔ جس کو جودھپور کے مہاراجہ راجیشر اجیت سنگھ کی بیٹی دی گئی تھی۔ چنانچہ اس کے خسر اجیت سنگھ نے محض اس وجہ سے کہ وہ اس کے دشمن مہاراجہ دھراج سوائی جے سنگھ سے موافقت رکھتا تھا اور اجیت سنگھ کے دوستوں سید عبداللہ خاں قطب الملک وزیر اور امیر الامراء حسین علی خاں سپہ سالار سے مخالفت رکھتا تھا قتل کرا دیا۔ اجیت سنگھ نے فرخ سیر سے بیٹی دینے کے صلہ میں محصول جزیہ معاف کرایا تھا (اس خصوص میں راقم الحروف نے فرخ سیر کا دستی فرمان بنام مہارانا اودے پور بچشم خود دیکھا ہے) لیکن جب فرخ سیر سوائی جے سنگھ کی سازش سے جو اجیت سنگھ کا مدمقابل تھا اجیت سنگھ کے دوستوں عبداللہ خاں و حسین علی خاں وغیرہ سے اظہار مخالفت کرنے لگا تو اس نے اپنے انہی دوستوں کی مدد سے اپنے بے گناہ داماد فرخ سیر کو جبکہ وہ اندھا کئے جانے کے بعد محل کے ایک حجرہ میں محبوس تھا پھانسی دلوادی۔ اس سانحہ کے بعد راجہ مذکور اپنی چہیتی بیٹی کو ہندوانہ لباس تبدیل کراکر مارواڑ واپس لے گیا۔ اس باب

میں مصنف تاریخ مرات واردات ؟ و "تذکرہ واقعات" نے اجیت سنگھ کی مع اس کے مشیروں و معاونوں کے بہت مذمت و مذلت بیان کی ہے۔

اکبر کی شادیاں جے پور، کچھ بھج، بیکانیر، اور ڈونگر پور میں جہانگیر کی جودھپور و جیسلمیر وغیرہ میں۔ عالمگیر کی کشمیر و میواڑ میں معظم بہادر شاہ یعنی شاہ عالم اول کی کشنگڈھ میں۔ شہزادہ پرویز اور فرخ سیر کی جودھپور میں ہوئی تھیں۔

منجملہ ان کے تین بادشاہ رانیوں ہی کے بطن سے پیدا ہوئے یعنی جہانگیر آنبیر کے راجہ بہارامل کی بیٹی سے۔ شاہجہاں جودھپور کے راجہ اودے سنگھ کی بیٹی سے۔ شاہ عالم اول کشمیر کے راجہ کی بیٹی سے پیدا ہو کر تخت نشین سلطنت ہند ہوئے۔

ہم نے ان حقائق تاریخی کو غیر جانبدارانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔

نعت سرورِ کائنات

(علامہ فرحتی امروہوی مدظلہ)

بارِ دیں جب بر سرِ صدیقِ اکبر رکھدیا
مرتدوں نے آپ کے فرمان پر سر رکھدیا

جانشینانِ پیمبر تھے وہ جن کے حکم پر
تاجدارانِ جہاں نے شوق سے سر رکھدیا

ان کے دنداں کی پڑی جن سنگریزوں پہ جھلک
نام ان کا اس جہاں میں لعل و گوہر رکھدیا

جو کہ تیرا تشنہ کامِ شربتِ دیدار ہے
سر سے دور اس نے خیال حوض کوثر رکھدیا

اشجع اولاد ہاشم کیوں نہ اس کو مانیے
توڑ کر اک دم میں جس نے باب خیبر رکھدیا

حیف لوگوں میں نہیں ہے عقل کامل فرحتی
کارِ دیں کو ناقصوں نے کر کے ابتر رکھدیا

رباعی

یارب تو چناں کن کہ پریشاں نشوم
محتاج برادران و خویشاں نشوم
بے منتِ خلق مرا روزی دہ
تا از در تو بر در ایشاں نشوم

لنکا

(مولوی عبدالباسط خاں صاحب مراد آبادی)

یہ جزیرہ چند ناموں سے مشہور ہے لنکا - سرانديپ - جزلیاس سنگھلدیپ - سیلان - انگریز اس کو سیلون کہتے ہیں - یہ ٹاپو ۲۷۰ میل لمبا اور ۱۴۵ میل چوڑا ہے - اس میں پہاڑ اور دریا بہت ہیں اس کے سب سے بڑے دریا کا نام مہا ولی گنگا ہے - جو تخمیناً ۲۰۰ میل لمبا ہے - لنکا میں لوہے اور پھٹکری کی کانیں ہیں - اس کے دریائی ریت میں یاقوت - لہنا - نیلم - گومیدک - بلور - پایا جاتا ہے - یہاں دارچینی، الائچی، گول مرچ اور قہوہ کثرت سے پیدا ہوتا ہے - یہاں کے ہاتھی نہایت مضبوط اور چالاک ہوتے ہیں - مشہور ہے کہ یہاں ہما (پرند) بھی پیدا ہوتا ہے - جو ہڈیاں کھاتا ہے - جسکے متعلق حکیم سعدی نے لکھا ہے - ؎

کس نیاید بزیر سایۂ بوم
ور ہما از جہاں شود معدوم

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لنکا میں ہما کا پیدا ہونا مشہورات بے اصل میں سے ہے - یہاں کے باشندے اکثر سنگھی اور ملیباری ہیں - مسلمان کم اور بدھ مذہب کے پیرو زیادہ ہیں - یہ لوگ سیدھے سادے سچے اور ملنسار ہیں - حسن ظاہر سے بھی محروم نہیں ہیں ان کی اپنی زبان جدا ہے - مگر اب انگریزی طرزِ تمدن کا اثر قبول کرتے جا رہے ہیں - یہاں کے باشندوں کی مردم شماری ۴۰ ہزار کے لگ بھگ ہے - یہاں کے ایک مندر میں بہت حفاظت سے سونے کی ایک ڈبیا رکھی ہے جس کے تہہ در تہہ چھ ڈھکن ہیں سب سے اوپر ایک پیتل کا ڈھکن ہے - اس ڈبیا کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہے - آپکو معلوم ہے اس کے اندر کیا چیز ہے جس کے لئے اس قدر اہتمام کیا گیا ہے؟ اس میں مہاتما بدھ کا ایک دانت محفوظ ہے جو قبل ازیں وہاں کے راجہ کی نگرانی میں تھا - مگر انگریزی تسلط کے بعد سے وہ انگریزی افسر کے تحت میں ہے جسکے درشن کے لئے ہر سال میلہ لگتا ہے -

یہاں سمندر کے متصل سات ہزار فٹ اونچا ایک پہاڑ ہے جسکی چوٹی کو انگریز قلعہ آدم کہتے ہیں - وہاں ایک پتھر کی چٹان پر انسانی پاؤں کا نشان بنا ہوا ہے - جو لمبائی میں دو فٹ ہے - سنگھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ نشان بدھ جی کا ہے - یہاں سے بدھ جی بہشت کو گئے تھے اور مسلمان اس کو حضرت آدمؑ کا قدم بتاتے ہیں کہ وہ اس مقام پر جنت سے زمین پر اترے تھے - غرض ہر طرح یہ قدم مرجع خلائق ہے - خواہ وہ جنت کو جانے کی سیڑھی ہو یا جنت سے اترنے کا زینہ -

ہمارے خیال میں تو یہ کسی قدیم سنگ تراش کی ستم ظریفی ہے ورنہ بدھ جی کا قدم ۲ فٹ لمبا تھا نہ حضرت آدم کا۔

رباعی

اے عشق گرانقدر بیک سیر بیا
تا چند نزاع حرم و دیر بیا!
کفر و اسلام جنگ باہم دارند
اے صلح وہ ثالث بالخیر بیا

(آتف دہلوی)

اصلاح تعلیم

ناظرین کائنات میں بہت سے طلبہ، ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر صاحبان شامل ہیں جن کے لئے یہ مضمون نہایت مفید، دلچسپ اور ترقی معلومات کا باعث ہوگا۔ عام پبلک کے لئے بھی یہ مضمون فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہم جناب محمد اسحاق صاحب قریشی کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں جنھوں نے "اصلاح تعلیم" ایسے خشک عنوان پر اس قدر دلچسپ مضمون تحریر فرمایا۔ (مدیر)

جب تک کسی قوم کے افراد میں آزادی تعلیم کا سچا جذبہ پیدا نہ ہو وہ آزاد نہیں ہو سکتی۔ اور یہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس قوم کی تعلیم گاہوں میں آزاد تعلیم عام نہ ہو جائے۔ ایسی تعلیم جو نئی نسلوں کو غلامانہ ذہنیت اور غلامانہ رسم و رواج کی پابندیوں سے آزاد کر سکے ہماری موجودہ درسگاہیں بچوں کے فطری جذبۂ جرأت کو بیدار کرنے کے بجائے قتل کر رہی ہیں۔ جب تک موجودہ طریقۂ تعلیم جاری ہے ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ہمارے نزدیک حل نہیں ہو سکتا۔

یورپ و امریکہ } خود یورپ اور امریکہ کی حکومتیں اس مسئلہ کی اہمیت پر غور کر رہی ہیں کہ اگر نئی نسلیں علمی اور عملی غلامی سے آزاد نہ ہونگی تو خود ملک کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اسی لئے وہاں کوشش ہو رہی ہے کہ بچوں کی طبیعت میں زیادہ سے زیادہ آزادی پیدا کی جائے اور ان کے ذہن و دماغ کی نشو و نما ایسی آزاد اور حیات پرور آب و ہوا میں ہو کہ ہر بچہ اپنی جگہ پر انسانیت کا ایک مکمل نمونہ بن جائے۔

استاد کا فرض } ڈاکٹر مانٹری نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے نئی راہیں نکالی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "اگر استاد بچوں کو گمراہ نہ کریں تو یقیناً بچے خود بخود سیدھی راہ ڈھونڈھ نکالیں گے" ان کے نزدیک استاد کا فرض صرف اس قدر ہے کہ بچہ کے دماغ پر کوئی بیرونی اثر نہ پڑنے دے تاکہ وہ اپنی ذاتی جستجو سے تمام اصولی و فروعی مسائل حل کر سکے۔

انگلستان کے ایک ماہر تعلیم نے پرانے تعلیمی طریقوں پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے "جس طرح پودا خود بڑھتا اور پھلتا پھولتا ہے۔ اور ہوشیار سے ہوشیار باغبان بھی آم کے درخت میں امرود کے پھل نہیں لا سکتا اسی طرح لائق سے لائق معلم بھی بچے کی طبیعت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ معلم کا فرض صرف اتنا ہے کہ باغبان کی طرح مناسب آب و ہوا بہم پہنچانے کی کوشش کرے۔ اور بس۔ بچے کی دماغی اور اخلاقی ترقی صرف آزادی رائے و عمل کے فطری اصول کے مطابق ہی ہو سکتی ہے۔

خودسری } یہ خیال غلط ہے کہ آزادی۔ خودسری اور بدنظمی کی طرف لیجاتی ہے۔ یہ خطرہ دلوں میں اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اب تک قوانین فطرت کی باقاعدگی اور ہمہ گیری کے علم سے بے بہرہ ہیں بچے اگر قواعد کی پابندی سے بغاوت کرتے ہیں تو یہ ان کی طبیعت کا قصور نہیں موجودہ طریقۂ تعلیم کا قصور ہے۔

مسٹر اے ایس نیل فرماتے ہیں کہ "ہر لڑکا فطرتاً صالح ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی "مصلح" کا ہاتھ اسے بگاڑ دے"۔ استادوں کی سختی سے بچے یا تو ضدی اور شریر ہو جاتے ہیں یا بزدل اور غلام بن جاتے ہیں ضدی اور سرکش بچوں میں ترقی کی صلاحیت موجود رہتی ہے مگر بزدل اور غلام لڑکے ہر قسم کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ذوق و میلان } سچی تعلیم و تربیت کے لئے آزادی رائے و عمل کے بعد جو چیز قابل لحاظ ہے وہ بچہ کا ذوق و میلان طبیعت ہے جبر سے جو کچھ بھی سکھایا جائے گا دماغ کی گہرائیوں تک ہرگز نہ پہنچ سکے گا۔ صدہا کتب طلبہ کو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ مگر چونکہ ان کے ذوق کے مطابق نہیں ہوتیں اس لئے ان کے نام بھی زیادہ دنوں دماغوں میں محفوظ نہیں رہتے لیکن جب خود بچہ کو کسی چیز کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے تو اسے توجہ اور محنت سے حاصل کرتا اور عمر بھر یاد رکھتا ہے۔

سب سے بہتر درسگاہ } "تیتری ہا" (امریکہ) کی درسگاہ دنیا کی سب سے بہتر درس گاہ ہے۔ جہاں بچے۔ جوان۔ بوڑھے، سب ملکر علمی تحقیقات میں منہمک رہتے ہیں۔ یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ استاد کون ہے اور شاگرد کون۔ لڑکے اپنی ٹولیاں بنالیتے ہیں اور اپنے ذوق کے مطابق

علمی و غیر علمی مباحث میں دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں کسی ٹولی کو مٹی یا لکڑی کے گھروندے یا مکان بنانے کا شوق ہوتا ہے۔ کوئی لوہے پیتل کے اوزار تیار کرنے لگتی ہے۔ کسی کو کھیتی یا کپڑا بننے سے رغبت ہوتی ہے کوئی صرف حقایق اشیا کی تحقیق میں منہمک و مشغول رہتی ہے لڑکوں کا جی چاہے تو وہ درجہ میں جا بیٹھیں ورنہ کبڈی کھیلتے پھریں یا جو جی چاہے کریں۔ کوئی پابندی یا قید نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالآخر وہ خود بخود بے فائدہ کاموں سے اکتا جاتے ہیں اور مفید کاموں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ اس طرح بغیر کسی جبر و اکراہ کے درسگاہ کے مقاصد از خود حاصل ہو جاتے ہیں۔

اسی مدرسہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن کسی بچہ نے اپنے درجہ میں بے ساختہ کہا ! ! ہا رات میری بلی نے بچے دیئے۔ پوری جماعت اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ استاد نے (جسے لڑکے اپنا دوست سمجھتے ہیں) بڑے تعجب سے سوال کیا "کیا تمہاری سفید بلی نے پھر کوئی بچہ دیا ہے ؟" لڑکے نے جواب دیا "ایک نہیں چھ بچے دیئے ہیں پہلے بھی چھ بچے دے چکی ہے۔ مگر وہ مر گئے" اس پر استاد نے سوال کیا کہ اگر فلاں فلاں لڑکوں کی بلیاں بھی اتنے ہی بچے دیدیں تو سب کتنے بچے ہو جائیں گے" اس پر جمع تفریق ضرب تقسیم کے بیسیوں سوال حل ہو گئے۔ پھر ایرانی انگریزی اور ہندوستانی بلیوں کے رنگ روپ وغیرہ جاننے کے لئے لڑکوں نے طے کیا کہ وہ کل صبح چڑیا گھر جا کر بلیوں کا معائنہ کریں گے

ہندوستانی مدرس } ہندوستان کی کسی درسگاہ میں اگر کسی بچہ کی زبان سے یہی فقرہ نکل جائے کہ میرے یہاں بلی نے بچے دیئے تو بس سمجھ لو کہ اس کی کم بختی آگئی۔ اگر سزا سے بچ بھی جائے تو ترش رو مدرس کی یہ تنبیہ ضرور سننا پڑے گی کہ "اچھا میاں ! سبق میں دھیان دو۔ گھر کی باتیں گھر جا کر کرنا" حالانکہ مدرس اگر فن تربیت سے بالکل کورا نہ ہوتا تو اسی ایک معمولی سی بات سے جس نے درجہ بھر کی توجہ اپنی طرف جذب کر لی تھی بچوں کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا تھا۔

ٹیگور کی رائے } ڈاکٹر ٹیگور کی رائے ہے کہ "ہماری درسگاہیں ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ بچوں کو اتنے سال میں اتنے سبق ضرور یاد کرا دیں خواہ بچے انہیں یاد کرنا چاہیں یا نہ چاہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ بچوں کے حلق میں اتنے دن کے اندر اتنی غذا ضرور اتار دینی چاہئے خواہ انہیں بھوک لگے یا نہ لگے۔ حالانکہ بے بھوک کے اس طرح روز کھانا پیٹ میں اتارنے کا نتیجہ یہی ہوگا کہ قوت ہاضمہ خراب ہو جائے گی اور تندرستی بڑھنے کے بجائے گھٹنا شروع ہو جائے۔ ٹھیک اسی طرح اگر ہم بچہ کے دماغ میں وہ معلومات ٹھونستے رہیں جنھیں وہ قبول کرنا نہیں چاہتا تو ہم اس کے دماغ کو ترقی دینے کے بجائے سخت صدمہ پہنچانے کا باعث بنیں گے۔

مانٹری کا قول } ڈاکٹر مانٹری فرماتے ہیں کہ "تعلیم و تربیت کے صرف دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو جبر و تشدد سے بچوں کی تادیب کی جائے یا ایسی دلچسپیاں جمع کر دی جائیں کہ ان میں پڑ کر بچوں کو خود بخود تربیت حاصل ہو جائے۔ پہلا طریقہ دنیا بھر میں ناکام رہا ہے۔ دوسرے طریقہ پر ابھی تک پوری طرح عمل نہیں کیا گیا۔"

سختی کا اثر } بچہ کی نازک طبیعت پر استاد کی سختی کا بہت مہلک اثر پڑتا ہے استاد کو چاہئے کہ بچہ کے رجحان کا اندازہ کرے اور جب معلوم ہو جائے کہ اس کی طبیعت کس طرف مائل ہے تو پھر اس کے شوق کی پیاس اس طرح بجھانی چاہئے کہ وہ پیتا چلا جائے مگر پیاس بڑھتی رہے۔ بچہ کی طلب صادق استاد کے لئے ایک ایسا میدان عمل ہے کہ اسے سر کرنے کے لئے بے طلبی اور بے حسی کے ہزاروں دفتر قربان کئے جا سکتے ہیں۔

خمخانہ خسرواں یا کلید اقتدار } زمانہ حال کی وہ مایہ ناز معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو ہر انسان کیلئے بیحد مفید اور مادی و روحانی ترقیات کی ضامن ہے قیمت دو روپے

ہر قسم کی کتب ——————— (پتہ) اردو کتاب گھر لاہور حلقہ نمبر ۱۴ سے منگائیے۔

محققانہ

جُگنو

(حضرت ناظم میرٹھی)

برسات کی تاریک مگر خوشگوار راتوں میں پانی کے کنارے ہری ہری گھاس پر یا سرسبز جھاڑیوں میں کرمک شب تاب کے جگمگاتے ہوئے چراغ آسمان کے جھلملاتے ہوئے تاروں سے کہیں زیادہ پرکیف اور دلفریب ہوتے ہیں۔ یہی دل چاہتا ہے کہ بس خاموش بیٹھے قدرت کے اس عجیب و غریب نورانی حسن کے جلووں کی سیر کیا کیجئے۔

جب کوئی بھولا بھٹکا جگنو اتفاق سے کسی گھر میں آنکلتا ہے۔ تو آنکھیں بے اختیار اس کا تعاقب کرنے لگتی ہیں۔ بچے اسے دیکھکر کس قدر خوش ہوتے ہیں جوش مسرت میں تالیاں بجاتے ہیں۔ اس کے پیچھے بھاگتے ہیں اور اکثر پکڑ ہی لیتے ہیں۔ کوئی اسے اپنے کرتے کے دامن میں لپیٹکر قدرتی نور کی چمک دمک سے محظوظ ہوتا ہے اور کوئی اپنی کتاب کے ورق پر چھوڑ کر اس کی روشنی میں حروف پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب ایک محقق کی متجسس نگاہ اس پر پڑتی ہے تو وہ قدرت کے اس اسرار کی تحقیق میں منہمک ہو جاتا ہے۔ سینکڑوں تجربات کرتا ہے عجیب و غریب مشاہدات ہوتے ہیں۔ اور بالآخر نور قدرت کو منظر عام پر لا کر حقیقی مسرت حاصل کرتا ہے۔

چنانچہ سنہ ۱۶۶۷ء میں رابرٹ بائل (Robert Boyle) نے اس حیوانی نور کی ماہیت اور اصلیت دریافت کرنے کے لئے نورانی مچھلیوں اور بوسیدہ لکڑیوں وغیرہ پر مختلف تجربات کر کے یہ ثابت کیا کہ ہوا کی غیر موجودگی میں روشنی کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ گویا روشنی تکسید (oxidation) یا احتراق کے فعل سے پیدا ہوتی ہے اس کے بعد سنہ ۱۷۹۴ء میں ایک اطالوی مشہور محقق اسپلنزانی نے چند نورانی لعابی مچھلیوں (jelly-fish) کو خشک کرنے کے بعد ان کو پانی میں ڈالا تو ان مردہ مچھلیوں سے ویسی ہی روشنی نکلنے لگی جیسی کہ زندہ مچھلیوں سے نکلتی تھی اس سے صاف ظاہر ہے کہ روشنی ایک کیمیائی عمل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جانور کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان واقعات اور معلومات کو مدنظر رکھتے ہوئے سنہ ۱۸۸۵ء میں ایک فرانسیسی ماہر حیاتیات مسٹر ریفل ڈوبے نے ایک بڑا دلچسپ تجربہ کیا۔ اس نے گھونگے کی قسم میں سے ایک نورانی جانور کی چمکدار بافت (glandular tissue) لے کر ٹھنڈے اور گرم پانی میں اس کے دو محلول تیار رکھے۔ جب ان دونوں میں روشنی گل ہو گئی تو اس نے ان کو ایک جگہ ملا یا جس سے روشنی پھر نمودار ہوئی۔ چنانچہ اس تجربہ کی بنا پر اس نے یہ ثابت کیا کہ ایک مکسد مادہ (oxidising substance) جو گرم کرنے سے ضائع ہو جاتا ہے دوسرے مادہ پر عمل تکسید کرتا ہے اور اس سے یہ روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ روشنی گل کیوں ہو گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹھنڈے پانی کے محلول میں وہ مادہ جس کی تکسید ہوتی ہے صرف ہو چکا تھا۔ لیکن مکسد موجود تھا اس کے برخلاف گرم پانی کے محلول میں حرارت کی وجہ سے مکسد ضائع ہو گیا تھا اور دوسرا مادہ موجود تھا۔ چنانچہ جب محلولات کو ملایا گیا تو عمل تکسید پھر شروع ہو کر روشنی کا باعث ہوا۔

ڈوبے کے ان تجربات پر پروفیسر نیوٹن ہاروے نے مزید تحقیق و تدقیق کے بعد یہ نظریہ قایم کیا کہ روشنی پانی اور آکسیجن گیس کی موجودگی میں دو مادوں کے باہم عمل پیرا ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک لوسی فریس (luciferase) ہے جو بطور مکسد عمل کرتا ہے۔ اور دوسرا لوسی فیرن (luciferin) ہے جس کی تکسید ہوتی ہے۔

اس قدر معلومات بہم پہنچنے کے بعد سنہ ۱۸۹۵ء میں فیراڈے نے جگنو پر متعدد دلچسپ تجربات کر کے یہ معلوم کیا کہ حیوانی نور میں حدت نہیں ہوتی۔ یہ نور قدرت کا ٹھنڈا نور ہوتا ہے۔ اگر ایک

جگنو کو ہاتھ یا نیچے کے ہونٹ پر جو بدن کا حساس ترین حصہ ہے تھاما جائے تو گرمی کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔ نیز یہ کہ اس روشنی میں تحت سرخ (Infra-red) اور بالا بنفشی (Ultra-violet) شعاعیں نہیں پائی جاتیں۔ تاہم اس میں اور معمولی روشنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر کچھ جگنو پکڑ کر شیشے کے ایک ہوادار برتن میں رکھے جائیں تو ان کی روشنی میں بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ نور بالکل معمولی نور کی طرح عمل کرتا ہے۔ عکاسی کی تختی پر اثر آفریں ہوتا ہے۔ مختلف اشیا میں تنرہر (Phosphorescence) اور عارضی تنزھر (Fluorescence) بھی پیدا کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پودوں کی نئی اور نازک کونپلیں اس کی طرف ایسی ہی جھک آتی ہیں جیسے کہ سورج کی روشنی کی طرف۔ یہ نور خضرہ (Chlorophyll) کی افزائش کا بھی مد ہوتا ہے۔

قدرت کا یہ ٹھنڈا نور تمام مصنوعی روشنیوں سے ارزاں ترین ہے کیونکہ یہ حرارت کے بڑھنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ خود اس کا کوئی حصہ حرارت کی صورت میں صرف ہوتا ہے۔ اکثر تجربات سے دریافت کیا گیا کہ موم بتی کے شعلہ کے لئے جس قدر توانائی درکار ہوتی ہے جگنو کی چمک میں دست قدرت اس کا صرف $\frac{1}{40}$ حصہ صرف کرتا ہے۔ اور اس میں بمشکل $\frac{1}{1000}$ C درجہ کی حرارت پیدا ہوتی ہے۔

جگنو حشرات کی قسم میں سے ایک کیڑا ہے جس کے جسم پر ایک سخت پوست ہوتا ہے۔ جو مختلف حلقوں سے مل کر بنتا ہے یہ حلقے دونوں پہلوؤں پر جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے جوڑ لچکدار رہتے ہیں جس کی وجہ سے کیڑے کو اپنا جسم موڑنے اور حرکت کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ ان حلقوں کی جوف (Cavity) کے اندر کیڑے کے نرم اعضا، رگیں اور اعصاب وغیرہ ہوتے ہیں۔ جگنو کا تمام جسم تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) سر (۲) سینہ (۳) شکم۔ پہلا حصہ یا سر سخت پوست کے صرف ایک حلقے سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے اس حصہ میں نیچے کی جانب مونہہ اور اوپر کی اطراف میں آنکھیں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ سر پر دو چھوٹے چھوٹے حساس بال بھی ہوتے ہیں۔ سر کے پیچھے سخت پوست کے تین حلقے سینہ کہلاتے ہیں ان تینوں میں سے ہر ایک میں نیچے کی طرف دو دو ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اوپر کی طرف ان میں سے پہلا حلقہ جو سر کے قریب ہوتا ہے خالی رہتا ہے۔ البتہ دوسرے حلقہ میں دو موٹے اور سخت پر ہوتے ہیں جو تیسرے حلقے میں لگے ہوئے دو نرم و نازک پروں کو ڈھکے رہتے ہیں۔ تیسرے حلقہ کے باریک پر پرواز کے کام آتے ہیں اور اوپر کے سخت پر جو کیڑے کی کمر کے وسط میں ایک خط مستقیم پر ملتے ہیں۔ آرام کی حالت میں دونوں جانب اور اوپر وسطی خط پر ایک ایک باریک سوراخچہ ہوتا ہے۔ جو "منافس" کہلاتا ہے ان سوراخچوں کے ذریعہ سے کیڑا سانس لیتا ہے۔ روشنی کا سامان ان میں سے صرف آخری تین حلقوں میں نیچے کی سطح پر ہوتا ہے۔

جگنو اکثر گھونگے وغیرہ کھاتا ہے۔ لیکن کھانے کا طریقہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ جب گھاس کی پتی پر کوئی گھونگا ٹکا ہوا نظر آتا ہے۔ تو پہلے جگنو اس کے جسم میں ایک قسم کا زہریلا مادہ داخل کر دیتا ہے جس سے گھونگا فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے لیکن مرتا نہیں۔ اسی حالت بیہوشی میں گھونگے کا جسم زہر کے اثر سے رفتہ رفتہ پیچ کی طرح ایک نرم اور رقیق مادہ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ تب جگنو اسے بطور غذا استعمال کرتا ہے۔ اور گھونگے کا سخت پوست گھاس کی پتیوں پر رکھا رہ جاتا ہے۔

جگنو مختلف انواع کے ہوتے ہیں۔ انگریزی نوع کا جگنو لیمپائیر ناکٹیلوک (Lampyris noctiluca) کہلاتا ہے اس کا جسم سیاہ رنگ کا نرم۔ نوکدار اور اوپر سے کچھ چپٹا ہوتا ہے۔ نر جگنو کی آنکھیں بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں تاکہ وہ مادہ آسانی سے تلاش کر سکے۔ اس نوع کی مادہ کے پر نہیں ہوتے اور آنکھیں بھی نر کے مقابلہ میں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کی روشنی نر سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ جس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نر اس کو دور سے دیکھ سکے۔ پر نہ ہونے کی وجہ سے یہ عموماً گھاس پر بیٹھی رہتی ہے اور بچے اس کو بآسانی پکڑ لیتے ہیں۔

اس مادہ میں روشنی کے تین حلقوں میں سے پہلے دو حلقوں پر سپید قلعی کے گول دائرے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور آخری حلقے پر اس قلعی کے صرف دو گول نشانات نظر آتے ہیں۔ لیکن نر جگنو کے

پہلے دو حلقوں پر قلعی نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف آخری ایک حلقہ میں دو نشانات پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے نر کی روشنی مقابلتہً پھیکی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی قلعی دراصل روشنی کا باعث ہوتی ہے۔ اس میں بھی کسد مادہ لوسی فرس دوسرے مادہ لوسی فیرن کی تکسید کرتا ہے جس سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوسی فیرن تکسید کی وجہ سے آکسی لوسی فیرن (Oxyluciferin) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن فوراً ہی اس پر تحلیل (Reduction) کا عمل لاحق ہوتا ہے۔ جس سے یہ پھر لوسی فیرن میں تبدیل ہو جاتا ہے اور حسب سابق اس کی پھر دوبارہ تکسید ہوتی ہے۔ غرض اسی طرح یہ تعملات بالترتیب وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ جس سے روشنی برابر جلتی اور بجھتی رہتی ہے۔ اسی کو ڈاکٹر اقبال نے کس خوبی سے ادا کیا ہے

چھوٹے سے چاند میں تھی ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں !

اس عمل کے لئے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے جو اعضائے تنفس سے چھوٹی چھوٹی باریک نالیوں کے ذریعے سے کافی مقدار میں آتی رہتی ہے۔ اگر جگنو کا چمکدار حصہ علیحدہ نکالکر ایسے پانی میں ڈالا جائے جس میں ہوا حل شدہ ہو تو روشنی برابر قایم رہتی ہے لیکن اگر پانی کو گرم کر کے اس کی ہوا خارج کر دی جائے تو روشنی گل ہو جاتی ہے، جگنو کو گرم پانی میں ڈالنے سے اس کی روشنی بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ حرارت زیادہ ہونے سے عمل تکسید تیزی کے ساتھ ہوتا ہے برخلاف اسکے ٹھنڈے پانی میں روشنی ہلکی پڑتی جاتی ہے۔

ایک دوسری نوع کا جگنو جو لیوسولا اٹیلیکا (Luciola italica) کہلاتا ہے اٹلی میں پایا جاتا ہے۔ اس نوع میں مادین کی ٹانگیں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے پر ہوتے ہیں۔ شام کو جب یہ کہیں گھاس پر بیٹھتی ہے تو عجب دلکش منظر ہوتا ہے۔ لاتعداد نر اس کے اوپر منڈلانے لگتے ہیں یہ نہایت پر لطف نظارہ ہوتا ہے۔ بقول حضرت اسمٰعیل

چمکنے سے جگنو کے تھا اک سماں
ہوا پر اڑیں جیسے چنگاریاں !

ان نروں کو دیکھ کر مادین کے دل میں غالباً ایک خاص جذبہ بیدار ہوتا ہے لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا، مگر اتنا ضرور ہے کہ مادہ کی روشنی میں اس وقت ایک غیر معمولی چمک آجاتی ہے جس کا نر کیڑوں پر ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ زمین پر مادہ کے گرد جمع ہو کر ایک منور حلقہ قایم کر لیتے ہیں۔ ان جگمگاہٹ سے جنگل کی تاریک اور خاموش فضا میں بزم چراغاں کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ عجیب دلچسپ اور حیرت افزا منظر ہوتا ہے۔ شاید روشنی کی یہ شعاعیں جانبین کے دلوں میں التفات و موافقت کی محرک ہوتی ہیں کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نر آہستہ آہستہ اپنا حلقہ چھوٹا کر کے مادین کو قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ اور آخر اس کے چاروں طرف رقص کرنے لگے ہیں۔ اس وقت ان کی روشنی بہت تیزی سے جلتی اور بجھتی رہتی ہے یہ ہجوم عاشقاں مادین کے لئے بہت دل خوش کن ہوتا ہے۔

لیم پرو فورس ٹینی بر اسس {Lamprophorus tenebrosus}
ایک دوسری نوع کا جگنو ہے جس کی مادہ کے پر نہیں ہوتے۔ اس کی روشنی ہلکے سبز رنگ کی ہوتی ہے۔ نر جگنو جب مادہ کے قریب جاتا ہے تو ایک تعجب انگیز مشاہدہ ہوتا ہے۔ نر اپنی روشنی کو بالکل خاموش کر لیتا ہے اور اندھیرا ہو جاتا ہے۔

جگنو کی بعض انواع ایسی بھی ہیں کہ ان کے جنین (Embryo) سے بھی روشنی نکلتی ہے مثلاً سیلون کا جگنو، اس کے جنین اور انڈے دونوں نورانی ہوتے ہیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مختلف نورانی جانوروں کی روشنی مختلف رنگ کی ہوتی ہے۔ جگنو کی روشنی ہلکے سبز رنگ کی ہوتی ہے اور اطالوی دیا مکھی کی نیلے رنگ کی۔ بعض مونگوں کی روشنی سپید و سرخ رنگ کی ہوتی ہے یہ بھی مشاہدہ ہوا ہے کہ ایک ہی جانور سے مختلف رنگوں کی روشنیاں نکلتی ہیں۔ لیکن ہنوز رنگ کی اس تبدیلی کی کوئی معقول وجہ دریافت نہیں ہو سکی۔

(ناظم میرٹھی)

دستخط بعض ناظرین کرام خط لکھتے وقت سارا زور قلم دستخط کو پیچیدہ بنانے میں صرف کر دیتے ہیں حالانکہ نام اور پتہ خوشخط ہونا چاہیئے۔ (منیجر)

نئے غنچے

(جناب عبدالحمید صاحب حیدر کشمیری بہرام پور)

سرِ بازار جلوہ ریزیاں ہوتی ہیں لڑکوں کی — بجائے بام اب جاگی ہوئی قسمت ہے سڑکوں کی
بڑھاتی صنفِ نازک کو پرے انکی نزاکت ہے — اگر آنکھوں میں شوخی ہے تو ہونٹوں میں حلاوت ہے
کبھی بالوں کا ماتھے پر معطر دام ہوتا ہے — کبھی ترچھی نگاہوں سے بھی قتل عام ہوتا ہے
بہاریں کیا دکھاتی ہے گھڑی نازک کلائی پر — ہزاروں آفتیں قربان ان کی کج ادائی پر
کبھی ہو درد سران کو تو فیشن دار ہوتا ہے — کہ جس کا ریشمی رومال سے اظہار ہوتا ہے
ذرا سا مونہہ پہ پوڈر جو سنورتے وقت ملتے ہیں — تو دل عشاق کے سینوں میں پھر کیا کیا اچھلتے ہیں
بوقت شام جوڑا جوڑا ہو کر سیر کرتے ہیں، — نگاہیں لڑتی ہیں جذبات سینوں میں ابھرتے ہیں
قدم کس کس نزاکت سے وہ چلتے وقت دھرتے ہیں — لچکتی ہے کمر ہر گام پہ کالر سنورتے ہیں!
نگاہ ناز سے عشاق کو تکتے بھی جاتے ہیں — زباں سے عشقیہ اشعار بھی کچھ گنگناتے ہیں
نگاہیں چار کر کے زیر لب کچھ مسکراتے ہیں، — سرِ بازار بجلی چاہنے والوں پر گراتے ہیں
جبیں پر مانگ سگرٹ ہاتھ میں اور پان مونہہ میں ہے — نئے غنچوں کی کچھ ہاتھوں میں کچھ پہچان مونہہ میں ہے

یہ سب کچھ ہے مگر حیدرؔ ہا یہ کیا ان کے ہی لڑکے ہیں
کبھی جوبن کے بجلی دشمنوں کے سر پہ کڑکے ہیں

قطعہ

حضرت سائل ——— دھلوی

دہنیا نہ چوپٹ ہے تہجد کو ہوئی چوری! — نرے ٹوٹے ہوئے شیشے فقط جھوٹے پیالے ہیں
بگماں کس پہ کریں میکش؟ ادھر واعظ ادھر صوفی — خدا رکھے محلہ میں سب ہی اللہ والے ہیں

THE "KAINAT" LAHORE.



[illegible]

مزاحیہ

(از ابوالغاث عطا صاحب متین)

میرزا صاحب

بڑے نیک، متقی، لمبی داڑھی۔ لمبا جبہ۔ ہر بات پر سبحان اللہ ہر بات پہ لاحول ولا۔ تھے تو دیہاتی مگر بڑے ہوشیار۔ لوگ تو انہیں مولوی سمجھکر پردہ بھی اپنے گھروں میں ضروری نہ سمجھتے تھے لیکن وہ ناواقفانہ نظریں ڈالنے سے کبھی نہ چوکے۔ ایک دن کسی اللہ کے نیک بندے نے مرزا کی دعوت کر دی۔ بس پھر کیا تھا سسرے کی لونڈیا کی شامت آگئی۔ اس بھلے آدمی نے تو یہ سمجھا کہ سارا گاؤں مرزا جی کی ولیوں کی سی عزت کرتا ہے میں اس ذرا سی بچی کا جوا بھی پورے طور سے سن بلوغت کو بھی نہیں پہنچی کیا پردہ کراؤں۔ مگر مرزا صاحب تو نہ قدا نہ نظریں پھینکنے کے عادی تھے اور حسن کے کچھ ایسے بھوکے تھے جیسے ان کے گاؤں میں اگر حسن کا ہمیشہ سے کال رہا ہو۔

کھانے کے دوران میں کئی دفعہ جنت (لڑکی) نے مرزا جی کو پانی پلایا ایک آدھ دفعہ یوں بھی تواضع کے طور پر اس نے دریافت کیا "حضرت صاحب! بی بی جی (ماں) پوچھتی ہیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو حاضر کردوں"۔۔۔۔ کھانے سے فراغت پاکر مرزا جی نے اپنی توند پہ ہاتھ پھیرنے کے بجائے لڑکی کے سر پیشانی اور منہ پر ہاتھ پھیر کر برکت دی اور اس کے حق میں دعا کی کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ جنت کو دین اور دنیا میں جنت کی سی زندگی عطا فرمائے۔ اس کے باپ سے کہا کہ کبھی کبھی اپنے گھر کے بیچ میں وعظ بھی کرایا کرو تاکہ برکت نازل ہو۔ اس نے عقیدتمندانہ انداز میں سر ہلایا اور مرزا جی کو رخصت کیا۔

(۲)

معیار حسن پر ایسی کانٹے کی تول پوری اتری ہے کہ تِل گھٹے نہ رائی بڑھے۔ ایک ہمارے گھر میں ہے کہ جیسے اچھا دودھ دینے والی بھینس۔ کہاں وہ "رمانٌ ضغارٌ" اور کہاں یہ پلپلے خربوزے بھلا کوئی مقابلہ ہے؟ لاحول۔۔۔ استغفر اللہ۔ ابھی اس کا تو نام ہی جنت ہے۔ ایک یہ بیگم صاحبہ ہیں جیسے گھر میں دوزخ نہل رہی ہو آج پورے آٹھ دن گزر گئے لیکن اس کے باپ نے ابتک وعظ کے لئے بھی نہیں بلایا۔ بالکل بے دین ہو گیا۔

مرزا صاحب اپنے گھر میں بیٹھے اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے اور انکی بیگم جو نہایت ہی منکسر اور وفا شعار تھی کبھی مرزا صاحب کے کمرے کی طرف جا نکلتی تو تو نے آتے ہی گھمانا شروع کر دیتے اور اس سے کہتے کہ بار بار تمہارے آنے سے میرے وظیفہ میں خلل پڑتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کے لڑکے نے ایک خط لا کر دیا جسے پڑھکر مرزا جی کی باچھیں کھل گئیں۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کیا اور خوشی کے مارے تھرکنے لگے۔ یہ خط جنت کے باپ کا تھا جس نے مجلس وعظ کی تاریخ مقرر کرکے مرزا جی کو مدعو کیا تھا۔

(۳)

آج جنت کا گھر بہت آراستہ بنا ہوا ہے چھتی چھپی چاندنیاں بچھی ہوئی ہیں۔ سامنے ایک تخت بچھا ہوا ہے جس پر گاؤ تکیہ۔ خاصدان کھولے رکھے ہوئے ہیں۔ گھر والے زرق برق لباس پہنے ہوئے ہیں وعظ شروع ہوتے والا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ جب تک حاضرین جمع ہوں کھانے سے فراغت حاصل کر لی جائے۔ چنانچہ مکان کے ایک خاص کمرے میں کھانے کا بندوبست کیا۔ آج کھانے پر مرزا جی کے علاوہ جنت کا باپ، چچا، ماموں اور خالو بھی شریک تھے۔ جنت آج بھی بے تکلف سب کے سامنے آجا رہی تھی۔ اس کے ہر قدم اور قدم کی ہر آہٹ پر مرزا صاحب کا دل بلیوں اچھلنے لگتا اور کسی نہ کسی بہانے سے وہ ایک چھچھلتی سی نظر اس کے جمال دلگداز پر ڈال ہی دیتے۔

اب چونکہ بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے اس لئے وعظ شروع ہوا مرزا صاحب نے اپنے وعظ میں جس بات پہ سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھی کہ تمام مسلمان اپنی اپنی جوان لڑکیوں کی جلد شادی کر دیں۔ جو لوگ اپنی لڑکی کے لئے مالدار شوہر تلاش کرنے کی خاطر دیر کریں گے اور اپنی بالغہ لڑکی کی شادی جلد نہ کریں گے انکے سر پر سرخیہ ایک خون کا عذاب ہوگا۔ ان کے گھروں میں بے برکتی پھیلے گی۔ وہ خدا کے قہر و غضب میں مبتلا ہوں گے۔ شوہر کا انتخاب دینداری سے کرو بیدین شوہر کسی کام کا نہیں دینی علم رکھتا ہو۔ نیک اور ایماندار ہو لیکن کالی ہو

غرض سارا وقت اسی موضوع پر صرف کر دیا۔ اگر کچھ اور فرمایا بھی تو اس کا آخری بند اسی موضوع پر ختم ہوا۔

مجلس برخاست ہوئی۔ شیرینی تقسیم کی گئی۔ سب لوگ چلے گئے مگر مرزا صاحب بیٹھے رہے۔ رات زیادہ جا چکی تھی۔ وہیں ان کے سونے کا انتظام کر دیا گیا۔ مرزا صاحب رات بھر جگتے ہی رہے کبھی سوچتے کہ صبح کو سوال کر دوں۔ کبھی کہتے کہ نہیں گھر پہنچکر وہاں سے کسی عورت کی معرفت سوال بھیجنا مناسب ہے۔ رات بھر اسی ادھیڑبن میں گزر گئی۔ صبح کو جنت کے ہاتھ کی چائے پی کر اور اس کے سر پر برکت و شفقت کا ہاتھ پھیر کر مرزا جی اپنے گھر چلے آئے۔

لڑکی نے گھر میں جا کر ماں سے کہا کہ اماں مرزا جی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔

ماں۔ تجھے کیسے معلوم ہوا؟

جنت۔ ہر دفعہ میرے سر پر ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ دعا دیتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔

ماں۔ کیا باتیں کرتے ہیں؟

جنت۔ یہی کہ تم اچھی ہو؟ کیا پڑھتی ہو؟ ہم پڑھنے والی لڑکیوں سے خوش ہوتے ہیں۔

باپ۔ ہاں بیٹی وہ نیک آدمی ہیں۔ اچھی باتوں سے خوش ہوتے ہیں۔

ماں۔ . . . . .

ماموں۔ سن ری جنتہ! اگر اب کبھی تو مرزا کے سامنے گئی تو تیرا سر توڑ دونگا۔

باپ۔ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ ایسا نیک آدمی ہے کہ لوگ اس کے ہاتھ چومتے ہیں۔ مولوی ہے مولوی۔ اسے اپنے گاؤں میں جا کر دیکھو کیسی عزت ہے۔ جیسے عیسیٰ مسیح آسمان سے اتر آیا۔

ماموں۔ ہم نے بہت مولوی دیکھے ہیں جی۔ بس آج سے بعد کبھی جنت مرزا کے سامنے نہ جائے۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ کھانا کھاتے میں بھی وہ رشیا ئیل بار بار لونڈیا کی طرف دیکھتا تھا۔ اور رات کے وعظ میں بھی کچھ اشارے تھے . . . .

ماں باپ۔ اچھا بھیا تم ناراض کیوں ہوتے ہو ہم اب پردہ کر دینگے جنت! اب تم مرزا جی سے پردہ کیا کرو۔

(۴)

مرزا جی نے اپنے نکاح کا پیغام بھیجا تو جنت کا ماموں اتفاق سے موجود تھا۔ پیغام سنکر آگ بگولہ ہو گیا۔ بہن سے کہا۔ دیکھا تم نے اس خبیث کو؟ کہاں یہ چودہ برس کی معصوم بچی اور کہاں وہ پچاس برس کا ابلق پرانا خرانٹ! (مرزا جی کی داڑھی کھچڑی تھی۔) نائن نے کہا کہ میاں ابھی تو مرزا جی کی عمر پورے چالیس برس کی بھی نہیں ہوئی تم پچاس برس کہہ رہے ہو۔ بکواس مت کرو۔ اس سے کہدینا کہ اگر اب ہمارے گاؤں کی طرف رخ کیا تو چندیا صفا ہو جائیگی۔

نائن نے جو یہ رنگ دیکھا تو الٹے پاؤں واپس لوٹ گئی۔ اور مرزا صاحب سے جا کر سارا ماجرا کہہ ڈالا۔ اس جواب کا اثر مرزا صاحب پر وہی ہوا جو ایک عاشق ناشاد پر ہونا چاہیے تھا۔ انہیں اب ہر وقت جنت کا تصور رہنے لگا۔ قاعدہ ہے کہ جس بات کا دن بھر انسان کو تصور رہے وہی سوتے میں بھی دیکھ لیتا ہے۔ چنانچہ مرزا جی نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ جنت سے میرا نکاح ہو گیا ہے۔ صبح اٹھتے ہی انہوں نے جنت کے باپ کو بلا بھیجا۔ وہ غریب ابھی تک کچھ نہ کچھ عقیدت رکھتا تھا فوراً آیا۔ مرزا جی اسے مسجد میں لے گئے اور کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے قسم کھائی کہ مجھے خدا کی طرف سے بشارت دی گئی ہے کہ جنت میرے نکاح میں آئے گی۔ لہذا بہتر ہے کہ تم خدا تعالےٰ کا منشا پورا کرنے کے لئے اپنی لڑکی کا نکاح میرے ساتھ کر دو۔"

جنت کے باپ نے کہا کہ یہ کام اگر صرف میرے کرنے کا ہوتا تو میں ہرگز آپ کی بات کو نہ ٹالتا مگر چونکہ اسے اس کے ماموں نے بیٹی کیا ہے اس لئے اسی کو کلی اختیار بھی ہے۔ ہرچند کہ ترغیب و ترہیب سے کام لیا گیا مگر اس نے اقرار ہی نہیں کیا۔ آخر مرزا جی نے صاف کہدیا کہ اگر تم خدا کے منشا کو پورا کرنے سے سرکشی اختیار کرو گے تو تمہیں سخت نقصان پہنچے گا۔

(۵)

مرزا جی کی جب ساری کوششیں ناکام ہو گئیں اور کسی بشارت اور پیشگوئی نے کام نہ دیا تو آپ نے شہر در شہر وعظ کے لئے دورہ کیا شاید کسی دوسری جنت کی جستجو کا آغاز منظور ہو یا اسی کے حصول کی تدبیر مد نظر ہو۔ بہرکیف جب وہ لاہور پہنچے تو بڑے دن کی تعطیلات ہو چکی تھیں

ایک رات اسلامیہ کالج کے چند بے فکرے سینما دیکھکر آرہے تھے اور مرزا صاحب زور شور سے وعظ فرمارہے تھے۔ وہ بھی ذرا ٹھیر کر وعظ سننے لگے۔ ایک نوجوان ان میں سے جنت کا ہم وطن تھا اسے مرزاجی کی ساری عاشقی معلوم تھی۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ ان حضرت واعظ کی گت بنانی چاہیئے۔ چنانچہ قرار پایا کہ انہیں مہمان رکھا جائے۔ وعظ ختم ہونے پر یہ پارٹی سٹیج پر پہنچی۔

ایک۔ السلام علیکم

مرزا۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

دوسرا۔ (مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے) مزاج اچھا ہے۔

تیسرا۔ (ہاتھوں کو بوسہ دیکر) حضور میرے ہاں مہمان رہیں تو اس عاجز پر احسان عظیم فرمائیں۔

چوتھا۔ نہیں حضور پہلے میرے گھر۔

پانچواں۔ نہیں پہلے میرے ہاں۔

مرزا۔ بھائی تم آپس میں فیصلہ کرلو۔ میں حاضر ہوں۔

قرار پایا کہ اس عزت کا مستحق وہی ہے جس نے سب سے پہلے مدعو کیا۔ (حالانکہ سارے منچلے ایک ہی مکان کے مختلف کمروں میں رہتے تھے۔)

مرزا صاحب خوشی خوشی ان کے ساتھ ہوئے۔ ایک کمرہ میں مرزا صاحب کے ٹھیرنے کا انتظام کیا گیا۔ باقی کمروں میں میزبانوں نے آرام کیا۔ دوسرے دن سب ملکر حاضر خدمت ہوئے اور ان میں سے ایک نے رازدارانہ انداز میں کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔

مرزا۔ (اپنے میزبان سے) تم کہاں پڑھتے ہو؟

میزبان۔ گورنمنٹ کالج میں۔

مرزا (دوسرے سے) اور تم؟

دوسرا۔ گورنمنٹ کالج۔

مرزا۔ (باقی سب کی طرف دیکھکر) اور بھئی تم؟

سب۔ گورنمنٹ کالج

اب مرزا صاحب نے کہا کہ کہو بھئی کیا کہتے ہو۔

پہلا۔ حضور ایک راز کی بات ہے کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ میں فلاں گاؤں میں رہتا ہوں اور وہاں ایک خاندان میں شادی کرنا چاہتا ہوں اگر حضور کی دعا سے میرا یہ کام ہوجائے تو ایک سو روپیہ نذر کرونگا۔

مرزا۔ میں پکا اقرار تو نہیں کرتا مگر ہاں وہاں میرے بہت سے واقف اور معتقد رہتے ہیں تم لڑکی کے والدین کا نام، پتہ وغیرہ مفصل بتاؤ تو پھر کچھ کوشش ہوسکتی ہے۔

پہلا طالب علم۔ حضور لڑکی کا نام جنت بی بی اور اس کے باپ کا نام........

مرزا۔ ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ وہاں تمہاری شادی نہیں ہوسکتی

پہلا۔ کیوں حضرت ایسے وہ کہاں کے ....

مرزا۔ بھائی بات یہ ہے کہ اس لڑکی کا نکاح ہوچکا ہے۔

پہلا۔ ہرگز نہیں۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے۔

مرزا۔ تمہارا علم غلط اور خدا کا علم سچا ہے۔ اس کا نکاح ہمارے ساتھ عرش پر ہوچکا ہے اور اس کی بشارت ہمکو پہنچ چکی ہے۔

پہلا۔ تو پھر وہ بحیثیت بیوی آپ کے گھر میں کیوں نہیں؟

مرزا۔ اس کا ایک ماموں ہے جاہل بیدین وہ ظاہری نکاح میں مانع آرہا ہے۔ ورنہ اب تک ہو بھی چکا ہوتا۔

بات اس سے آگے نہ بڑھی اور سب اٹھکر چلے گئے۔ دوپہر کے کھانے پر پھر سب جمع ہوئے اور بعد طعام ایک کے سوا سب رخصت۔ اس نے مرزاجی سے کہا کہ کچھ اور بھی سنا؟

مرزا۔ کیا ہوا؟

طالب علم۔ وہ نالائق کہہ رہا تھا کہ مرزا صاحب نے میرا کام تو نہیں کیا ہے۔ میں بھی یہاں سے جاکر اس لڑکی کے ماں باپ اور ماموں کو خوب بہکاؤنگا تاکہ مرزاجی کا عرشی نکاح عرش ہی تک محدود رہے۔ فرش تک نہ آنے پائے۔

مرزا۔ (آنکھیں پھاڑکر) ہائیں!!! یہ منافقت؟!! پھر؟

شریر طالب علم۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نالائق سے پہلے ہی اس کے گاؤں پہنچکر لڑکی کو نکال لائیں۔ یہاں لاکر اس کا نکاح آپ کے ساتھ کردیا جائے۔

مرزا۔ یہ تو خلاف قانون وخلاف... اخلاق حرکت معلوم ہوتی ہے۔

شہیر - ابھی نکاح سے پہلے جیسا بُرا چاہو سمجھ لو - نکاح کے بعد نہ خلاف قانون ہے نہ خلاف اخلاق اور نہ شاید خلاف مذہب

مرزا - اچھا رات کو استخارہ کرکے کل جواب دونگا -

شہیر - بہت اچھا . . . لیکن واضح رہے کہ وہ آپ کا رقیب بھی جلدی ہی دلھن جانے والا ہے -

مرزا - اچھا اچھا ... کل سویرے ہی سب کچھ بتا سکونگا -

(۶)

بھئی رات کے استخارہ میں صاف صاف حال تو معلوم نہ ہوسکا لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ کامیابی ہی کی طرف اشارہ ہے -

شہیر - حضرت آپ نے دیکھا کیا ؟ خواب میں معلوم کیا ہوا ؟

مرزا - میں نے دیکھا کہ "چند لڑکے میرے ساتھ کھیل رہے ہیں اور جب غور سے دیکھا تو ایک لباس عروسی میں تھا -" اس کی تعبیر یہ ہے کہ تم اسے یعنے جنت کو میرے لئے لانے میں کامیاب ہوجاؤگے اور اس کے بطن سے بیٹے ہی بیٹے پیدا ہونگے - کیونکہ جب تک ایسا نہ ہو لڑکوں کا میرے ساتھ کھیلنا تعبیر طلب رہ جاتا ہے -

شہیر - بس بس ٹھیک ہے - میں ابھی اپنے ایک دوست کے ساتھ جانے کی تیاری کرتا ہوں مگر میرزا صاحب اس مرحلہ کے لئے کم از کم بیس روپے بکار ہونگے -

میرزا - بیس کس کے لو یہ پچیس روپے ہیں مگر دیکھو ہمارا نام کہیں نہ لینا -

شہیر - نہیں حضرت! آپ کا نام صرف دل میں لونگا تاکہ اس کی برکت سے کامیابی نصیب ہو -

(۷)

آگئی! آگئی!! مرزاجی آگئی - سنا صاحب آگئی - ابھی آگئی

مرزا - چُپو چُپو - خاموش - خاموش - خدا کی مشیت پوری ہو رہی ہے - شور مچانے کی بات نہیں ہے - ایسا تو ہونا ہی تھا -

ایک - اب کیا کریں ؟

دوسرا - مرزاجی کا نکاح !

میرزا - کہاں اتروا دیا ؟

شہیر - بھابی جان کے گھر -

مرزا - نکاح کے لئے کیا وقت مقرر کرنا چاہیئے -

شہیر - اجی صاحب کوئی وقت مسنون مقرر کیجئے - بھابی جان کہتی تھیں کہ شام سے پہلے پہلے دلھن بنا کر حجلۂ عروسی میں پہنچا دونگی -

مرزا - بس پھر بعد نماز مغرب نکاح کا وقت مناسب ہے -

(۸)

مبارک ! مبارک !! سلامت ! مرزا صاحب جنت مبارک! ہر طرف سے مبارکباد کی صدائیں آرہی ہیں - شیرینی تقسیم کی جارہی ہے پھول برسائے جارہے ہیں - ہار پہنائے جارہے ہیں - پھبتیاں کسی جارہی ہیں - مذاق کئے جارہے ہیں - مرزا صاحب پھولوں کا سہرا باندھے بیٹھے ہیں اور پھولے نہیں سماتے - ایک نوجوان نے کہا :-

"بس اب مرزا صاحب کو اندر جانے دیجئے" - دوسرے نے مرزا جی کا ہاتھ پکڑ کر حجلۂ عروسی تک پہنچا دیا - مرزاجی نے کمرہ میں گھستے ہی دروازہ بند کرلیا - یاران طریقت نے باہر سے مقفل کر دیا -

مرزا - (دلھن سے) میری پیاری جنت !

دُلھن - ہاں میرے پیارے جہنم !

مرزا - ہائیں یہ کیا کہہ رہی ہو عزیز از جان - میں تو تمہارے عشق میں دیوانہ ہوگیا -

دُلھن - اُوں اُوں (رونے کی سی آواز بنا کر) تم نے تو میرے اوپر ظلم کیا ہے -

مرزا - نہیں نہیں پیاری تمہارے اوپر اور ظلم ! اور پھر میں کرتا! یہ کہکر مرزا صاحب نے "فرائض وقت" کی ادائیگی کے ارادہ سے مصافحہ کیا تو اچھل پڑے ! . . . . . وہ ہاتھ جنت کے بجائے داروغۂ جنت کا تھا - یعنے وہی چوڑا چکلا لمبا تڑنگا - ہٹا کٹا موٹا تازہ رقیب روسیاہ دلھن کے بھیس میں جلوہ گر ہے - مرزا صاحب ہاتھ چھڑانے کی بہتیری کوشش کرتے ہیں مگر بے سود -

مرزا - ارے شیطان لعین میرا ہاتھ چھوڑ دے -

رقیب - میں تمہاری دلھن ہوں - اور آج تخت رات ہے - سنا پیارے!

مرزا - ہٹ ! نالائق - گدھا کہیں کا - ماردونگا الّو کے پٹھے اچھوچھو -

رقیب - میں تو آج کی شب ضائع نہ جانے دونگی - مرزا - دیکھ زیادہ مت ستا - مردود ازلی مان جا - رقیب - دلھن سے ایسی باتیں! وہ بھی پہلی رات کو!! آبھی جاؤ پیارے - باہر سے فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور اس شرط پر مرزا کو نجات ملی کہ آئندہ بھولے سے بھی جنت کا نام نہ لے گا - (ابوالفاتح - متین)

ہیئتِ اجتماعی کی پائیداری

(رقم فرمودہ فخر مشرق علامہ جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ (مترجمہ) ـــــ جناب مظفر حسین شمیم رکن ادارہ "انقلاب" لاہور)

زمانہ قدیم سے مذاہب کے سبب انسان میں تین اعتقاد موجود ہیں ۔ ان میں سے ہر عقیدہ قوموں کی مضبوطی اور ہیئت اجتماعی کی پائیداری کے لئے لابدی اور مدنیت و ترقیات امم و قبائل کے لئے محکم بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہی عقائد ہیں جن سے وہ شر و فساد دور ہوتے ہیں جو جماعتوں کی تباہی کا باعث بنتے ہیں ۔ ان تینوں عقائد میں سب سے اول اور افضل یہ ہے کہ انسان زمین پر فرشتہ اور اشرف المخلوقات ہے دوسرا یہ کہ اپنا مذہب بقیہ تمام مذاہب سے اچھا ہے اور اپنے مذہب کے سوا دوسرے مذاہب باطل ہیں ۔ تیسرا یہ کہ انسان اس دنیا میں کماحقہ کمالات حاصل کرنے آیا ہے ۔ اور اس دنیائے تنگ و تاریک سے ایک ایسی دنیا میں منتقل ہو جائے گا جو دنیائے آب و گل سے افضل و اعلیٰ ہے اور جسکے سامنے موجودہ دنیا کو بیت الاحزان کہنا بجا اور درست ہے

ان عقائد ثلاثہ کے ان مہتم بالشان تاثرات سے غافل نہ ہونا چاہئے جو ہیئت اجتماعیہ میں ظاہر ہوئے اور جن سے مدنیت کو بڑے بڑے فائدے پہنچے ۔ ان میں سے ہر عقیدہ گویا قوموں کے روابط، نوع انسانی کی بقا، افراد کی زیست اور انہیں آپس میں مسالمت و مصالحت سے رکھنے کا ضامن ہے

انسان کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے چنانچہ وہ حیوانہ خصلتوں سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھکر ان سے نفرت کرتا ہے ۔ بلاشک یہ اعتقاد جتنا زیادہ محکم ہوتا جائے گا ۔ یہ حجاب اور زیادہ بڑھتا جائے گا ۔ جس قدر یہ حجاب بڑھتا جائے گا ۔ اور انسان ترقی عقل کے مطابق مدارج مدنیت میں ترقی و عروج حاصل کرے گا اسی قدر اس متمدن جماعت میں سے وہ فرد جو فاضل ہوگا اپنے بھائیوں کے ساتھ محبت حکمت اور انصاف کا برتاؤ کریگا ۔

یہی حکما کی غایت مراد اور انسانیت کی معراج سعادت ہے ۔ یہی اعتقاد انسان کو چوپایوں کی طرح زندگی بسر کرنے اور جانوروں کی طرح عیش کرنے سے روکتا ہے ۔ اور یہی عقیدہ انسان کو صفات خسیسہ و دنیۃ سے باز رکھتا ہے اور قوائے عقلیہ کے استعمال میں بہترین مشیر کا کام دیتا ہے ۔ غور کرو اگر یہ عقیدہ قوموں اور جماعتوں میں نہ ہو بلکہ یہ اعتقاد ہو کہ انسان جانوروں سے پست تر ہے تو پھر انسان سے کتنے بُرے کام اور کیسی کیسی شرارتیں ظہور میں آئیں گی ۔

اس یقین کا کہ اپنی قوم جملہ اقوام سے بہتر ہے ۔ اور ماسوا سب باطل ہیں ۔ یہ نتیجہ نکلے گا کہ ایسا عقیدہ رکھنے والا شخص تمام قوموں سے بحث و مقابلہ کے لئے تیار ہو جائے گا اور ان سے ہمسری کے لئے تن کر کھڑا ہو جائے گا ۔ اور میدان فضائل میں سب سے آگے بڑھنے کے لئے کوشاں ہوگا ۔ وہ اپنی قوم کا انحطاط اور اس کی ذلت و درماندگی سے کبھی خوش نہ ہوگا ۔ کیونکہ اس اعتقاد کی بدولت کہ اپنی قوم جملہ اقوام سے بہتر ہے وہ یہ سمجھیگا کہ ان فضائل کی سزاوار میری قوم ہے ۔ ایسا شخص ایسے تمام کاموں کو جن میں فضیلت ۔ مدنیت اور شرف ہو اپنی قوم کا حق سمجھیگا ۔ اگر خارجی اثرات کیوجہ سے اپنی قوم میں فضائل کے کسی حصہ میں بھی کمی دیکھیگا تو اسے ہرگز راحت نہ ہوگی ۔ بلکہ جب تک وہ زندہ رہے گا اپنی قوم کے سنوارنے کی کوشش میں مصروف رہے گا ۔ پس یہ عقیدہ میدان مدنیت میں قوموں کو مقابلہ کا شوق دلانے کا سب سے بڑا ضامن اور طلب علوم و معارف اور صنعتیں سیکھنے پر آمادہ کرنے کا سب سے بڑا محرک ہے ۔ اگر کسی قوم میں یہ اعتقاد نہ ہو تو فضائل حاصل کرنے کی راہ میں بیشمار مشکلات پیدا ہو جائینگی ۔ اور افراد قوم کی ہمتوں

یں لاانتہا پستی آجائے گی۔

تیسرا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں کمالات حاصل کرنے آیا ہے تا آنکہ وہ ایک ایسے عالم میں منتقل ہوجائے جو اس دنیا سے اعلیٰ و افضل ہے۔ جس شخص کا یہ عقیدہ ہوگا وہ ہمیشہ اپنی عقل کو معارف حقہ اور سچے علوم سے روشن کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اپنی عقل کو بیکار نہ ہونے دیگا۔ وہ یہ کوشش کرے گا کہ جو کچھ ودیعہ میں پنہاں ہے اسے قوت فعلیہ سے اچھے کاموں اور عمدہ خاصیتوں کے ساتھ پوری کوشش سے پردۂ عدم سے نکال کر منصۂ شہود پر جلوہ دے۔ اور تمام عمر اپنے نفس کو بُرے خصائل سے باز رکھے۔ ایسا شخص جھوٹ حیلہ بازی خیانت اور خوشامد سے پرہیز کرے گا اور صرف جائز راستوں پر چلے گا۔ اور باطل سے اجتناب کرے گا

پس یہ عقیدہ انسان کو مدنیت کی طرف دعوت دینے والا ہے اور ظاہر ہے کہ مدنیت کی بنیاد معارف حقہ اور اخلاق مہذبہ پر قائم ہے۔ اور یہ ہیئت اجتماعیہ کی تعمیر میں بہترین ستون ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو مختلف انسانی جماعتوں کو آپس میں امن و آشتی سے رکھتا اور ظلم و ستم سے نجات دیکر اعلیٰ تمدن کے عرش سعادت پر بٹھا دیتا ہے۔ خیال کرو اگر کسی جماعت میں یہ عقیدہ نہ ہو تو اس میں کس قدر شقاق و نفاق دروغ گوئی اور حیلہ سازی اور مجادلہ و مقابلہ شروع ہوجائے گا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ معارف حاصل کرنے میں بیحد سستی آجائے گی۔

(شمیم)

تخیلات

خود بخود بجنے لگے تار رباب کائنات
ہوگیا حل عقدۂ باب کتاب کائنات

بلاشبہ دنیا ایک معمہ اور کائنات کی ہر شے ایک سربستہ راز ہے.... دیکھو میں کس قدر غیر مطمئن ہوں۔ میری تمنائیں کائنات کو اپنی آغوش محبت میں لینا چاہتی ہیں۔ اس کی دلفریبیاں مجھے مغلوب کر لینا چاہتی ہیں۔ لیکن... میری ایسی گوشہ نشین اور تنہائی پسند ہستیاں ہمیشہ اس سے اور اس کی دلفریبیوں سے دور رہتی ہیں کیونکہ دنیائے دنی کی اکثر دلچسپیاں مکر چاندنی سے زیادہ پُر فریب اور زیادہ ناپائیدار ہوتی ہیں۔ روشن آفتاب بھی چاند کی طرح ستم ظریف اور فریب دہی میں چاند کا استاد ہے۔ چاند اپنی مکر چاندنی سے مسافر معصوم اور بھولے بھالے مسافر کو صبح صادق کی جھلک دکھاتا ہے اور اسے بیوقت بلکہ پُر خطر وقت میں منزل چلنے اور مسافت طے کرنے پر مجبور کرتا ہے تو سورج اپنی مکار شعاعوں کا جال ریگستانوں میں بچھا کر گرم و خشک ریت کے ذرات کو موجیں مارتا ہوا دریا ظاہر کرتا ہے اور پیاسے مسافر کو رفع تشنگی کے بہانہ سے دور تک منزل چلاتا اور مایوسی کے زہر ہلاہل سے اس کی تشنگی کو اور زیادہ شدید بنا کر ہنسنے لگتا ہے۔ لیکن کائنات پھر بھی مجسمۂ اعتبارات اور دلفریبیوں کا سرچشمہ ہے

اے کائنات تو کیوں اس قدر دلکش ہے۔؟

اے کہ تو شب زندہ دار کائنات حسن ہے، تیرے پیکر سے نمایاں انبساط حسن ہے

اے میرے خیالات یہ کیا ہے۔ کائنات آئینۂ حیات ہی یا ہنگامۂ جذبات؟

کتنی ہے کائنات کی ہر شے — خاکدان حیات کی ہر شے
آچلیں وادی محبت میں — شورش آباد حسن و الفت میں

کائنات کی گتھیوں میں الجھنے والے تخیل! پہلے یہ تو بتا کہ میں خود کیا ہوں؟ یا یہ حیات؟ رازدار کیفیات؟ مجسمۂ تصورات؟ کشتۂ تیغ حیات؟ یا زیر مشق الزامات؟ آخر کیا؟ ———؟——— ؟!

موتیا کی کلیوں نے ہنسکر، کھلکھلا کر، قہقہہ لگا کر میری طرف دیکھا، اور کہا: بہن ایس حسن یہ کائنات ہے!! اور تو گلشن کائنات کی ایک راز جو مالن! اگر تیری جستجو بیکار ہے اس راز کو کس نے پایا ہے

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو ؛ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمہ را

(مس ایس احمد حسن۔ حیدر آباد دکن)

تمہاری یاد

(از قلم جناب احسان بن دانش مصنف حدیث ادب)

بہار کی ایک دوپہر تھی شجر جوانی پہ آ رہے تھے ۔ گلوں کے جھرمٹ پہ مست بھونرے فضا میں حلقے بنا رہے تھے
روش پہ شیشے کے چند ٹکڑے پڑے ہوئے جگمگا رہے تھے ۔ حسین کلیوں کے ننھے سائے زمین پر تھرتھرا رہے تھے
زمانہ محوِ طرب تھا لیکن مجھے تمہیں یاد آ رہے تھے

وہ چار سو حسن برشگالی وہ سرمئی جھومتی گھٹائیں! ۔ وہ جنگلوں میں گھنے درختوں پہ مست طاؤس کی صدائیں
ڈھلی ہوئی کونپلوں سے پیدا حریفِ ہوش و خرد ادائیں ۔ وہ دور تک نرسلوں کا خطہ وہ سنسناتی ہوئی ہوائیں
زمانہ محو طرب تھا لیکن مجھے تمہیں یاد آ رہے تھے

وہ بابِ میخانۂ سحر پر جھکا ہوا فرقِ پارسائی ۔ وہ بھیگی بھیگی سی زرد کرنیں پٹی ہوئی دھند سے ترائی
وہ جھیل میں فرشِ بجلیوں کا وہ گھاٹ پر شانِ دلربائی ۔ وہ دور رنگیں بطوں کے جوڑے وہ چو طرف حاشیہ پہ کائی
زمانہ محوِ طرب تھا لیکن مجھے تمہیں یاد آ رہے تھے

وہ صبحِ صادق کی روشنی میں چناب کا جھٹپٹا کنارا ۔ زمیں پہ شبنم کی جھلملاہٹ فلک پہ ہنستا ہوا ستارا
گھٹی ہوئی سوزشوں کی حدت چڑھا ہوا عشرتوں کا پارا ۔ وہ تلملاتی ہوئی سی موجیں وہ گنگناتا ہوا سا دھارا
زمانہ محو طرب تھا لیکن مجھے تمہیں یاد آ رہے تھے

وہ شامِ زریں کہ تھی تصدق نقوشِ فطرت پہ روحِ مانی ۔ طیور نغمے الاپتے تھے نتھر رہا تھا ہوا سے پانی
وہ چرخ پر سرخ سرخ بادل وہ پھول کھیتوں میں آسمانی ۔ زمیں پہ جادو جگا رہی تھی فلک سے برسی ہوئی جوانی
زمانہ محو طرب تھا لیکن مجھے تمہیں یاد آ رہے تھے

چھینک

اچھیں

(از جناب ہما صدیقی (جھانسی))

عورت اگر کسی مرد کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جائے تو پھر غریب مرد کو غالباً وہ تحت الثریٰ میں بھی چھوڑنا پسند نہ کرے گی۔ اس کے "پنجہ نرم" کی گرفت سے مرد کی گلو خلاصی اس وقت تک ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے جب تک کہ مرد صاف الفاظ میں اعتراف شکست نہ کر لے۔

یوں تو لوگوں کی زبان ہے جو جی چاہے کہہ لیں مگر حقیقت الامر یہ ہے کہ آج کے معرکہ میں خالو جان کا کوئی قصور نہ تھا خالہ بی خواہ مخواہ الجھ پڑیں۔ خالو ہزار "بے بہادر" سہی مگر پھر بھی مرد تھے۔ خالہ سے دب جانا ان کی کھلی توہین تھی جس کو وہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اور نہ انہیں دبنے کی کوئی ضرورت تھی۔

بات دراصل یہ تھی کہ خالو جان ناشتہ کے بہت سختی سے پابند ہیں جاڑا۔ گرمی۔ برسات کوئی موسم ہو۔ گھر باہر۔ دیس پردیس کوئی جگہ ہو خالو جان کا ناشتہ ناغہ نہ ہوتا تھا خالہ بھی ان کے ناشتہ کا پابندی سے انتظام رکھتی تھیں۔ خالو خود کہتے تھے کہ رمضان شریف میں روزہ داروں کی تکلیف اور پریشانی، افطار کے قریب زیادہ بڑھ جاتی ہے مگر مجھ کو تو صرف صبح نو دس بجے تک کا وقت گزارنا فرہاد کے جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔" ایسی صورت میں جب خالہ بی خاندان کی ایک شادی میں شرکت کے لئے جانے والی تھیں تو خالو نے چار دن پیشتر ہی کہہ دیا تھا کہ دیکھو میرے ناشتہ کا معقول انتظام کرتی جانا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم خستہ خرمے ہی بنا کر رکھ جانا۔ خالو کی رائے صائب اور بات معقول تھی ع

ہم سخن فہم ہیں خالو کے طرفدار نہیں

خالہ بی کو ضرور انتظام کر کے جانا چاہیئے تھا۔ مگر بھئی انسان ضعیف البنیان پھر انسان ہے۔ بھول چوک اس کی گھٹی چھوڑ خمیر میں پڑی ہے۔ ہونیوالی بات تھی شادی کی تیاری کی گڑبڑ میں خالہ کو نہ تو یاد ہی رہا اور نہ اتنی فرصت ملی کہ خرمے بنا کر رکھ جاتیں۔ خالو کو ناشتہ کا انتظام نہ ہو سکنے کا اتنا ملال نہ تھا جس قدر اپنی بات خالی جانے کا۔

آج جب رات کے نو بجے والی گاڑی سے گھر کے سب لوگوں کے ساتھ خالہ بھی شادی سے واپس آئیں تو خالو پلنگ پر اوڑھے لپیٹے سر سے پیر تک چادر تانے سو تو گیا رہے تھے مگر سوتا ہوا ظاہر کرنے کی کوشش ضرور کر رہے تھے۔ خالہ بھی تاڑ گئیں اور وہ قصداً ضروریات سے فارغ ہو کر قریب ہی کے پلنگ پر جا لیٹیں۔ خالو نے جب دیکھا کہ تدبیر الٹ گئی اور معاملہ بگڑ گیا۔ تو بڑی دیر تک لیٹے لیٹے کوئی دوسری معقول تدبیر سوچتے رہے مگر دماغ میں ہزاروں خیالات کے ماسواء غصہ کا بھوت بھرا ہوا تھا کوئی قابل عمل تدبیر جاگ اٹھنے کی ذہن میں نہ آتی تھی۔

قضا را کہیں خالہ کو چھینک آ گئی "اچھیں" کی آواز کے ساتھ ہی خالو چونک پڑے اور اس طرح ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے جیسے چھینک نہ تھی کوئی بندوق چلنے کی آواز تھی جس کی گولی کانوں سے پار ہو گئی خالہ بھی گفتگو کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں کیونکہ شادی کے تمام واقعات خالو کو سنانا چاہتی تھیں

خالو۔ "کیا شور مچا رکھا ہے بس تم آئیں اور گھر میں گڑبڑ شروع ہوئی"

خالہ۔ (ذرا سا مسکرا کر) "تو کیا کوئی چھینکے بھی نہ؟"

خالو۔ "چھینکنے کو کون منع کرتا ہے۔ مگر ہر کام کا سلیقہ ہونا چاہیئے

ڈھنگ سے چھینکتے ہیں یہ نہیں کہ جیسے کسی کے سر پر لٹھ سا دے مارا "

خالہ " تو اب پیار سے چھینکنے کا طریقہ تم ہی بتا دو کوئی " خالہ نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی منہ میں دبا ہوا پان جو اب قریباً ختم ہو چکا تھا ایک طرف کو پھینک دیا۔

خالو " یہ انگڑائی لی جیسے آسمان کی طرف اڑنے کو پر تول رہی ہو۔ اور پان تھوکنے میں تو ساری سلیقہ مندی کے جوہر دکھا دیئے بس ایک چھینکنا ہی نہیں آتا سو وہ میں سکھا دوں۔ کیوں ؟ "

خالہ " اے توبہ تو ہوا کیا آخر۔ چھینکا ہی تو ہے میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا "

خالو۔ (ذرا تیز ہو کر) تو اگر تم کوئی جرم ہی کر ڈالو تو کوئی تمہارا کیا کر لیگا "

خالہ۔ نوج۔ میں کیوں کوئی جرم کرنے لگی " خالہ کو یہ کہتے کہتے ناشتہ کی یاد کے ساتھ ہی ساتھ کچھ ہنسی بھی آ گئی۔

خالو۔ (ذرا ڈپٹ کر) اور یہ ناشتہ کا انتظام کئے بغیر چلے جانا گویا کوئی جرم ہی نہیں تمہارے نزدیک ؟ "

خالہ " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (خاموش) ۔ ۔ ۔ ۔

خالو " ارے صاحب وجہ یہ ہے کہ جب کسی کو کوئی خیال ہو کسی کے آرام تکلیف کا۔ تو انتظام بھی کرے۔ تمہاری بیزاری سے کسی کو تکلیف ہو اور تمہاری پاپوش سے کسی کو ۔ ۔ ۔ ۔ "

خالہ۔ (بات کاٹ کر) " تو یوں کہو کہ اسی پر سارا غصہ تھا اور چھینکنے کا نام بدنام "

خالو " اور تمہاری پاپوش سے کوئی دن بھر بھوکا رہے " خالو نے جملہ پورا کر ہی دیا۔

خالہ " نہیں وجہ ساری یہ ہوئی کہ جانے کی جلدی میں فرصت نہ ملی " یہ گویا خالہ بی کی طرف سے ایک معذرت تھی۔

خالو " فرصت ملتی کیسے ؟ دن بھر سلائی میں لگی رہتی تھیں اور رات بھر آرام سے پاؤں پھیلا کر میٹھی نیند سوتی تھیں دونوں کام ضروری تھے۔ اور دونوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے چھوڑ کر ناشتہ کا انتظام کیا جا سکتا " خالو نے اتنا کہا اور پھر ایکدم بھویں سکوڑ کر آنکھیں ترچھی کر کے اور پورا چہرہ سوالیہ نشان بنا کر (؟) کہا " کیوں میں پوچھتا ہوں کہ رات کو آدھ گھنٹہ دیر میں سو کر ناشتہ نہ پکا سکتی تھیں آپ ؟ "

خالہ گردن نیچی کئے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوئی ایک پاؤں کے انگوٹھے اور اس کے پاس والی انگلی سے دوسرے پاؤں کی ایڑی کے اوپر کی کھال پکڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کہیں خالو کی نظر جا پڑی۔ بس پھر کیا تھا ۔ ۔ ۔

خالو۔ " یہ کیا حرکت ؟ تو میں بک رہا ہوں اور وہاں کوئی اثر ہی نہیں۔ گویا کسی اور سے کہہ رہے ہیں "

اب خالہ کو بھی تاؤ آ گیا۔ کیونکہ ان کی بات ٹالنے کی چوری پکڑی گئی تھی۔ بگڑ کر بولیں۔ " تو ہوا کیا اک ذرا سی بات کا طومار باندھ دیا تم نے تو "

خالو۔ (طنزاً) ذرا سی بات ! "

خالہ۔ ذرا سی نہ سہی اچھا وہ لاٹ صاحب سے بھی بڑی سہی مگر اب تو ہو چکی۔ اب کیا ہو سکتا ہے جو ہونا تھا سو ہو چکا قصور ہوا۔ غلطی ہوئی۔ ملزم ہوں۔ چور ہوں۔ خطا کار ہوں گردن زدنی ہوں۔ جو چاہو سزا دے لو مگر خدا کے لئے یہ تو تو میں میں بند کر دو "

خالو۔ میں بند کر دوں یا تم بند کر دو۔ میں تو خود اسی خیال سے کہ رات کا وقت ہے دھیرے بھی بولو تو دور تک آواز جائیگا اندیشہ ہے چپکا ہو کر سو رہا تھا۔

خالہ " تو پھر اٹھا کس نے دیا ؟ "

خالو (زور سے) " توپ کے گولے نے "

خالہ " وہ تو کہو کہ تمہارا دل اب کسی اور طرف آ گیا ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر نظر کرنے لگے ہو۔ تم تو اب بہانہ ڈھونڈتے ہو بہانہ ! ! "

خالو (قدرے تعجب سے) " بہانہ کس بات کا ؟ "

خالہ " یہی کہ مجھے چھوڑ دو اور کسی رنڈی منڈی کو گھر میں ڈال لو سو یہ کان کھول کر سن رکھو کہ ویسے تو میں خود ہی ان آئے دن کے جھگڑوں سے تنگ آ کر میکے جانا چاہتی تھی مگر یوں اپنے سینے پہ مونگ دلوانے کے لئے تو گھر سے باہر قدم بھی نہ رکھونگی "

خالو۔ (مستفسرانہ) بس اور کچھ جواب نہ بن پڑا تو ان باتوں پر اتر آئیں

بھلا بتاؤ تو سہی کہ کوئی سنتا ہوگا تو کیا کہتا ہوگا ۔

خالہ ۔ (چبا چبا کر) "کہتا کیا ہوگا ۔

خالو ۔" یہی کہ شرافت کا اعلیٰ نمونہ دیکھے جس نے نہ دیکھا ہو" خالو نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا ۔

خالہ (زچ ہوکر) "اچھا یہی سہی جو شریف ہو وہ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لے ۔"

خالو ۔" اور تم ہی نہ اپنی زبان کو لگام دے لو" یہ خالو نے گویا اپنی طرف سے آخری نقرہ کہا اور لیٹ گئے ۔

خالہ بھی خاموش ہوگئیں ۔ مگر دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں کہ اب کیا خاک شادی کا تذکرہ کروں ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے کونسی نئی بات ہے جسے بالا جائے یا بڑھایا جائے خواہ مخواہ فتنہ بڑھے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو غلطی بھی میری ہی ہے ۔ ناشتہ کی تکلیف تو واقعی ہوئی ہوگی جبھی تو اس قدر ناخوش ہیں ۔

اتنا سوچکر خالہ تیار ہوگئیں کہ جس طرح ہوسکے معاملہ کو رفع دفع کیا جائے ۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ کی خاموشی کے بعد اس طرح گویا ہوئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔ پوچھنے لگیں ۔

خالہ "جی ـــ؟ ـــ؟ ... پان مانگ رہے ہو؟ ـــ؟

خالو " .... خاموش ...."

خالہ ۔ (پہلے سوال کے سلسلے میں از خود) "اچھا لاتی ہوں ۔"

خالو ۔ (جلدی سے) میں نے نہیں مانگا پان ۔ (چادر کے اندر ہی سے) تمہارے کان بجنے لگے ہیں ۔"

خالہ "کتنے بجنے لگے ہیں؟"

خالو (آہستہ سے) سَو (۱۰۰)" ۔

خالہ "دو کا ہے کو تین ۔ ابھی مشکل سے کوئی دس نہیں تو گیارہ کا وقت ہوگا ۔ " دو بجنے لگے ہیں " تجاہل عارفانہ سے خالہ نے نقرہ کو دہرایا ۔

خالو "اب سونے بھی دو گی؟"

خالہ "میں کہتی ہوں کہ اب صبح کو کیا ناشتہ تیار کروں؟"

خالو ۔ (ذرا نرمی سے) " میں کیا بتاؤں؟"

خالہ " نہیں صبح کو تو میں آپ ہی کی خوشی کا ناشتہ تیار کرنا چاہتی ہوں ۔

خالو ۔ ابھی میں خود ہی تیار کرلونگا ۔

خالہ ۔ پھر وہی! میں کہتی ہوں کہ .... "

خالو "میرا مطلب تھا کہ ناشتہ رکھا ہوا ہے" خالو جان نے مقراض سخن بنکر جلدی سے "مطلب" اس لئے ظاہر کردیا کہ کہیں خالہ پھر نہ بگڑ جائیں دوسرے یہ کہ خالو خود بھی کچھ شادی کے حالات معلوم کرنے کے آرزومند تھے پھر یہ کہ خالہ سے شکست منوا چکے تھے اب جو وہ بگڑتیں تو اندیشہ تھا کہ کہیں اپنی فتح مبدل بہ شکست فاش نہ ہوجائے اور الٹے لینے کے دینے پڑجائیں ۔

خالہ ۔ رکھا کہاں سے ہوگا؟ یہ تو وہی ناراضی کی بات ہے ایسا بھی کیا انسان .... "

خالو ۔ (پھر بات کاٹ کر) نہیں نہیں تم بے سمجھے نتیجہ نکال رہی ہو ۔ بات یوں ہے کہ تم تو گئیں اُدھر کو اور کمبخت کلوا (ملازم) بھی تمہارے ساتھ چلا گیا ۔ اب ہم اٹھے تو توشہ خانہ بلکہ باورچی خانہ کا بھی کونہ کونہ چھان مارا مگر اب یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ تم تو ناشتہ بنا کر ہی نہیں گئی تھیں ملتا تو کہاں سے آخر ہمت کرکے بازار گئے اور ایک روپے کی مٹھائی لائے ۔ سرہانے والی الماری میں رکھدی ۔ روز صبح اٹھے مٹھائی میں بیٹھے اور مزے لے لے کر مسہری ...."

خالہ " ہاں ہاں فرمائیے مٹھائی میں اور مزے لے لے کر مسہری کھائی ۔"

خالو کو اپنی غلطی کا احساس تو ہو ہی چکا تھا ہنسکر کہنے لگے "اسی مسہری کے ابھی چند "سوکھے" باقی ہیں جو صبح ناشتہ کے کام آسکتے ہیں ۔

بات مٹ گئی ۔ جھگڑا ختم ہوگیا ۔ خالہ بی نے ایک گلوری ہاتھ بڑھا کر پیش کی یہ گویا صلح کا پیغام تھا اور خالو کا ہاتھ بڑھا کر گلوری لینا، اس پیغام کی منظوری کا اعلان ـــ

جھکی ذرا چشم جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی: بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہوجائے جنگ ہوکر

غیب سے ایک آواز

(از جناب ہما صدیقی)

(۱)

کسی بیرحم گلرخ کی نگاہِ ناز کا مارا ، مرا دل تھا حزیں میں تھا پریشاں حال و آوارا
سکونِ دل میسر تھا بیاباں میں نہ بستی میں لبِ ساحل نہ دریا میں بلندی پر نہ پستی میں
یکایک ایک میرے رازداں نے یہ کہا مجھسے خدا بھی ڈھونڈھنے والے کو ملتا ہے تجسس سے!
بیاں کر اپنا دردِ دل کسی اللہ والے سے کہ بن جاتے ہیں بگڑے کام انکے اک اشارہ سے

(۲)

گیا میں سن کے یہ اک زاہدِ خلوت نشیں کے گھر سنایا حالِ دل اس کو دکھائے اشکِ خوں رو کر
کہا اس نے کہ سودائے محبت خام ہے سر میں ضیائے شوق پیدا کر خیالِ فتنہ پرور میں!
رضا جوئی و استقلال پہلے دل میں پیدا کر چمن زارِ محبت کا مزے سے پھر تماشا کر
وہاں سے ایک تازہ زخم لیکر اور میں آیا علاجِ دردِ دل لیکن سمجھ ہی میں نہ کچھ آیا!

(۳)

توجہ نا امیدی کی طرف جب کی مرے دل نے کہا چپکے سے آ کر کان میں پھر ظنِّ باطل نے
مناسب ہے کسی تربت کے پتھر پر جبیں سائی ہزاروں کی تمنا اس طرح دنیا میں بر آئی
نہ راضی اس پہ ہوتا میں تو آخر اور کیا کرتا سہارا ڈوبتے کو ہے بہت کچھ ایک تنکے کا
تمناؤں کی دنیا دل میں لیکر، ایک تربت پر گیا میں یکسوئی غالب ہوئی جب میری وحشت پر
چڑھا کر پھول داغِ دل کے اور اشکوں کی اک چادر لگا میں عرض کرنے عاجزی سے خوب رو رو کر

کہ اے حاجت روائے مستمند و چارہ ساز ما ترا در چھوڑ کر حاجت روا اب میں کہاں جاؤں
تری چوکھٹ پہ امیدیں لئے ذلیل ہو کر میں آیا مدد کیجئے کہ تا دردِ جگر سے میں اماں پاؤں
صدا کانوں میں یہ آئی کہ اے ناداں یہ تربت ہے سمجھ لے "پیرِ درماندہ شفاعت" اپنی حالت ہے

(۴)

کھول کیا، پھر ہوا کیا حال اپنا یہ صدا سنکر رگوں میں رہ گیا تھا شدتِ غم سے لہو جم کر
زمین و آسمان تاریک تھے اپنی نگاہوں میں بہت سوزش زیادہ تھی مری خاموش آہوں میں
خدا کے گھر مجھے لیکر مرے دل کا ملال آیا نظر آئینہ عرضِ تمنا میں مآل آیا!
حضورِ خالقِ کون و مکاں جب میں حزیں پہنچا دعاؤں پر مری "آمین" کہتا "وہ حسیں" پہنچا
مبارکباد دیتا تھا اِدھر مجھ کو مرا ہمدم اُدھر کہتا تھا خود ہاتف یہ میرے کان میں پیہم

"کہ ناداں چھوڑ دے تربت پرستی حق پرستی کر
خدا کی ذات میں شامل نہ تو بندوں کی ہستی کر!"

غزل

(عزیزم محمد مختار احمد صاحب مختار بدیری)

رازِ دل کھل گیا سراغوں سے
دل کے زخموں جگر کے داغوں سے

جا چکی رونق بہار تمام
لطف اب کیا اٹھائیں باغوں سے

دلِ جلوں سے اجالا ہے جگ میں
صاف ظاہر ہے یہ چراغوں سے

درِ پیرِ مغاں کو چھوڑیئے کیوں
رشتۂ جاں ملا ایاغوں سے،

چلیئے مختار سوئے معمورہ
جی بہلتا نہیں ہے راغوں سے

مدینۃ الزہرا

(عبدالحمید صاحب حیدر بہرام پوری)

مسلمانوں نے جہاں جہاں بھی حکمرانی کی فتوحات کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کی بھی قدردانی کی اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکار کوئی صاحب دانش و انصاف نہیں کرسکتا۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں شاہان مغلیہ کے عہد کو ہی دیکھ لیجئے۔ ایک طرف انہوں نے ہندوستان، افغانستان، سمرقند اور بخارا تک کو زیر نگیں کیا اور دوسری طرف علم ادب، شعر و سخن، موسیقی اور فن تعمیر کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ یہ وہ دعوےٰ ہے جسکے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ابوالفضل، فیضی، تان سین اور تاج محل آگرہ اور جامع مسجد دہلی کے اسماء کافی ہیں۔ جنھیں دیکھکر لارڈ برنٹن نے مولوی صدر الدین لاہوری سے دہلی کے ایک شاندار جلسہ میں کہا تھا کہ میں اسلامی تمدن کی عظمت کو سجدہ تعظیم پیش کرتا ہوں۔

ملک سپین پر جب مسلمان قابض ہوئے تو اس وقت تمام یورپ جہالت میں مبتلا تھا۔ تہذیب و تمدن ان میں نام کو نہ تھا آج وہی یورپ اسلامی تمدن، فنون لطیفہ اور علوم کی بدولت جو اس نے غرناطہ اور قرطبہ کی درسگاہوں سے حاصل کئے سرچشمہ تہذیب اور گہوارہ تمدن بنا ہوا ہے۔ سپین کے مسلمان بادشاہوں میں سب سے مشہور بادشاہ عبدالرحمٰن الثالث ہوا ہے۔ اس نے ایک نہایت عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی تھی جس کا نام مدینۃ الزہرا تھا۔ آج ہم اسی عمارت کا کچھ حال قلمبند کرتے ہیں۔

یہ عمارت قرطبہ کے شمال مغربی گوشہ میں تین میل کے فاصلہ پر تھی۔ اس کی بنیاد کا واقعہ اس طرح پر ہے کہ امیرالمومنین عبدالرحمٰن الثالث کی ایک نہایت دولتمند چہیتی کنیز تھی۔ اس کی تمنا تھی کہ اس کا زر و مال کسی دینی کام میں صرف ہو۔ چنانچہ جب وہ قریب المرگ ہوئی تو اس نے خلیفہ سے عرض کیا کہ اس کی تمام دولت مسلمان قیدیوں کے زر فدیہ ادا کرنے میں صرف کی جائے۔ خلیفہ نے جب دوسری سلطنتوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی مسلمان کہیں بھی قید نہیں ہے۔

بادشاہ کی ایک اور منظور نظر کنیز زہرا نے تجویز پیش کی کہ اس روپیہ سے ایک ایسی عالیشان عمارت تعمیر کرائی جائے جس کا جواب روئے زمین پر نہ مل سکے۔ بادشاہ نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور حکم دیا کہ اس رقم کا ایک تہائی خزانہ عامرہ سے لیکر تعمیر شروع کی جائے۔ مقام تعمیر بھی خود ہی تجویز فرمایا جو نہایت پُر فضا تھا اور ایک بلند و شاداب پہاڑ کے پہلو میں واقع تھا۔ اس عمارت کا نقشہ قسطنطنیہ کے انجینیروں نے تیار کیا تھا عرب مورخین نے بڑی تفصیل سے اس عمارت کے مسالے، ان کی قیمت اور معماروں کی تعداد بیان کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ یہ تفصیلات نہ لکھتے تو شاید بعد کے لوگ اسے مبالغہ ہی سمجھتے یا اپنے اپنے قیاس سے کام لیکر اصلیت سے دور جا پڑتے۔ یہ عمارت بیزنطینی اور اسپینی کاریگروں نے ملکر تیار کی تھی اس کی دیواریں ۷۰۰ اور ۲۷۰۰ ہاتھ تھیں اور بالکل قلعہ کی فصیل کے مشابہ تھیں۔ حتیٰ کہ مورچے اور بُرج بھی اسی طرح کے بنائے گئے تھے۔ بادشاہ سارا سارا دن وہاں جاکر اس کی نگرانی کرتا تھا اس کو یہانتک اس میں انہماک تھا کہ متواتر تین جمعوں کی نماز اس سے قضا ہوگئی۔ جس پر قاضی منذر نے جو اس وقت قاضی القضاۃ تھے بڑی سختی سے تنبیہ کی۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے علما مذہبی معاملات میں بادشاہوں تک کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ جب قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ امیرالمومنین نے تین جمعہ قضا کر دیئے ہیں اور وہ بھی محض ایک تعمیر کے شوق میں۔ تو انہوں نے چوتھے جمعہ میں جب خلیفہ نماز کے لئے آئے تو خطبہ کا آغاز اس آیۂ کریمہ سے کیا جس کا بامحاورہ ترجمہ یہ ہے:-

"کیا تم ہر نرم زمین میں خوبصورت مکان اچھے کاریگروں سے اس لئے بنوالیتے ہو کہ ان میں ہمیشہ رہو گے۔ میرا کہا مانو اور اللہ سے ڈرو"۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے عمارات کے پختہ کرانے اور ان کی خوبصورتی میں منہمک ہو جانے اور ان کی تعمیر میں فضول خرچی کرنے کی مذمت کی اور ایک اور آیت پڑھی جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"جس شخص نے اپنی عمارت کی بنیاد تقویٰ، پرہیزگاری اور اللہ کی رضا پر رکھی وہ بہتر ہے۔ یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد گھاٹی کے کنارے پر رکھی جو اسے دوزخ کی آگ میں لے گرا۔ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

اس کے بعد موت، قیامت کے عذاب اور دوزخ کی تکالیف کا نقشہ نہایت ہولناک الفاظ میں کھینچا۔ پھر خواہش نفسانی اور عیش و عشرت دنیائے فانی سے احتراز و اجتناب کی ہدایت فرمائی۔

امیرالمومنین اس وعظ سے اپنی غفلت پر بہت شرمندہ ہوئے بلکہ یہاں تک کہ رو پڑے۔ اور خدا کے قہر سے بچنے کے لئے سربسجود ہوئے۔ امیرالمومنین اس وعظ سے متاثر تو بہت ہوئے مگر دل میں قاضی صاحب سے سخت ناراض ہوئے گھر آئے تو قاضی صاحب کی اپنے ولیعہد الحکم سے شکایت کی کہ:۔

"قاضی صاحب کے خطبہ کا مخاطب سوائے میرے اور کون تھا انہوں نے مجھ پر سخت زیادتی کی۔ اور میری ذلت و اہانت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مجھے اس طرح بھرے مجمع میں نصیحت کرنے میں انہوں نے سیاست ملکی کا بھی کوئی لحاظ نہ رکھا۔ ان کا لہجہ اس وقت اس قدر شدید تھا کہ قریب تھا کہ وہ اپنے عصا سے مجھ پر حملہ کر بیٹھتے۔"

اس کے بعد انہوں نے قسم کھائی کہ میں ان کے پیچھے نماز کبھی نہ پڑھونگا۔ چنانچہ انہوں نے جامع مسجد "مدینۃ الزہرا" ہی میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔ ایک روز الحکم نے عرض کیا کہ جب آپ قاضی منذر سے اس قدر ناراض ہیں تو کیوں نہیں معزول کر دیتے۔ یہ سنکر امیرالمومنین بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ تم نہیں منذر جیسے سید عالم کو معزول کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تم دینی عہدہ سے معزول ہو جاؤ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ عہدۂ قضا سے معزول ہوں۔ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میرے اور نماز جمعہ کے درمیان منذر جیسے باورع آدمی شفیع نہ ہوں۔ مجھے اس وقت غصہ تھا کہ میں نے قسم کھالی۔ مجھے اپنی قسم کا کفارہ دینا آسان ہے جب تک میں اور وہ زندہ ہیں۔ میں انہی کے پیچھے نماز پڑھونگا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ میں ان سے ناراض نہیں ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک پرتکلف دعوت کی جسمیں تمام علماء، شعراء اور قاضی صاحب کو مدعو کر کے سب کے سامنے ان سے معافی مانگی۔ قاضی صاحب اس موقعہ پر بھی خلیفہ کو نصیحت ہی کرتے رہے چنانچہ اس کے بعد وہ باقاعدہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے لگے۔

بات تھی مدینۃ الزہرا کی، جا پڑی حکایت میں۔ تو خیر اس عمارت کے لئے نومیڈیا یونان اور اندلس کی کانوں سے سنگ سماق اور سنگ مرمر وغیرہ لئے گئے۔ محل کے تین نمایاں حصے تھے اور ٹھیک پہاڑ کی ڈھلوان پر واقع تھا۔ اس محل میں خود خلیفہ، ان کی حرمیں اور کنیزکیں اور غلام جن کی تعداد ہزاروں تک تھی رہتے تھے۔ باغ میں عجیب و غریب قسم کے ایک ہزار فوارے تھے جن میں سے دو بہت مشہور ہیں۔ ایک بڑا چمکدار تانبے کا فوارہ بشکل انسان جس پر نہایت خوبصورت بیل بوٹے بنے ہوئے تھے یہ فوارہ شاہ قسطنطنیہ نے تحفتاً بھیجا تھا۔ دوسرے کا حوض سبز پتھر کا تھا۔ جو ملک شام کی صنعت کا نمونہ تھا۔ اس کے کناروں پر بارہ جانوروں کے بڑے بڑے بت خالص سونے کے بنے ہوئے تھے۔ جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ ان بتوں کے منہ سے ہر وقت پانی حوض میں گرتا رہتا تھا۔ اس عمارت کے صدر دروازے کے اوپر نہایت صنعت کے ساتھ اس کنیز کا سنگ سماق کا بنا ہوا بت تھا۔ جسکے مشورے سے اور جس کے نام پر یہ محل تعمیر ہوا تھا۔

ایک معتبر مورخ لکھتا ہے کہ جب عمارت تیار ہو گئی تو بادشاہ نے ایک صاحب کو یہ عمارت دکھا کر ان سے اپنی سعی و کوشش کی داد چاہی۔ انہوں نے اس کی تعریف تو بہت کھلے دل سے کی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کہدی کہ اس عمارت کے پیچھے جو دیو سا پہاڑ ہے اس کے سامنے زہرا کا بت البتہ معلوم

ہوتا ہے گویا اسے ایک خوفناک دیو اپنی بغل میں لئے ہوئے ہے یہ پھبتی چونکہ بر محل تھی اس لئے بادشاہ نے جھٹ حکم دیدیا کہ پہاڑ کھود کر پھینکدیا جائے۔ چنانچہ کام شروع ہو گیا۔ امراء و وزراء نے جب دیکھا کہ یہ روپیہ مفت میں ضائع ہو رہا ہے۔ تو امیرالمومنین کو مشورہ دیا کہ کھودنے کے بجائے اس پر باغ لگادیجئے۔ یہ تجویز معقول تھی بادشاہ نے قبول کر کے اس پر بیل بوٹے اور سبزہ لگوادیا جس سے یہ معلوم ہونے لگا کہ زہرا جنت میں بیٹھی ہے۔

مسلمان مورخین اس محل کی جس عمارت پر سب سے زیادہ فخر کرتے ہیں وہ سنگ مرمر کے ایک بلند چبوترہ پر بنی ہوئی تھی اور اندر سے اپنے بانی کی شان و شوکت، فن تعمیر کے بہترین مذاق اور اعلیٰ درجہ کے کمال کو ظاہر کرتی تھی

اس عمارت کی تعمیر سے امیرالمومنین کا مقصد تو یہ تھا کہ یہاں صرف شاہی محل بنے مگر ہوتے ہوتے وہاں ایک چھوٹا سا شہر ہی آباد ہو گیا۔ جو بجائے قصرالزہرا کے مدینۃ الزہرا بن گیا۔ قصر کے گرد اہل دربار۔ سوداگران ملک، اور افسران فوجی کے پر تکلف مکانات بن گئے۔ سڑکوں پر درخت لگوادیئے گئے۔ علاوہ شاہی حماموں کے تین سو حمام اور بن گئے۔ محل شاہی عشرتکدہ ہو کے ساتھ ساتھ ہی مختلف علوم و فنون مثلاً علم ادب۔ منطق۔ سائنس اور صنعت و حرفت کا گہوارہ اور ساری سلطنت کے اعلیٰ دماغوں کا مرکز بن گیا۔ مجالس مشاعرہ و مناظرہ قائم ہوئیں۔ دربار اندلس کی شان و شوکت ان مذاکرات علمیہ سے ظاہر ہوتی تھی جو بادشاہ اور ارکان سلطنت کے زیر نظر ہوتے رہتے تھے۔

اس شہر کے مکمل ہونے میں چالیس برس لگے جن میں پچیس برس خلیفہ عبدالرحمٰن کے اور پندرہ برس ان کے جانشین حکم ثانی کے تھے۔ ہر ملک و ملت کے سیاحوں کی رائے ہے کہ دلکشی خوش منظری شاہی شان و شوکت اور حسن تعمیر کے لحاظ سے مادر گیتی نے کوئی جگہ مدینۃ الزہرا جیسی عظیم الشان اور خوبصورت نہ دیکھی ہوگی اور نہ دیکھیگی۔

شعر:۔ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت ؛ رفت منزل بہ دیگرے پرداخت

تجلیات شمس

ہلاکِ آرزو محرومِ دید فصلِ گلشن تھا
مرا مدفن نہ تھا دنیا کے ارمانوں کا مدفن تھا

مرے افسانہ الفت کا ہے آغاز اس دن سے
نگاہِ دہر میں جب نامکمل حسنِ گلشن تھا

یہاں پر موت آئی تو وہاں پر فصل گل آئی
مرا انجام افسانہ بھی کیا آغاز گلشن تھا

نہ پوچھو بزم جاناں کی تجلیات کا عالم
کہ ہر منظر جہاں جلوہ طراز برق ایمن تھا

تصور کی نگاہوں میں جمال روئے روشن تھا
نمود صبح سے پہلے خیال صبح گلشن تھا

میرے نالوں سے وابستہ تھے محشر خیز کچھ پہلو
مگر میں کیا کروں مجھ کو خیال اہل گلشن تھا

قفس میں آکے اک کونہ تو مجھ کو مل گیا اے شمس
چمن میں جب میں رہتا تھا تو محتاج نشیمن تھا

(شمس الدین شمس اکبرآبادی)

کمالات جوہر

(جناب شیخ بنے میاں صاحب جوہر چاندوڑی تلمیذ رشید مولینا محوی صدیقی مدظلہ)

حمد

آنکھ ہوتی تو ہر کہیں ملتا ! کیوں کبھی وہ کہیں نہیں ملتا
پوچھیئے طور پر یہ موسیٰؑ سے وہ کہاں ہے کہاں نہیں ملتا
مانتا ہوں مکین ہے دل میں مگر اس پر بھی وہ نہیں ملتا
ڈھونڈتے ہم جہاں جہاں اس کو بالیقیں وہ وہیں وہیں ملتا
دیر و کعبہ پہ منحصر کیا ہے ؟ ؟ ڈھونڈتے ہم جہاں وہیں ملتا
ذکر کرنا ہے دردِ دل کا مگر کہیں موقع سے وہ نہیں ملتا
اس لئے تجھ پہ ہے زمانہ نثار تجھ سا کوئی کہیں نہیں ملتا
ہے جو شہ رگ سے بھی قریب ترین کیا سبب ہے کہ پھر نہیں ملتا
جانتے جب، کہ تو ہے پردہ نشیں حشر میں بھی اگر نہیں ملتا!
بیٹھیں اب پاؤں توڑ کر گھر میں ڈھونڈنے پر بھی وہ نہیں ملتا
خود خودی کے مٹا دیئے جوہر پھر وہ کیونکر تمہیں نہیں ملتا
کیوں طلب اور سے کرے جوہر
مانگ تو اس سے کیا نہیں ملتا

غزل

کیا کن سے جہاں۔ یہ بات کتنی ثنا تیری کریں ذرات کتنی
کسی کی آج تو کل ہے کسی کی ہے دولت دیکھئے کم ذات کتنی
گنہگاروں کو اپنے بخشدینا تمہارے واسطے ہے بات کتنی
جدھر دیکھو ادھر پانی ہی پانی قیامت خیز ہے برسات کتنی
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں شام ہی سے بتاؤ تو ابھی ہے رات کتنی
دکھا دے جلوۂ محبوب مجھ کو دعا ہے قاضی الحاجات کتنی
تری سرکار، سرکار جہاں ہے تری ہے ذات، عالی ذات کتنی
نظر آتا نہیں کچھ بھی الٰہی ! لحد تاریک ہے ہیہات کتنی
شب وعدہ، نہ آئے پر نہ آئے تمہاری راہ دیکھی رات کتنی
مرے غم کی کہانی سن کے بولے سنیں یہ داستاں ذرات کتنی!
زمیں ہے سخت اے جوہر لکھوں کیا ؟
کہوں تو مشق، معلومات کتنی !

قطعہ تاریخ وصال پر ملال چراغدین شیخ لال

دے کے داغ ہجر عقبیٰ کو سدھارا ہے چراغ ہو گیا ارمان کا امید کا پامال باغ !
دل پہ چھائی تیرگی آندوہ کی، آہ ہم کی ! کر دیا باد اجل نے گل امیدوں کا چراغ
کیوں نہ ہو جائیں اسیر غم جناب شیخ لال دے گیا ان کو جدائی کا چراغ الدین داغ!
ہے دعا بھی اور سال انتقال پر ملال
جوہر غمگیں لکھدیجے "بہشتی ہو چراغ"
۱۹۳۲

فلسفہ ازدواج

(جناب ابونعیم سید اکبر حسینی آرزو حیدرآباد دکن از ادلطف)

ازدواج وہ عقد محبت یا پیمان وفا ہے جس کے ذریعہ دو ہستیاں ایک دوسرے کی رفیق حیات اور شریک زندگی قرار پاتی ہیں اس سے بظاہر تو منشائے فطرت کی تکمیل نظر آتی ہے۔ کہ ذکور و اناث کی رفاقت سے مقصد بقائے نسل انسانی پورا ہو۔ لیکن حقیقت میں حصول اطمینان و راحت کا اسی پر انحصار ہے۔ کیونکہ جذبات شباب اور فطری ولولے اسی کی بدولت اخلاص و محبت کی صورت میں تبدیل ہوتے ہیں۔

جوانی کی حد تک یہ حقیقی مسرت کا ذریعہ ہے تو عالم پیری میں پہنچکر دل مجروح کا مرہم اور قلب مضطر کی تسکین بن جاتا ہے۔ برخلاف اس کے تجرد کی خود غرضانہ زندگی کا خاتمہ کس مپرسی اور افسوسناک نتائج پر ہونا لازمی ہے۔

یہ وہ نعمت غیر مترقبہ یا گنج گرانمایہ ہے جس سے مستقبل درخشاں ہو سکے اس کی نظیر اس نہال تازہ سے دی جا سکتی ہے جس کے خوشنما پھولوں کی عطر بیز نکہت سے مشام جان تازہ اور دل و دماغ معطر ہو جائیں۔

(۲)

ازدواج کو حقیقی معنوں میں دل خوش کن اور مسرت افزا بنانے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں ہستیاں متفق الخیال ہوں کیونکہ اس کے برعکس رہنے سے ان خوشگوار نتائج کی توقع نہیں کی جا سکتی جو ہمخیال وہمزبان ہونے کی صورت میں ممکن ہیں۔

ایسی صورت میں ہر خیال اور ہر تمنا خوش آیند ہوتی ہے۔ جس کا انجام مسرت خیز اور نشاط انگیز ہوتا ہے۔

وہ رفیق حیات گوہر بے بہا ہے جو نیک طینت، خوش مزاج اور مقبول صورت ہو۔ جس کا ہر قول میزان عقل میں جچا تلا اور ہر فعل فہم و دانش کے اشارہ و ہدایت کے مطابق ہو۔ سلامت روی اس کا لائحہ عمل اور عاقبت اندیشی اس کا شعار ہو۔ اس کے بچے راحت و آسائش کے گہوارہ میں ناز و نعم سے پرورش پاتے ہیں۔ تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ اس کا شوہر اس کا گرویدہ اور ثنا خواں ہوتا ہے۔ ایسی زندگی اطمینان قلب کی سرمایہ دار ہوتی ہے۔ دنیا اسے قابل رشک سمجھتی ہے۔ اور اسی زندگی کو حقیقی معنوں میں جنت کی زندگی کہہ سکتے ہیں۔

(۳)

عموماً معمولی سی چیز خریدنے کے وقت بھی کافی جانچ اور دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ تو انتخاب زوجہ کے وقت کیوں نہ اس اصول پر عمل کیا جائے؟ تبادلۂ خیالات اور طبائع کا اندازہ کرنے کے لئے کچھ وقت و سعی درکار ہے۔ اس لئے کہ اگر طبائع میں کوئی شدید اختلاف پایا جائے اور رجحان مذاق و افتاد طبیعت کی سمات متضاد نظر آئیں تو انفساخ نسبت کہیں زیادہ آسان وکم تلخ ہے طلاق یا فسخ نکاح سے۔ اور کہیں زیادہ بہتر ہے ساری عمر کے جلاپے۔ کڑھاپے اور آئے دن کی خانہ جنگی سے۔

یہ صحیح ہے کہ بالکل یکساں طبائع کا دستیاب ہونا سخت دشوار ہے۔ جس طرح قدرت خالقہ نے نقش و نگار ظاہری صورتوں میں اختلاف رکھا ہے اسی طرح سیرتوں میں فرق ہونا ضروری ہے لیکن اگر یہ فرق و اختلاف ابرے اور استر کا سا ہو تو نباہ مشکل نہیں۔ بلکہ ایسے فرق و امتیاز کو درخور اعتنا بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن یہی فرق ابیض و اسود کی حد تک متبائن ہو تو ظاہر ہے کہ ایک یورپین کو ایک افریقن کے ساتھ وابستہ کرنے یا بلبل چمنستان کو زاغ کوہستان کا ہم قفس بنانے کے مترادف ہی ایسے جوڑے کو مضحکہ خیز لطیفہ تو کہا جا سکتا ہے لیکن رابطہ دانش سے اتنا ہی دور ہے جتنا اپنی جنسیت و صنف سے آشکارا۔

(۴)

اکثر عورتیں سبز چشم بھوت یعنے حسد کی شکار ہوکر اپنی زندگی تلخ اور شوہر کے لطف کو کرکرا کر دیتی ہیں۔ خواہ وہ بادل ناخواستہ کیسی ہی مستعدی اور محنت سے ہر کام کیوں نہ انجام دیتی ہوں پھر بھی ہزاروں بے حقیقت توہمات ان کے دل کا طواف کرتے رہتے ہیں اگر کوئی مرد کسی سانحہ سے متاثر ہوکر یا کسی واقعہ ہائلہ کو یاد کرکے یا کسی فوری اثر کے ماتحت اتفاقیہ اپنے گھر میں آہ سرد کھینچنے کا "ارتکاب" کرے۔ اس سے بے تامل یہی مراد لی جائے گی کہ ہو نہ ہو کسی کے عشق جانگداز کو ایک آہ میں مختصر کرنے یا چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح یہ عجلت پسند طرز عمل اور فوری نتیجہ آفرینی سینکڑوں پریشانیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ شوہر کو اس وقت توقع ہوتی ہے ہمدردی کی لیکن ظہور میں آتی ہے بدگمانی۔ اسے جستجو ہوتی ہے مرہم کی، چھڑکا جاتا ہے نمک۔ بدمزگی کا آغاز یہیں سے نشو و نما پاتا ہے۔ یہی نہیں کہ صرف دل میں ایک خیال آیا تھا وہ گزر گیا۔ نہیں بلکہ اس شبہ اور گمان کا اظہار مختلف اوقات میں کبھی آنسوؤں کے ذریعہ اور کبھی طعن و تشنیع کی "معرفت" ہوتا ہے۔ گویا حسین و گداز سینوں کے اندر خون دل پلا پلا کر اس افعی کی پرورش کی جاتی ہے جسے عرف عام میں حسد و سوءظن کہا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی افعی پل پلا کر چند ہی روز میں پورا ناگ بن جاتا ہے اور راحت و مسرت ازدواج کی دیوی کو ڈس لیتا ہے۔ جب شوہر اپنی آنکھوں سے یہ انجام بد دیکھتا ہے تو پھر اپنے تئیں حصول راحت کے اور ہی سامان تلاش کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

(۵)

یہ امر تو اظہر من الشمس ہے کہ کوئی ہستی بھی ہمہ صفت موصوف نہیں ہوتی الاّ ماشاء اللہ۔ اگر فی ہزار ایک یا فی لاکھ ایک ہو بھی تو النادر کالمعدوم کے ماتحت ناقابل شمار ہے پس ایسی صورت میں انتخاب زوج یا زوجہ کے وقت مختلف پہلوؤں پر نظر کرکے ترجیح دی جائیگی۔

(۱) مثلاً جس کا میلان طبع دولت کی طرف ہو وہ متمول خاندان کی لڑکی کو پسند کرے گا۔

(۲) مناظر فطرت کا شیدائی اور حسن پرست، پیکر جمال و شاہد شیریں ادا کی آرزو کرے گا۔

(۳) ادیب و علم دوست۔ تعلیم یافتہ اور سلیقہ شعار رفیق حیات کا متمنی ہوگا۔

(۴) متقی اور عابد شب زندہ دار، پابندی صوم و صلوٰۃ کو ملحوظ رکھے گا۔

(۵) مغربی تقلید کا حامی، نئی روشنی کی فیشن پرست، آزاد خیال اور قدامت سے متنفر زوجہ کا خواہاں ہوگا۔

(۶) سینما کا ہیرو، زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب ایکٹرس کو اپنے لئے سب سے زیادہ موزوں تصور کرے گا۔ درحالیکہ وہ جان سکتا ہے کہ اس کا اظہار محبت بھی ایک ایکٹنگ ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ زوج کا ذوق مسوخ زوجہ کی محبت کا قدر شناس نہیں ایکٹنگ کا شیدائی ہے۔

اب اگر یہی شوخ و شنگ ایکٹرس کسی زاہد شب بیدار کے گلے کا ہار ہو جائے تو وہ اس کی ہر وقت کی نمائش، تصنع نباوٹ، چٹک مٹک حرکات، "فوق البھڑک" لباس اور ادعائے "انا البرق" سے اکتا جائے گا۔ پریشان ہو جائیگا اور کچھ عجب نہیں کہ ایک نہ ایک دن اس کے کمال کردار نوازی کی داد دے بیٹھے یعنے تنگ آمد بجنگ آمد پر عمل کرتے ہوئے تہجد کی نیت باندھنے سے قبل عصا لیکر "پھیل پڑے" اور کہے کہ اب بتا! بیوجہ کیوں مٹک رہی تھی؟! . . . . .

تو فرمائیے ایسی حالت میں کسی طرح بھی گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے؟! ہرگز نہیں۔ پس ضروری ہوا کہ عقد و مناکحت سے قبل ایک دوسرے کی سیرت۔ ذوق۔ میلانات و رجحانات طبیعت کا پورے طور پر صحیح صحیح اندازہ کر لیا جائے۔ تاکہ دونوں افراد (زوج اور زوجہ) کے لئے خوش آیند مستقبل کی امید کی جا سکے۔ کیونکہ عقدۂ نکاح ایسی گرہ نہیں جسے آسانی سے کھولا یا توڑا جا سکے ع

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

بلبل اور جگنو

(سید ابو نعیم صاحب آرزو)

جو آئی گلستاں میں فصلِ بہار — لگے جھومنے نخل مستانہ وار
پپیہا لگا چیخنے ، پی کہاں — ہوئیں اپنے جامہ سے باہر ہزار

اسی شام اک بلبلِ خوشنوا — ہوئی نغمہ پیرائے شاخسار
چمکتی ہوئی دیکھی چھوٹی سی چیز — جو صحنِ گلستاں میں تھی بیقرار
وہاں اڑکے پہنچی تو جگنو تھا یہ — کیا شکر خالق ، کہ پایا شکار
خیال اس کے دل میں یہ پیدا ہوا — ملے لقمۂ تر تو کیا انتظار
ارادہ سے اسکے جو واقف ہوا — تو کی عرض جگنو نے اے غمگسار
میری جان کیا ! ہو جو سیری تجھے — نہ برباد کر ہوں میں اک خاکسار

ہوں بیکس ہے لازم ترحم تجھے
ملیں گے تجھے اور لاکھوں شکار

مگر کچھ خبر تجھکو اس کی بھی ہے ! — ہیں تو اور میں کس کے خدمتگزار
بنایا ہے کس نے چمن پر فضا — کھلے حکم سے کس کے گل ہشیار
وہ تھا کون جس نے یہ غنچے کھلائے — کئے کس نے شبنم کے موتی نثار
عطا کس نے کی خوشنوائی تجھے — چمک مجھ کو دی کس نے رشک شرار
جو نازاں ہے تو اپنی آواز پر — ادا بھی تو کر شکر پروردگار
اگر خوشنوائی میں یکتا ہے تو — تو ہے پرتو مہر یہ خاکسار
اگر تجھ سے محظوظ ہونگے بشر — میں شمع ہدایت ہوں سن اے ہزار
تعجب ہے کیسے یہ سوجھی تجھے — کیا چاہتا ہے جو مجھ کو شکار

اگر ہو چمن میں تو نغمہ طراز
چمک کر دکھاؤں میں اپنی بہار

کہا سن کے بلبل نے اس کا بیاں — ہوں اس فعل پر اپنے میں شرمسار
نہ چھیڑوں گا تجھ کو خدا کی قسم — گزارینگے مل جل کے لیل و نہار
نہ ہوگر چمن میں ہمارا وجود — تو ہو جائیگی کم چمن کی بہار

مبارک ہو تجھ کو تری روشنی
ہو آواز میری مجھے سازگار

گلہائے جذبات

دل ڈھونڈتی نکلی جو وہ وزدیدہ نظر آج
اُٹھ اُٹھ کے پتہ دینے لگا دردِ جگر آج!
ہے یہ نگہ مست کا ساقی کی اثر آج
دل جامہ سے باہر ہے تو رقصاں ہے نظر آج
تنہائی ہے، چھائی ہے گھٹا، رات ہے سنسان
امید کی وہ صورتیں یارب ہیں کدھر آج؟
مٹ جائے نہ دل سے خلشِ دردِ محبت !
بن جائے نہ ارماں کہیں پھر تیر نظر آج
رہ جائے نہ ارمان تڑپنے کا پسِ ذبح
پھر جائے نہ یارب کہیں قاتل کی نظر آج!
منہ تکتے رہے تاب و تواں ہوش ہوئے گم
جب طائرِ دل لے اڑا شاہینِ نظر آج
کیوں پھوٹ کے بہنے لگے یوں آبلۂ چشم
اک چھیڑ تھی یہ خارِ تمنا کی مگر آج
آجائے نہ حرف ان کی مسیحائی پہ یارب !
ہوں کاش دعائیں مری ممنون اثر آج
خوں ہو نہ کہیں آرزو کیوں روک لوں آنسو
جانے بھی دو قسمت انہیں لیجائے جدھر آج

سخن فہمیِ عالمِ بالا معلوم شد

اس ضرب المثل کو تقریباً تمام تعلیم یافتہ اصحاب استعمال کرتے ہیں لیکن غالباً بہت ہی کم لوگ اس کی ابتدا اور اصلیت سے واقف ہوں گے۔

حضرت سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ نے حمد باریتعالیٰ عزاسمہٗ میں ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

برگِ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ اُس شعر کے صلہ میں ممدوح کی طرف سے طبق نور آسمانی اتر اتر کر حضرت سعدیؒ کے پاس آرہے ہیں ۔" اسے داد آسمانی کہئے یا انعام الٰہی ۔

یہ روایت فیضی کے کانوں تک بھی پہنچی۔ اور اس نے ملدمنؔ میں جو حمد لکھی اس کا یہ شعر اسے سعدیؒ کے شعر سے بھی بہتر نظر آیا ؎

در ہر بُنِ مو کہ مے نہی گوش
فوارۂ فیضِ اوست در جوش

اس شعر کی لطافتِ مضمون پر اسے بڑا فخر تھا اور اکثر گنگناتا رہتا تھا۔ ایک روز جناب فیضی صحن میں لیٹے ہوئے مزے لے لے کر اس شعر کو پڑھ رہے تھے اور دل میں آسمانی داد کے منتظر تھے کہ اتنے میں ایک طائر سبک پرواز اڑتا ہوا آیا اور اپنی بیخال سے چہرۂ مبارک پر تلعی کر گیا۔ آپ چونک پڑے اور بے ساختہ آسمان کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے "سخن فہمیِ عالمِ بالا معلوم شد"

(باسط)

چار شعرا کی ایک رباعی!

فردوسی جب مصنف شاہ نامہ نہ تھا تو گدائے مغرور بلکہ متکبر کی ضرب المثل اس پر صادق تھی۔ ایک روز سوچا کہ محمود غزنوی کے دربار میں رسائی کی کوئی ترکیب کرنی چاہیے چنانچہ اسی ارادے سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔

تھکے ہارے منزلیں مارے پہنچے دار السلطنت میں ریل تھی نہ لاری نہ کوئی اور سواری۔ سرائے میں ٹھہرنے تک کو پیسہ نہ تھا۔ جیب ایسی خالی تھی جیسے بعض نام کے ایڈیٹروں کا دماغ ۔ ۔ ۔ آخر آپ ٹہلتے ٹہلتے ایک باغ میں پہنچے جہاں عنصری، فرخی، عسجدی، تین نامور شعرا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ آپ بھی بُرے حال صورت سوال وہیں جا بیٹھے انہیں سخت ناگوار گزرا کہ ایک شکستہ حال اجنبی کیوں ہمارے پاس آ بیٹھا۔ چنانچہ اس اجنبی کو بھگانے کی مہذب ترکیب یہ سوچی گئی کہ تینوں نے ایک ایک مصرعہ اس سنگلاخ زمین میں کہا اور چوتھے مصرعہ کے لئے جو سب سے زیادہ مشکل ہوگیا تھا اجنبی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ؟ ؟ ؟

چوں عارضِ تو ماہ نباشد روشن (عنصری)
مانندِ رخت گل نبود در گلشن! (فرخی)
مژگانت ہمی گذر کنند از جوشن (عسجدی)
مانند سنان گیو در جنگ پشن! (فردوسی)

تینوں شعرا نے بےحد داد دی اور دربار شاہ تک پہنچایا جہاں شاہنامہ لکھنے کا حکم ملا۔

(باسط)

ماہیت نور

(ہندوستانی" اکادمی الہ آباد کا تماہی علمی رسالہ ہے جو خاص طور سے طبقہ میں جاتا ہے اسی سے یہ مضمون بغرض رفاہ عام اخذ کیا گیا ہے جو بے حد مفید اور بہترین معلومات سے لبریز ہے)

(جناب پروفیسر منہاج الدین صاحب اسلامیہ کالج پشاور)

مظاہر قدرت میں سب سے عجیب منظر دن اور رات کی تبدیلی ہے جو آفتاب کے طلوع و غروب کے ساتھ ظہور میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی توجہ سب سے پہلے اس منظر کی طرف منعطف ہوئی جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بعض قوموں میں آفتاب کی پرستش شروع ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ آفتاب سرچشمہ حیات ہے۔ انسانی اور حیوانی زندگی کا مدار محض آفتاب کی توانائی پر ہے۔ جو حرارت اور نور کی شکل میں زمین پر پہنچتی ہے۔ اصلیت کے اعتبار سے حرارت اور نور کی شعاعوں میں کچھ فرق نہیں۔ لیکن ہماری حس باصرہ بعض شعاعوں کے اثر کو قبول نہیں کرتی۔ اس اعتبار سے جو شعاعیں ہماری قوت باصرہ کے احساس میں آجاتی ہیں انہیں نور کی شعاعیں کہتے ہیں۔

یہ مسئلہ کہ نور کیا ہے اور آفتاب کی توانائی کس طرح آفتاب سے زمین کو منتقل ہوتی ہے ہمیشہ سے علمائے سائنس کے زیر نظر رہا ہے اور اس پر بہت کچھ تحقیق ہوئی ہے۔ یہ تحقیق سائنس کا عظیم الشان کارنامہ ہے کیونکہ اس سے نہ صرف نور کی ماہیت معلوم ہوتی ہے بلکہ مادہ کی ساخت کا راز بھی ایک حد تک آشکارا ہو گیا ہے۔ میں اس مضمون میں یہ بیان کروں گا کہ نور کے متعلق شروع میں کیا تصور قائم ہوا اور معلومات کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اور چونکہ نور توانائی کی ایک شکل ہے اس لئے اصل مسئلہ کے بیان سے پہلے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ توانائی کیا ہے؟

توانائی:۔ جب کوئی جسم متحرک ہوتا ہے تو اس میں زور ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ کام کر سکتا ہے۔ اس زور کو توانائی کہتے ہیں۔ توانائی جسم کی رفتار پر منحصر ہے۔

اگر دو لچکدار جسموں میں سے ایک متحرک ہو اور دوسرا ساکن، اور متحرک جسم ساکن جسم سے ٹکرائے تو تصادم سے ساکن جسم میں بھی حرکت پیدا ہو جائے گی۔ مگر تصادم کا یہ اثر بھی ہوگا کہ متحرک جسم کی رفتار کم ہو جائے گی۔ پس متحرک جسم میں جو توانائی تھی اس میں سے کچھ ساکن جسم میں چلی گئی۔ لیکن دونوں جسموں کی مجموعی توانائی وہی رہی جو تصادم سے پہلے تھی۔

اگر جسم لچکدار نہ ہوں تو حرکت کی توانائی ٹکرانے سے کم ہو جائیگی مگر تصادم میں حرارت بھی پیدا ہوگی۔ حرارت ایک قسم کی غیر مرئی توانائی ہے۔ پس توانائی بالفعل کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ کچھ توانائی کا حرارت میں استحالہ ہو گیا۔ تصادم کے بعد دونوں جسموں کی توانائی اور حرارت کی توانائی کا مجموعہ تصادم سے پہلے متحرک جسم کی توانائی کے برابر ہوگا۔

یہ سمجھنا چاہیے کہ توانائی گھٹ بڑھ نہیں سکتی۔ اگر ایک جسم کی توانائی میں کمی واقع ہو تو کسی اور جسم کی توانائی اتنی ہی بڑھ جائے گی البتہ توانائی کی کئی شکلیں ہیں اور ایک قسم کی توانائی دوسری قسم کی توانائی میں تبدیل ہو سکتی ہے لیکن توانائی نہ پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ فنا ہوتی ہے اس قانون کو قانون بقائے توانائی کہتے ہیں۔ اور یہ قانون طبیعیات جدیدہ کا اصل اصول ہے۔

توانائی کا ایصال:۔ اگر کوئی جسم ہم سے دور واقع ہو تو اسے توانائی پہنچانے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی جہاز سمندر میں ہو تو اسے توانائی پہنچانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم جہاز پر گولیاں چلائیں ایسا کرنے سے جو توانائی ہر ایک گولی میں ہوگی وہ جہاز سے ٹکرا کر جہاز میں چلی جائیگی۔ اس طریقہ سے ہم جہاز کو متحرک بھی کر سکتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم پانی میں زوردار لہریں پیدا کر دیں۔ لہریں جہاز تک پہنچکر اسے متحرک کر دینگی یعنے جہاز کو طاقت منتقل کر دیں گی۔

پہلی صورت میں ہر ایک گولی توانائی کو ساتھ لئے جاتی ہے گویا توانائی کے ساتھ مادہ بھی منتقل ہوتا ہے۔ لیکن دوسری صورت میں توانائی پانی کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ کو منتقل ہوتی ہے۔ لیکن پانی

خود توانائی کے ساتھ نہیں جاتا۔ صرف توانائی کو گزرنے دیتا ہے لیکن دونوں صورتوں میں توانائی کے ایصال کے لئے واسطہ کی ضرورت پڑتی ہے یا تو خود مادہ توانائی کو لیکر پہنچے اور یا کوئی ایسا واسطہ ہو جو کہ توانائی کو چاروں طرف پھیلا کر جسم کو پہنچا دے۔

حرارت اور توانائی:۔ جب ہم دو چیزوں کو آپس میں رگڑتے ہیں تو وہ گرم ہو جاتی ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ رگڑنے میں جو زور صرف ہوتا ہے وہ حرارت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گویا چیزوں کی حرکت غیر مرئی توانائی (حرارت) میں تبدیل ہوتی ہے۔

ریلوے انجن میں کوئلہ جلاتے ہیں تو کوئلہ کی حرارت یا غیر مرئی توانائی زور حرکت میں تبدیل ہوتی ہے اور انجن گاڑیوں کو کھینچ کر لیجاتا ہے فی الواقع حرارت توانائی کی ایک شکل ہے۔ حرکت کی توانائی حرارت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اور حرارت حرکت میں۔

نور بھی توانائی کی ایک شکل ہے:۔ جب ہم لوہے کی گولی کو شعلہ پر رکھکر گرم کرتے ہیں تو شعلہ کی توانائی اس میں سرایت کرتی ہے اور گولی کی تپش بڑھتی ہے۔ ٹمپریچر بڑھنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ گولی کے ذرات زیادہ تیزی کے ساتھ متحرک ہو جاتے ہیں۔ اگر گولی کو اور گرم کیا جائے تو اس کے ذرات کی حرکت اور تیز ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ جب حرکت ایک خاص حد تک پہنچ جاتی ہے تو گولی سُرخ ہو جاتی ہے۔ پس گولی کا سرخ رنگ اس کے ذروں کی معین حرکات کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر گولی کو اور گرم کیا جائے تو زرد رنگ ظاہر ہوگا۔ اور رفتہ رفتہ گولی میں سے سفید روشنی نکلنے لگے گی۔

سفید روشنی میں ہر ایک رنگ کی روشنی شامل ہے۔ گویا نور کا ہر ایک رنگ ذرات کی مخصوص حرکات کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب تک ذرات کی حرکات سست ہوتی ہیں جسم سے حرارت کی غیر مرئی شعاعیں نکلتی ہیں۔ اور جب حرکات تیز ہو جاتی ہیں تو نور کی شعاعیں نکلنے لگتی ہیں جن کا آنکھ پر اثر ہوتا ہے۔

منور جسم کے ذرات کی حرکات ارتعاشی ہوتی ہیں۔ یعنے وہ تھرتھراتے ہیں۔

رفتار نور کی پیمائش:۔ ۱۶۷۰ء تک حکما کا خیال تھا کہ روشنی فی الفور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے اسے فاصلہ طے کرنے میں کوئی وقت نہیں لگتا لیکن ۱۶۷۶ء میں رومر نے مشاہدات فلکی سے نور کی رفتار دریافت کی۔ اس کے بعد فزو اور فوکو نے مختلف طریقوں سے رفتار نور کی پیمائش کی۔ سب طریقوں سے رفتار تقریباً ۱۸۰۰۰۰ میل فی ثانیہ نکلی۔

نور کے متعلق قیاسات:۔ یہ بات مسلم ہے کہ منور جسم مخزن نور ہوتا ہے اور اس میں سے جو شعاعیں نکلتی ہیں وہ بصارت کے لئے ضروری ہیں۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ حرارت اور نور توانائی کی شکلیں ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ روشنی معین رفتار کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک جسم سے روانہ ہو کر دوسرے جسم پر پہنچنے تک روشنی کیا ہوتی ہے۔ مثلاً آفتاب کی روشنی ۸ منٹ میں ہم تک پہنچتی ہے۔ راستہ میں یہ توانائی کہاں رہتی ہے اور اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟

قیاس اخراج:۔ اس مسئلہ کی تشریح کے لئے سب سے پہلے قیاس اخراج پیش کیا گیا۔ قیاسی اخراج کے مطابق منور جسم میں سے چھوٹے چھوٹے ذرے خارج ہوتے رہتے ہیں جنھیں ذرات نور کہہ سکتے ہیں۔ یہ ذرے بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور فضائے بسیط میں چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ ان کی رفتار ۱۸۰۰۰۰ میل فی ثانیہ ہوتی ہے اور تیز رفتار کی وجہ سے ان میں توانائی ہوتی ہے۔ جب یہ ذرے کسی اور جسم میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی حرکت کی توانائی پھر نور میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

نور کی مندرجۂ ذیل خاصیتوں کی قیاس اخراج سے بخوبی توجیہ ہو جاتی ہے

(۱) نور کی شعاعیں مستقیم ہوتی ہیں۔ یعنے ذرے جس سمت میں روانہ ہوتے ہیں اسی سمت میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔

(۲) آئینہ کی سطح سے شعاعوں کا انعکاس ہوتا ہے۔ انعکاس کی وجہ آئینہ کی قوت دافعہ ہے جب ذرے سطح کے قریب آتے ہیں تو آئینہ انہیں دفع کرتا ہے اور وہ واپس لوٹ جاتے ہیں۔

(۳) جب ترچھی شعاعیں ہوا سے شیشہ وغیرہ میں داخل ہوتی ہیں تو ان کی سمت بدل جاتی ہے۔ اسے انعطاف شعاع کہتے ہیں اور اس کی تشریح یہ ہے کہ ذرات پر شیشہ کی قوت جاذبہ عمل کرتی ہے۔ جس کے اثر سے ذرات کا رخ بدل جاتا ہے۔

نظریہ اخراج کے مطابق اگر سطح ذرات کو دفع کرے تو شعاع کا انعکاس

ہونا چاہئے اور اگر وہ جذب کرے تو انعطاف ۔ لیکن فی الواقع جب روشنی شیشے کی سطح پر پڑتی ہے تو اس کا کچھ حصہ شیشہ میں داخل ہوتا ہے اور باقی حصہ منعکس ہوجاتا ہے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے نیوٹن نے یہ فرض کیا کہ ذرات مختلف حالتوں میں سطح کے قریب آتے ہیں اور کسی ذرہ کا انعکاس یا انعطاف اس کی حالت پر منحصر ہوتا ہے ۔ بعض ذروں کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ وہ آسانی سے منعکس ہوجاتے ہیں۔

یہ بات غور کے قابل ہے کہ اس قیاس کی رو سے نور کی توانائی چھوٹے چھوٹے ذرّوں میں مجتمع ہوتی ہے وہ چاروں طرف فضا میں پھیلی ہوئی نہیں ہوتی ۔

قیاس تموج :- نیوٹن کی وفات کے بعد ایک سو سال تک نظریہ اخراج مستحکم ہوتا گیا ۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر میں نور کی ایسی خاصیتوں کا انکشاف ہوا کہ نظریہ اخراج پر ان کی توجیہہ ناممکن تھی ۔

ڈاکٹر ینگ نے ایک باریک شگاف میں سے آفتاب کی روشنی تاریک کمرہ میں داخل کی اور روشنی کے راستہ میں ایک تختہ رکھا جس میں پاس پاس دو باریک سوراخ تھے ۔ سامنے سفید پردہ تھا اور روشنی سوراخوں میں سے گزر کر پردہ پر پڑتی تھی ۔ پردہ پر یکساں تنویر کے بجائے روشن اور تاریک دھاریاں بن گئیں ۔ لیکن جب ایک سوراخ بند کیا گیا تو دھاریاں غائب ہوگئیں ۔ اور پردہ پر یکساں روشنی ہوگئی ۔ اس تجربہ میں تاریک دھاری اس وجہ سے تاریک ہوتی ہے کہ ایک سوراخ کی روشنی دوسرے سوراخ کی روشنی کے اثر کو زائل کر دیتی ہے ۔ اس مظہر کو تداخل نور کہتے ہیں اگر نور کی اشاعت ذرات کے ذریعہ ہو تو ممکن نہیں کہ دونوں سوراخوں میں سے آنے والے روشن ذرے باہم ملکر تاریکی پیدا کریں ۔

نور کی اس خاصیت کی توجیہہ کے لئے قیاس اخراج کو خیرباد کہکر نظریہ تموج قائم کرنا پڑا ۔ نظریہ تموج کے مطابق منور جسم کے ذرّوں کی ارتعاشی حرکت سے لہریں پیدا ہوتی ہیں ۔ جو فضا میں چاروں طرف پھیل جاتی ہیں ۔ یہ لہریں مخزن نور کی توانائی دیگر اجسام کو پہنچاتی ہیں ۔

جب پتھر کے گرنے یا کسی اور ترکیب سے پانی میں لہریں پیدا ہوتی ہیں ۔ تو پانی کے ذرے اوپر نیچے ہوتے ہیں لیکن تھرتھراتے ہیں اور اس ترکیب سے دوسرے ذرّوں کو توانائی منتقل کرتے ہیں ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نور کی اشاعت میں کیا چیز تھرتھراتی ہے کیونکہ جب تک کوئی واسطہ نہ ہو توانائی کا ایصال ناممکن ہے ۔ اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ فضائے بسیط میں چاروں طرف ایک ایسا واسطہ پھیلا ہوا ہے جس سے کوئی جگہ خالی نہیں ۔ اس واسطہ کا نام اثیر رکھا گیا ہے نور کی شعاعیں اثیر کے ذرّوں کے ارتعاشات ہیں ۔ مگر اس کے باوجود اثیر ایسی چیز ہے جسے نہ ہم تول سکتے ہیں اور نہ محسوس کر سکتے ہیں ۔

امواج نور کی رفتار ۱۸۰۰۰۰ میل فی ثانیہ ہے اور جو فاصلہ روشنی ذرے کے ایک ارتعاش کے دوران میں طے کرتی ہے ۔ اسے طول موج کہتے ہیں ۔ سب رنگوں کی روشنی کی رفتار برابر ہوتی ہے لیکن ان کی حرکت کی تیزی میں فرق ہوتا ہے ۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف رنگوں کی روشنی کا طول موج مختلف ہو ۔ حرارت کی شعاعوں کا طول موج ، مرئی شعاعوں سے بڑا ہوتا ہے ۔ سُرخ شعاعوں کا طول موج ۳/۱۰۰۰۰۰ انچ سے کسیقدر زیادہ ہوتا ہے ۔ اور رنگوں کی شعاعوں کا طول موج مندرجہ ذیل ترتیب میں کم ہوتا جاتا ہے ۔ نارنجی ۔ زرد ۔ سبز ۔ نیلا اور بنفشی ۔

اگر ایک شگاف روشن کیا جائے اور اس سے کچھ فاصلہ پر باریک تار رکھا جائے تو روشنی کی شعاعیں تار کے گرد سے ہو کر اس کے عقب میں پہنچ جاتی ہیں ۔ (جیسا کہ آواز کے راستہ میں کوئی چیز حائل ہو تو وہ اس چیز کے دوسری طرف پہنچ جاتی ہے) اس مظہر کا نام انکسار نور ہے ۔ اور یہ بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے ۔ کہ نور کی اشاعت آواز کی طرح امواج کے ذریعہ ہو ۔ ہمیں نور کی شعاعیں مستقیم اس لئے نظر آتی ہیں کہ ان کا طول موج بہت ہی قلیل ہوتا ہے اور شعاعوں کا مستقیم راستہ سے انکسار بہت کم ہوتا ہے ۔

بعض کرسٹل یا بلور ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے گزرنے پر شعاع نور دو شعاعوں میں پھٹ جاتی ہے جن کی سمت مختلف ہوتی ہے ۔ ان شعاعوں میں سے ایک کو معمولی شعاع کہتے ہیں اور دوسری کو غیر معمولی شعاع ، اگر ان شعاعوں کو ایک خاص قسم کے بلور سے معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خاصیتیں عام شعاعوں سے مختلف ہیں جب دوسرا بلور ایک خاص سمت میں رکھتے ہیں تو اس میں سے صرف معمولی شعاع نظر آتی ہے ۔ غیر معمولی شعاع اس میں جذب ہوجاتی ہے بلکہ

کو گھماتے پردونوں شعاعیں نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن جب وہ پہلی سمت پر عموداً ہوجاتا ہے تو معمولی شعاع غائب ہوجاتی ہے صرف غیر معمولی شعاع دکھائی دیتی ہے۔ اس منظر کی توجیہ کے لئے فرسنل نے آڑی لہروں کا تصور قایم کیا۔ اس تصور کے مطابق اثیر کے ذرے جن میں سے شعاع گزرتی ہے شعاع کی سمت میں نہیں تھرتھراتے بلکہ ان کا ارتعاش سمت شعاع میں عموداً ہوتا ہے۔

برقی مقناطیسی امواج:۔ نصف صدی سے زیادہ مدت گزری کہ میکسویل کے قیاس کے مطابق نور کی شعاعیں برقی مقناطیسی ارتعاشات ہیں۔ اور میکسویل کا یہ بھی خیال تھا کہ خاص آلات کی مدد سے اثیر یا غیر موصل میں برقی مقناطیسی لہریں پیدا کرنا ناممکن نہیں چنانچہ ۱۸۸۸ء میں ہرٹز نے تجربہ سے ثابت کردیا کہ میکسویل کا خیال صحیح تھا۔ اس سلسلہ میں جو تحقیقات ہوتی رہیں ان کا مفید نتیجہ لاسلکی (بے تار کی آواز رسانی) ہے۔

میکسویل کے نظریہ کی رو سے نور کی شعاعیں برقی مقناطیسی امواج کے ایک طویل سلسلہ میں شامل ہیں۔ جن کی مختلف امواج کا امتیاز طول موج پر منحصر ہوتا ہے۔ نہایت چھوٹے طول موج کی شعاعیں لاشعاعیں کہلاتی ہیں۔ یہ شعاعیں مادہ میں سے گزر جاتی ہیں اور آج کل انسانی جسم کے اندرونی اعضا کا معائنہ کرنے کے لئے نہایت کارآمد ثابت ہورہی ہیں۔ ان سے لمبے طول موج کی شعاعیں روشنی کی شعاعوں کے مشابہ ہوتی ہیں۔ اور گو ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے لیکن فوٹوگرافی کے پلیٹ پر ان کا کیمیائی اثر بہت تیز ہوتا ہے مرئی شعاعوں کا طول موج خاص حدود کے درمیان ہوتا ہے۔ حرارت کی شعاعیں ان سے لمبی ہوتی ہیں۔ اور جو برقی مقناطیسی شعاعیں لاسلکی میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان کا طول موج بہت زیادہ ہوتا ہے۔

برقی مقناطیسی امواج کا تصور قایم کرنے کے لئے فرض کریں کہ ایک گولی میں منفی برق بھری ہوئی ہے۔ اور اس کے نزدیک چھوٹے چھوٹے ہلکے اجسام ہیں جن میں سے بعض میں مثبت برق ہے اور بعض میں منفی برق۔ گولی مثبت برق والے اجسام کو جذب کرے گی اور منفی برق والے اجسام کو دفع کرے گی۔ پس برق سے بھری ہوئی گولی کے گرد برقی قوت کا عمل ہوتا ہے۔ اسے ہم یوں بیان کرتے ہیں کہ برقائی ہوئی گولی اپنے گرد برقی میدان پیدا کرتی ہے۔ یعنے گولی کے گرد برقی خطوط قوت ہوتے ہیں۔ کسی مقام پر برقی قوت کا عمل گولی کے مرکز کی طرف ہوگا۔ اگر گولی کی برق کی مقدار میں کمی بیشی نہ ہو تو برقی میدان کے کسی نقطہ پر برقی قوت میں کوئی کمی بیشی نہ ہوگی۔ البتہ جو مقامات گولی سے دور ہوں گے وہاں برقی قوت کم ہوگی۔ اور جو مقامات قریب ہوں گے وہاں قوت زیادہ ہوگی۔

اب فرض کریں کہ کسی ترکیب سے منفی برقائی ہوئی گولی کی برق خارج ہوجاتی ہے۔ اور پھر اس میں مثبت برقی قوت بھرجاتی ہے اس کے بعد مثبت برق خارج ہوکر پھر منفی برق بھرجاتی ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ گولی کے برقی میدان پر کیا اثر ہوگا۔

جب گولی میں سے برق خارج ہوجائے گی تو برقی قوت کے خطوط بھی غائب ہوجائیں گے۔ اور جب اس میں مثبت برق ہوگی تو مثبت اجسام پر قوت دافعہ کا عمل ہوگا اور منفی اجسام پر جاذبہ کا۔ پس کسی خاص مقام پر برقی قوت پہلے گھٹتے گھٹتے صفر ہوجائے گی۔ اور پھر اس کی سمت الٹ جائے گی۔ اسی طرح گولی کی برقی حالت کے بدلنے سے برقی قوت تبدیل ہوتی رہے گی۔ یعنے برقی خطوط قوت بدلتے رہیں گے۔

لیکن گولی کی برقی حالت کے بدلنے کا اثر فی الفور منتقل نہیں ہوتا بلکہ اسے فاصلہ طے کرنے میں وقت لگتا ہے۔ پس جب گولی میں برق کی تبدیلیاں ہوں گی تو جس وقت گولی میں برق کی مقدار صفر ہوگی عین اسی وقت کسی بعید مقام پر برقی قوت صفر نہ ہوگی بلکہ اس سے تھوڑی سی دیر کے بعد۔ اب اگر گولی کی برقی حالت ایک ثانیہ میں کروڑوں بار تبدیل ہو تو یہ کیفیت ہوگی کہ کسی خاص مقام پر مثبت برق کی قوت عمل کررہی ہے حالانکہ اس وقت گولی میں منفی برق ہے اور اس سے دوگنے فاصلہ پر اس منفی برق کا عمل ہورہا ہے۔ جو اس سے پہلے گولی میں تھی۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

اس کے بعد جب گولی کی برقی حالت بدلے گی تو مختلف مقامات پر برقی قوت بھی بدلتی رہے گی۔ گولی کے چاروں طرف برقی حالت کی تبدیلی ایسی ہوتی ہے جیسی کہ موج کی اشاعت میں ہوتی۔ اس لئے اس منظر کو برقی موج کے نام سے موسوم کرنا بالکل صحیح ہے۔

اب فرض کریں کہ ایک چھوٹے سے تار میں سے برقی رو گزر رہی ہے برقی رو کی وجہ سے تار کے چاروں طرف مقناطیسی میدان ہوگا اور رو کی سمت کے بدلنے سے مختلف مقامات پر مقناطیسی قوت بدلے گی۔ اگر رو کی سمت ایک ثانیہ میں کروڑوں بار بدلے، تو مختلف مقامات پر مقناطیسی قوت بدلتی رہے گی۔ اور مقناطیسی قوت کی یہ تبدیلیاں اسی طرح ہونگی جیسے کہ برق کے بدلنے سے برقی قوت میں ہوتی ہیں۔ اس مظہر کو ہم مقناطیسی موج کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

مقناطیسی اور برقی عمل دونوں رفتار نور کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل ہوتے ہیں۔ برقی مقناطیسی امواج کی رفتار اور نور کی رفتار کی مساوات کی وجہ سے پہلے پہل خیال پیدا ہوا تھا کہ نور کی امواج بھی معین طول موج کی برقی مقناطیسی امواج ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نور کی شعاعیں برقی مقناطیسی ارتعاشات ہیں یعنے منور جسم کے ذرّوں میں کچھ اس قسم کی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں جن سے جسم کے چاروں طرف برقی اور مقناطیسی قوت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہی ارتعاشی تبدیلی ایک جسم سے دوسرے جسم کو شعاعوں کی شکل میں منتقل ہوتی ہے۔

انیسویں صدی کے آخر تک برقی مقناطیسی نظریہ تموج کے نتائج اور صحیح ترین تجربات میں کلی مطابقت رہی چنانچہ ہر شخص کو نظریہ کی صداقت پر کامل یقین ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نور کی حقیقت طشت از بام ہو چکی ہے اور علم مناظر کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کی توجیہ سے نظریہ تموج قاصر ہو۔

نظریہ اخراج کی رو سے نور کی توانائی چھوٹے چھوٹے ذرّوں میں مجتمع ہوتی ہے لیکن نظریہ تموج کے مطابق توانائی تمام فضا میں پھیلی ہوتی ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جدید ترین تحقیقات نے اس تصور میں کیا مشکلات پیدا کر دی ہیں۔

لاشعاعوں کا عمل:- ان مشکلات کی ابتدا "لا" شعاعوں کے دریافت ہونے سے ہوئی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے "لا" شعاعیں نہایت چھوٹے طول موج کی برقی مقناطیسی امواج ہیں اور ان میں اور نور کی شعاعوں میں صرف یہ فرق ہے کہ ان کا طول موج نور کی شعاعوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے جب یہ شعاعیں کسی کے ساتھ ٹکراتی ہیں تو اس میں سے برقیے خارج ہوتے ہیں۔ برقیے منفی برق کے نہایت چھوٹے چھوٹے ذرے ہوتے ہیں۔ اور دنیا کی تمام چیزیں برقیوں اور مثبت برق کے ذرّوں کی ترکیب سے بنی ہوئی ہیں۔

برقیوں کے شمار اور ان کی رفتار کی پیمائش کے نہایت صحیح طریقے موجود ہیں۔ اور ان طریقوں سے معلوم ہوا ہے کہ جب "لا" شعاعیں کسی گیس میں سے گزرتی ہیں تو گیس کے تھوڑے سے سالمات میں سے برقیوں کا اخراج ہوتا ہے۔ مثلاً اگر شعاعیں بہت تیز ہوں اور دیر تک گیس میں سے گزریں۔ تو کروڑوں سالمات میں سے صرف ایک سالمہ اثر پذیر ہوگا۔ اگر شعاعوں کی توانائی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہو تو کوئی سالمہ ان کے اثر سے بچنا نہ چاہیئے۔ لیکن فی الواقعہ کروڑوں میں سے صرف ایک پر اثر ہوتا ہے یہ تو صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ نور کی توانائی چھوٹے چھوٹے ذرّوں میں مجتمع ہو کیونکہ اس صورت میں گیس کے بہت سے سالمات نور کے ذروں کو ٹکرائے کے بغیر گزر جائیں گے۔

سالمات میں سے خارج ہونے والے برقیوں کی رفتار کی پیمائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ رفتار روشنی کی تیزی پر منحصر نہیں ہوتی۔ اگر گیس مخزن نور سے دور مدھم روشنی میں ہو تو اس میں سے کم برقیے خارج ہوتے ہیں لیکن اگر وہ مخزن نور کے نزدیک تیز روشنی میں ہو تو نسبتاً زیادہ برقیے خارج ہوتے ہیں۔ لیکن برقیوں کی رفتار دونوں حالتوں میں برابر ہوتی ہے۔ اگر نور کی توانائی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی تو تیز روشنی کے زیر اثر خارج ہونیوالے برقیوں کی رفتار تیز ہوتی اور مدھم روشنی کے زیر اثر خارج ہونے والے برقیوں کی رفتار سست ہوتی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نور کی توانائی تمام فضا میں پھیلی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ ذرّوں میں جمع ہوتی ہے۔ اور جب کوئی نور کا ذرہ کسی سالمہ کے ساتھ ٹکراتا ہے تو سالمہ میں سے برقیہ نکل کھڑا ہوتا ہے۔

تجربوں سے ثابت ہوا کہ جب کم طول موج کی کیمیائی شعاعیں یا لاشعاعیں کسی مجلّا دھات پر پڑتی ہیں تو اس میں سے بھی برقیوں کا اخراج ہوتا ہے جن کی رفتار روشنی کی تیزی پر منحصر نہیں ہوتی البتہ گیس یا دھات میں سے نکلنے والے برقیوں کی رفتار نور کے طول موج پر منحصر ہوتی ہے،

اگر شعاعوں کا طول موج کم ہو تو ان کے اثر سے خارج ہونیوالے برقیوں کی رفتار مقابلتاً تیز ہوتی ہے۔

توانائی کی اکائیاں:۔ اس عمل کی توجیہ پلینک نے یہ کی ہے کہ نور مسلسل امواج کی شکل میں منور جسم سے خارج نہیں ہوتا۔ بلکہ توانائی کی اکائیاں یا مقداریں خارج ہوتی ہیں۔ جن کا رویہ ذرّوں کا سا ہوتا ہے مثلاً اگر سوڈیم کا شعلہ جل رہا ہو تو اس میں سے مسلسل توانائی موجوں کی شکل میں خارج نہ ہوگی بلکہ توانائی کی اکائیاں یکے بعد دیگرے نکلتی رہینگی اور ہر ایک اکائی میں توانائی برابر ہوگی۔

غرض کہ منور جسم میں سے توانائی کے ذرے خارج ہوتے ہیں اور ہر ایک ذرہ میں توانائی کی مقدار ہوتی ہے۔ جب توانائی کا ذرہ کسی برقیے کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے تو توانائی برقیہ کو منتقل ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برقیہ دھات یا گیس میں سے خارج ہو جاتا ہے تیز روشنی میں توانائی کی مقداریں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور مدھم روشنی میں کم۔ اس لئے جب تیز روشنی دھات پر پڑتی ہے تو زیادہ مقادیر کو برقیوں کے ساتھ تصادم کا موقعہ ملتا ہے۔ اور زیادہ برقیے خارج ہوتے ہیں۔ مدھم روشنی کی کم مقادیر برقیوں کے ساتھ ٹکراتی ہیں اس لئے کم برقیے خارج ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ہر ذرہ میں توانائی یکساں ہے اس لئے دھات میں سے خارج ہونے والے برقیوں کی رفتار برابر ہونی چاہیئے۔

لیکن توانائی کی اکائی نور کی نوعیت پر منحصر ہوتی ہے جوں جوں شعاعوں کا ارتعاش تیز ہوتا جاتا ہے یا طول موج کم ہوتا جاتا ہے ان کی توانائی کے ذرے زیادہ زوردار ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے کم طول موج کی شعاعوں کے اثر سے خارج ہونے والے برقیوں کی رفتار بھی تیز ہوتی ہے۔ زیادہ طول موج مثلاً حرارت، کی شعاعوں کی مقادیر میں توانائی اتنی کم ہوتی ہے کہ ان کے تصادم سے برقیوں کا اخراج نہیں ہو سکتا۔

پلینک کے نظریہ کی بہت سے تجربوں سے تصدیق ہو چکی ہے۔ مثلاً مختلف طول موج کی شعاعوں کے زیر اثر خارج ہونے والے برقیوں کی توانائی ناپی گئی تو وہ اتنی ہی نکلی جتنی کہ پلینک کے حساب کے مطابق ان شعاعوں کی اکائیوں کی ہونی چاہیئے۔

پلینک کا نظریہ نیوٹن کے قیاس اخراج کی نئی شکل ہے۔ کیونکہ نیوٹن کے قیاس کی طرح اس نظریہ کے مطابق بھی نور کی اشاعت مسلسل امواج کے ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ توانائی کے ذرّوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔

لیکن اس نظریہ کے قبول کرنے میں کئی مشکلات ہیں۔ اول تو یہ کہ توانائی کی اکائیاں مختلف چیزوں کے جوہروں میں سے خارج ہوتی ہیں تو ان کی خاصیتوں میں اختلاف ہونا چاہیئے۔ لیکن فی الواقع اختلاف نہیں ہوتا۔ نیز توانائی کی مقداروں میں اس قدر تفاوت ہے کہ لا شعاعوں کے ذرے مرئی شعاعوں کے مقابلہ میں کئی ہزار گنا زوردار ہوتے ہیں لیکن اس فرق کے باوجود ہر ایک قسم کی شعاعوں کی رفتار برابر ہوتی ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ توانائی کے ذرّوں کی رفتار واسطہ سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ اس کی کیفیت اخراج سے۔

ان کے علاوہ نور کے بعض مظاہر کی توجیہ امواج کے بغیر ناممکن نظر آتی ہے۔ مثلاً دو شگافوں کی روشنی کا باہم ملکر تاریکی پیدا کرنا یا شعاعوں کا منکسر ہو کر اوٹ کے عقب میں پہنچ جانا۔

ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے ہمیں نظریہ برقی مقناطیسی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے نور کی شعاعیں برقی مقناطیسی آثار ہیں۔ جو رفتار نور کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ کو منتقل ہوتے ہیں۔

برقی خطوط قوت کے حلقے:۔ تمام معلومات کو پیش نظر رکھکر نور کے اخراج کی یہ صورت قرار دی گئی ہے۔ کہ برقی خطوط قوت کا ایک حلقہ جسم کے جوہر میں سے خارج ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ حلقہ خارج ہونے لگتا ہے تو اس میں زور کی ارتعاشی حرکت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے فضا میں برقی مقناطیسی امواج بھی پھیل جاتی ہیں۔ حلقہ، برقی خطوط قوت کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی رفتار نور کی رفتار کے برابر ہوتی ہے، نیز برقی مقناطیسی امواج بھی اسی رفتار سے چلتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امواج حلقے کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ لیکن نور کی توانائی کا بیشتر حصہ حلقہ میں ہوتا ہے۔ امواج میں توانائی کی مقدار برائے نام ہوتی ہے منور جوہر میں سے خارج ہونے والی شعاع کا حلقہ یا قلب جو تمام توانائی کا حامل ہوتا ہے فضا میں سے گزرتا ہے تو اس کی جسامت اور شکل میں کوئی انقلاب واقع نہیں ہوتا اور اس کے گرد برقی مقناطیسی امواج کا جو سلسلہ قائم ہوتا ہے اس کا طول موج حلقہ کے گھیرے کے برابر ہوتا ہے

جب یہ حلقہ کسی جسم کے سالمہ کے ساتھ ٹکراتا ہے تو توانائی اس جسم میں چلی جاتی ہے۔ جس کے اثر سے یا تو برقیہ سالمہ میں سے خارج ہوجاتا ہے اور یا اس سالمہ کی توانائی میں ایزادی ہوجاتی ہے۔ پس تیز رفتار برقیہ کی پیدائش حلقہ کی موت یا توانائی کے ذرہ کی تباہی کے ساتھ وابستہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر نور کی اشاعت برقی مقناطیسی امواج سے گھرے ہوئے حلقوں کی شکل میں ہوتی ہے تو دو شگافوں کی روشنی مل کر کسی خاص مقام پر تاریکی کیسے پیدا کرتی ہے۔ اس مظہر کی توجیہ یہ ہے کہ حلقے برقی خطوط قوت کے حلقے ہوتے ہیں اس لئے ان کی سمت برقی مقناطیسی قوی کے عمل سے تبدیل ہوسکتی ہے جب امواج کو باریک شگافوں میں سے گزرنا پڑتا ہے تو ان کے اجتماع کی وجہ سے باریک شگافوں میں برقی اور مقناطیسی قوتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور ان کی سمت بھی وہ نہیں ہوتی جو شگافوں میں پہنچنے سے پہلے ہوتی ہے پس شگافوں میں سے گزرنے کے بعد توانائی کے حلقوں کی سمت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حلقے سیدھے جانے کے بجائے بعض مقامات کی طرف جھک جاتے ہیں۔ جن مقامات پر حلقوں کا اتصال ہوتا ہے وہاں روشن دھاریاں بنجاتی ہیں اور جہاں حلقے نہیں پہنچتے وہاں تاریک دھاریاں ہوتی ہیں۔

چونکہ حلقوں کا رخ امواج کی برقی مقناطیسی قوی کی وجہ سے تبدیل ہوتا ہے۔ اس لئے تاریک اور روشن دھاریوں کے مقام وہی ہوتے ہیں جو نظریۂ تموج کے مطابق ہونے چاہئیں۔ البتہ جدید نظریہ کے مطابق تاریکی یا روشنی امواج کے باہمی تعامل سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ توانائی کے حلقوں کے تصادم سے۔

پس جدید ترین نظریہ کی رو سے نور کی اشاعت نہ تو صرف ذرات کے ذریعہ ہوتی ہے اور نہ محض امواج کے ذریعہ۔ بلکہ اس کی شعاعوں میں ذرات اور امواج دونوں شامل ہوتے ہیں یعنی نور کا ایک حصہ نظریۂ تموج کے مطابق برقی مقناطیسی امواج پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرے حصہ کی ساخت نظریۂ اخراج کی مطابق توانائی کے ذروں کی ہوتی ہے۔

چہ گفت ؟!

(غیر مطبوعہ حضرت عظیم مرحوم)

قاصد آمد گفتمش آں ماہِ سیمیں بر چہ گفت
گفت با ہجرم بساز و گفتمش دیگر چہ گفت ؟

گفت دیگر پا ز حد خویش نگزارد بروں !
گفتمش نگزاشتم پا، گفتمش از سر چہ گفت ؟

گفت سر را بایدش از خاک رہ کمتر شمرد !
گفتمش کمتر شمردم ! زیں تنِ لاغر چہ گفت ؟

گفت جسم لاغرش را از غضب خواہیم سوخت
گفتمش من سوختم ! در بابِ خاکستر چہ گفت ؟

گفت خاکستر چو گرد خواہش برباد داد،
گفتمش برباد کردم آں ز خیر و شر چہ گفت ؟

گفت خیر و شر نباشد عاشقاں را در حساب
گفتمش ایں ہم حسابے در حق محشر چہ گفت ؟

گفت در محشر بیکدم زندہ اش خواہیم کرد !
گفتمش من زندہ گشتم ! از لبِ کوثر چہ گفت ؟

گفت با ما بر لبِ کوثر نشیند عاقبت
گفتمش چوں عاقبت ایں بہت زیں خوشتر چہ گفت

گفت دیگر نگذرد از خاطرم یاد عظیم !
گفتمش دیگر بگو ؟ گفتا، مگو، دیگر چہ گفت ؟!!

نعت سرور کائنات ﷺ

(در بحر طویل، از بیاض قلمی مولوی عبدالباسط صاحب مرادآبادی)

سلطانِ دیں پیدا ہوا، شاہ زمیں پیدا ہوا، ماہ جبیں پیدا ہوا، عین الیقیں پیدا ہوا
مسند نشیں پیدا ہوا، دل کا نگیں پیدا ہوا، وہ نازنیں پیدا ہوا، نازاں ہیں جس سے جان و تن

نورِ شہِ کون و مکاں، تھا کنز مخفی میں نہاں، جس سے کہ پنہان و عیاں دونوں تھے بے نام و نشاں
آگہ نہ تھا کن سے مکاں، معدوم تھے دونوں جہاں، تن کو نہ تھی پروائے جاں، جاں کو نہ تھی فکرِ بدن

جو غیب میں محصور تھا اس نور سے منظور تھا، در پردہ جو منشور تھا، اس نور سے معمور تھا،
یہ نور سے مشہور تھا اور نور سے مذکور تھا، جو کچھ کہ تھا یہ نور تھا بے کیف و کم بے ما و من!

وہ سایۂ ذات احد، وہ مظہر نور صمد، وہ منظر فیض ابد، فرماں دہِ ہر نیک و بد
لایا جہاں میں مستند مہرِ نبوت کی سند، محسودِ اربابِ حسد، محمودِ ربّ ذوالمنن!

وہ بادشاہ دو جہاں، وہ قبلہ گاہ مقبلاں، وہ رہنمائے انس و جاں، وہ دستگیر بیکساں
وہ مرہمِ دل خستگاں، وہ چارۂ دردِ نہاں وہ مصدرِ فیض عیاں و مظہرِ سترّ و علن!

اس کا براق بادپا، شرمندہ ہو جس سے ہوا، اس نازنیں کو لے اڑا جسطرح نکہت کو ہوا
بس یہ گیا اور وہ گیا، جا عرش تک پہنچا دیا، سرگشتہ مثل برق تھا مانندِ گردوں چرخ زن

جس دم ہوا وہ جلوہ گر سب گر پڑا کسریٰ کا گھر اس کی تجلی دیکھکر کہتے تھے سب اہل بصر
یارب یہ کیسا ہے بشر جس کی ادا سے بےخبر آتا ہے عالم میں نظر سب سے نرالا بانکپن

کیا حسن کیا رخسار ہے کیا طرۂ طرار ہے کیا نرگس بیمار ہے کیا ابروئے خمدار ہے!
کیا لب ہے کیا گفتار ہے کیا قد ہے کیا رفتار ہے کیا جامہ کیا دستار ہے پوشاک کی دیکھو پھبن

عمامہ جو ہے زیب سر اس کی صفائی دیکھکر، مہتاب سے بگڑا قمر، خورشید سے روٹھی سحر
پٹکا تو دیکھو کس قدر ہے زینت موئے کمر، اس قامت بے سایہ پر کتنا ہے زیبا پیرہن

ایام مولود آگئے، آثار بہبود آگئے اوقات محمود آگئے اسباب مقصود آگئے،
احبابِ مسعود آگئے، اعیان موجود آگئے، راحت کے دن زود آگئے، تازہ ہوئے عہد کہن

عشاق کیا ساماں کریں، کیا ہدیۂ سلطاں کریں، کیا دعوتِ مہماں کریں کیا خدمتِ شایاں کریں
ہاں نذر نقد جاں کریں، جاں فدیہ جاناں کریں، اس ماہ پر قرباں کریں مادر پدر، فرزند و زن

ہے بزم عیش جاوداں، گم ہے شکیلِ خستہ جاں، دیوانہ دیکھو ہے کہاں کہدو کہ حاضر ہو یہاں
وہ بلبل ہندوستاں ہو فارسی میں نغمہ خواں، مشتاق ہیں پیر و جوانِ نکتہ سنجان دکن!!

قطعہ

ایں چہرۂ زیبائے تو، ایں قامتِ رعنائے تو، ایں نرگسِ شہلائے تو، ایں زلف عنبر سائے تو
مژگانِ صف آرائے تو، ابروئے جانفرسائے تو، لعل تبسم سائے تو، دندان تو زیب دہن

اول زمہ کردہ نشاں، ثانی ز محشر امتحاں، ثالث شکیب از مردماں، چارم دم از زنجیر پا
پنجم دل از دست بتاں، سادس ز دل تاب و تواں، ہفتم قرار از تن، ز جاں ہشتم مدار جان و تن

مٹی کی ہفت منزلہ عمارتیں

(از جناب شیخ محمد خیر اللہ صاحب شیخ نظامی آبو روڈ)

ابھی تک عوام کا یہ خیال بالکل صحیح اور بجا سمجھا جاتا رہا کہ بلند ترین عمارات یورپ اور امریکہ سے مختص ہیں لیکن اب موجودہ تحقیقات نے اس خیال کی تردید کر دی ہے۔ کیونکہ ایسی عمارتیں جیسی یورپ اور امریکہ میں ہیں اور جن کی حیرت انگیز بلندی نے دنیا کو ششدر و حیران بنا دیا ہے دنیائے مشرق میں بھی دریافت ہو گئی ہیں جو اب سے پہلے پردۂ گمنامی میں چھپی ہوئی تھیں۔ ہم نہایت فخر و مباہات کے ساتھ اس راز کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے بتانا چاہتے ہیں کہ مشرق کا وہ مایۂ ناز خطہ کہاں ہے؟ وہ جزیرۃ العرب کے جنوب میں ایک وسیع صوبہ **حضرموت** ہے جو ملک عرب کے پورے جنوبی ساحل پر پھیلا ہوا ہے۔

یہی وہ علاقہ ہے جہاں کی عمارتیں نہایت بلند ہیں یہاں کا کوئی مکان بھی ایسا نہیں جو تین منزلوں سے کم ہو اور انتہائی بلندی تو سات سات منزلوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ یہ تمام عمارات صرف "آب و گل" سے بنائی گئی ہیں۔ اس جدید دریافت نے اہل یورپ اور اہل امریکہ کو یکساں طور پر انگشت بدنداں کر دیا اور ان کے زعم باطل کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ چنانچہ وہ خود ان عمارات کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:۔

"واقعی اہل عرب کا یہ کارنامہ کچھ کم تعجب خیز نہیں۔ کہ انہوں نے اتنی بلند عمارتیں کیونکر تعمیر کیں اور وہ بھی صرف مٹی سے"

"حضرموت" خشکی کا ایک طویل حصہ ہے جس کی لمبائی تقریباً ۱۰۰ میل اور چوڑائی ۴ میل سے ۶ میل تک بیان کی جاتی ہے اس کی وسعت خلیج عمان سے لیکر خلیج عدن تک کا بری علاقہ گھیرے ہوئے ہے۔ اگر ہم اس صوبہ کا سفر مشرق سے مغرب کی طرف کریں تو پہلے ہم کو ریگستانی علاقہ ملے گا۔ بعد ازاں (تقریباً نصف علاقہ طے کرکے) یہی ریگستان پہاڑی سلسلوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جو جنوبی مغربی عرب میں عدن کی گرد و نواح میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ کوہ ختم ہو کر ساحل سمندر آ جاتا ہے۔ یہاں ایک گاؤں ہے جس کا نام "سیھوت" ہے یہ بندرگاہ عدن سے ۴۰۵ میل مشرق کی طرف ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ یہ طویل خطہ زمین عرب کے جنوبی سمت میں بالکل متوازی چلا گیا ہے۔ "حضرموت" میں ایک چھوٹا سا گاؤں اور ہے جس کا نام "القطن" ہے۔ اسی گاؤں میں عمارات بلند دریافت ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے یہ مقامات معلوم نہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ یہ نام کسی نقشے میں بھی نہیں پائے جاتے۔

"حضرموت" میں سوائے چند نخلستانوں کے کوئی خاص پیداوار نہیں تمام صوبہ بنجر ہے (سوائے جنوبی پہاڑیوں کے) جہاں ظہر ناخطر سے خالی نہیں۔ اور شاید یہی اس کی وجہ تسمیہ ہو کیونکہ "حضر" عربی میں "اقامت" کو کہتے ہیں۔ "حضرموت" کے معنے ہوئے "موت کا گھر"۔

جنوبی پہاڑیوں میں کئی وادیاں ہیں اور ہر دامن کوہ میں گاؤں آباد ہیں۔ جن کے چاروں طرف خرمے کے درخت ہیں۔ اور انہی گاؤں میں وہ بلند عمارات ہیں جنکا تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہاں کے دیہات میں "شبام" سب سے بڑا گاؤں ہے جس کی حد بندی مٹی کی دیواروں سے کی گئی ہے جو بہت بلند تو نہیں ہیں مگر ایک سطح مرتفع پر اٹھائے جانے کے باعث مقابلتاً کافی اونچی ہو گئی ہیں مکانات کی ترتیب اسطرح ہے کہ ہفت منزلہ مکانات اسی چار دیواری کے سہارے بنائے گئے ہیں اور کم بلند مکانات وسط گاؤں میں ہیں جس سے اہل شبام کی دانشمندی ظاہر ہوتی ہے یعنی اگر کوئی دشمن حملہ کرے تو پہلے صرف دیواروں اور بلند مکانات کو نقصان پہنچے باقی عمارات محفوظ رہیں۔ اس گاؤں کا نظارہ دور سے بہت دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ یہ ہفت منزلہ عمارات نہایت مضبوط ہیں۔ تب ہی اہل یورپ بھی ان کے فن تعمیر کا لوہا مان گئے۔ اہل شبام آسودہ حال ہیں۔ سلطان شبام کے خزانہ میں گیارہ کروڑ روپیہ محفوظ ہے۔ قصر سلطانی وسط باغ (خرما) میں واقع ہے۔ "شبام" ہی ’کوئٹی‘ کا خاص شہر ہے۔

افسانہ

انتقام

(از جناب آوارہ یوسفی)

پچپن سالہ حمید، نیک طینت اور شریف النفس حمید، سلمیٰ کا شوہر شمسہ کا باپ اور بنک کا ہیڈ کلرک تھا۔ شمسہ خوبصورت تھی اور خوب سیرت بھی۔ وہ حسین بھی تھی اور ملیح بھی۔ اس کی آنکھیں رسیلی بھی تھیں اور بڑی بڑی بھی۔ لیکن نہ ہرنوں کی طرح نہ چکاروں کی سی اس کی کمر بھی پتلی تھی لیکن انسانوں کی طرح۔ یہ سب کچھ تھا مگر وہ مظلوم تھی۔ کیونکہ سلمیٰ اس کی سوتیلی ماں تھی۔

حمید ایک روز حسب معمول دفتر میں کام کر رہا تھا۔ منیجر نے اسے بلا کر ۲۵ ہزار کے نوٹ دیئے کہ خزانہ میں داخل کر کے رجسٹر میں درج کر لے جیسے ہی وہ اپنے کمرہ میں آیا چپڑاسی نے اطلاع دی کہ" اس وضع کی ایک لڑکی باہر آپکی منتظر ہے۔ اندر آنے اور نام بتانے سے انکار کرتی ہے"۔ یہ سنکر وہ مضطرب ہو گیا۔ اور دل میں کہا کہ گھر پہ یقیناً کوئی ناگوار حادثہ پیش آیا ہے۔ یہ سوچکر وہ فوراً باہر آیا دیکھا تو واقعی شمسہ چادر میں بدن کو چھپائے کھڑی تھر تھر کانپ رہی ہے۔ جونہی حمید قریب پہنچا اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں دیا اور جواب کے انتظار میں ساکت کھڑی ہو گئی۔ سلمیٰ نے لکھا تھا" پانچسو روپے فوراً مجھے بھیجدو ایک زیور خریدنا ہے"۔ "پانچسو" حمید نے بلند آواز سے پڑھا اور ملامت آمیز نظروں سے شمسہ کو دیکھا۔ شمسہ، مظلوم شمسہ نے سر جھکا لیا۔ آہ! وہ کس طرح بتا سکتی تھی کہ اس ظالم عورت نے اسے کیونکر آنے پر مجبور کیا ہے۔ کیونکہ اس سے حمید کا غصہ اور بھی تیز ہو جاتا۔ اس لئے وہ خاموشی سے گھر لوٹ گئی۔

شکور جو دفتر میں معمولی حیثیت کا منشی تھا ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ کسی کارکن عملہ کو غافل پائے اور ہاتھ صاف کر لے۔ وہ چند ضروری کاغذات لیکر حمید کے کمرہ میں داخل ہوا۔ معاً اس کی نظر نوٹوں کی گڈی پر پڑی اور قبل اس کے کہ کسی کو اس پر شک ہوتا حمید واپس آئے نوٹ اس کی جیب میں تھے اور وہ کمرے سے باہر۔ اس کے فوراً ہی بعد حمید کمرہ میں داخل ہوا۔ اس نے اس رقعہ کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈالا۔ رجسٹر اٹھایا اور نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر رجسٹر کھولنے لگا۔ ہاتھ آگے بڑھتا جاتا تھا لیکن نوٹوں تک پہنچنا دشوار تھا۔ اب اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا اور اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے کمرہ کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ اور زور زور سے چلانے لگا۔ یہانتک کہ منیجر بنک بھاگا ہوا آیا۔ جب اسے اس گمشدگی کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی مفلس حمید پر الزام لگانے سے نہ چوکا۔ چپراسی نے بھی شہادت دی کہ ابھی ایک عورت ان سے ملنے آئی تھی۔ اور ایک پرچہ بھی دی گئی تھی۔ پرچہ کی تفتیش شروع ہوئی اور اس کے پرزے ردی کی ٹوکری میں سے دستیاب ہو گئے۔

بالآخر منیجر کی طرف سے عدالت میں مرافعہ کیا گیا۔ اور بدنصیب حمید شام سے پہلے پہلے حوالات کی تنگ و تاریک کوٹھری میں محبوس تھا۔ لیکن سلمیٰ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ" تو نہ سہی اور سہی" کی قائل تھی۔ نہ صرف حمید اور شمسہ کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں بلکہ اس کے تمام دوستوں، عزیزوں اور پڑوسیوں کی شہادتوں نے بھی جو اس کی شرافت نفس اور نیک نیتی کے بارہ میں دی گئیں کوئی فائدہ نہیں دیا۔ کیونکہ حکام عدالت جرأت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ حمید جیسے مفلس آدمی کے مقابلہ میں خان بہادر حمید اللہ خاں جیسے معزز شخص کی جو ایک مشہور بنک کا منیجر تھا تکذیب کی جائے۔ چنانچہ دو سال کے لئے ہیڈ کلرک کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔

اب شمسہ کیلئے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور رات کو خان بہادر حمید اللہ خاں منیجر بنک کی خدمت میں پہنچکر انتہائی عاجزی سے گڑگڑائی، منت و زاری کی۔ ہاتھ جوڑے اور اپنے باپ کی رہائی کے لئے رو رو کر درخواست کرنے لگی۔ پہلے تو منیجر سنجیدگی سے گفتگو کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لب و لہجہ کو بدلا اور ڈھٹائی سے

شمسہ کی طرف بڑھا - پاکدامن لڑکی نے اپنی عصمت کی حفاظت کیلئے سخت ترین جد وجہد کی - اور جونہی اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا، منیجر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا - اب وہ سخت پریشان اور سراسیمہ تھی - یکایک اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے پستول پر پڑی - شمسہ نے فوراً بڑھ کر پستول اٹھالیا - وحید اللہ یہ دیکھکر اس معصوم سے گتھم گتھا کرنے لگا - مگر اس نے بھی فیر کر ہی دیا - جس سے منیجر صاحب کا بازو خفیف سا زخمی ہو گیا -

ثبوت مکمل اور جرم ثابت تھا - پولیس کو زیادہ تفتیش نہ کرنی پڑی - اور شمسہ تین سال کے لئے زنانہ جیل میں پہنچا دی گئی -

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے - اب کسی کو یاد بھی نہیں کہ دو مظلوموں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا تھا اور آخر ان کا کیا حشر ہوا - دنیا برابر اپنے کاروبار اور دلچسپیوں میں مصروف تھی -

شمسہ جب اپنی میعاد پوری کر کے جیل سے نکلی تو جیسے کبھی کوئی اس کا تھا ہی نہیں - غریب کا باپ حمید جیل کے ہسپتال میں مدتوں کا قید وبند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد ہو چکا تھا - اور سلمیٰ اس سے بھی کچھ پہلے گھر سے رفو چکر - اب جو آکر دیکھتی ہے تو گھر میں قفل پڑا ہوا ہے - کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے اور کہاں جائے - اپنی پوزیشن پر جو غور کرتی ہے تو اتنی نازک کہ کوئی شریف آدمی سزا یافتہ عورت کو گھر میں رکھنے کا بھی روادار نہیں ہو سکتا - جوان صورت تن تنہا بے وارث و مددگار اکیلے گھر میں رہے تو کیونکر؟ وہ اپنی اس رہائی و آزادی کو قید سے بھی بدتر پاتی تھی - وہ اپنے گھر کے سامنے زمین پہ بیٹھی بہت دیر تک روتی رہی - - - - - پھر کچھ سوچنے لگی . . . . اس کے بعد ایک مردانہ عزم کے ساتھ "اچھا دیکھی جائیگی" کہکر اٹھ کھڑی ہوئی - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی حتمی فیصلہ کر کے اٹھی ہے - اور اس "اچھا دیکھی جائیگی" میں پورا زور اور کافی سے بھی زیادہ خود اعتمادی موجود ہے -

(۲)

اپنے گزشتہ جرائم کو کون یاد کرتا ہے، خان بہادر منیجر بنک بھی کیوں یاد کریں - یہ کونسا پہلا گناہ تھا جس کا کچھ احساس یا پشیمانی ہوتی

آرام سے کوٹھی میں رہتے ہیں - تھیٹر دیکھتے ہیں، سینما جاتے ہیں - عیش کرتے ہیں - اور کیوں نہ عیش کرتے ابھی کل کا دن ہے کہ شوکر منشی سے ۲۵ ہزار کے نوٹ چرِوائے ہیں - مفت کی رقم پر کس کا دل دکھا ہے جو ان کا دکھے - ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے ؛ عاقبت کی خبر خدا جانے ؛

پر عمل بیرا ہیں - اور ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو ؛ از مکافات عمل غافل مشو ؛

سے بالکل بےخبر اور غافل - چنانچہ ان دنوں میڈن تھیٹر کی مشہور رقاصہ مہرو سے محبت کے پینگ بڑھا رہے ہیں - جس کی محشر خرامیاں پازیب کی ہر جھنکار سے سینکڑوں شوقین مزاجوں کا دل چھین لینے کی عادی مجرم ہیں - منیجر صاحب صرف اسے دیکھنے کے لئے روزانہ فرسٹ کا ٹکٹ خریدتے - شان امارت دکھاتے اور دل پہ اس کا فرما جراکی کا نرادائیوں کے تیر و نشتر کھاتے ہیں اور ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر واپس چلے آتے ہیں - آخر ایک دن انہوں نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ مہرو کو ہمیشہ کے لئے اپنا کرکے چھوڑونگا رقاصہ اور پھر ایکٹرس! جسے تصنع اور بناوٹ سکھائی جاتی ہے جس کا سب سے بڑا کمال ہی یہ ہے کہ وہ بہترین طریق پر بہروپ بھرے اور فریب دے سکے - اسے بھلا کسی مالدار بیوقوف کے ساتھ اظہار محبت کا ایکٹ ادا کرنے میں کیا تامل ہو سکتا ہے -

خان بہادر منیجر صاحب نے اپنے تعلقات بڑھانے کے لئے بنک کا ہزار ہا روپیہ مہرو کے زیورات و ملبوسات میں تبدیل کر دیا - اُس نے بھی خاطر تواضع میں کمی نہ کی - انہوں نے اگر ایک دفعہ کہا کہ پیاری مجھے تم سے محبت ہے تو اُس قتالہ عالم نے دو دفعہ کہا کہ مجھے تم سے عشق ہے - . . . . ابھی اس عشق و محبت نے قول سے فعل کی صورت اختیار نہ کی تھی کہ ایک شب منیجر صاحب گھبرائے ہوئے مہرو کے مکان میں داخل ہوئے - وہ مع اپنی خان بہادری کے لرزہ براندام تھے - انہوں نے مہرو کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے اپنے آپ کو سنبھالا - اور لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہنے لگے "مہرو - مہرو! سنتی ہو؟ ایک صندوقچہ میں قیمتی زیورات وغیرہ رکھ لو - اور آؤ ہم رات کی تاریکی میں کسی طرف نکل چلیں - میرے اوپر ۵ ہزار کا غبن

ثابت ہو اور وارنٹ جاری ہو چکا ہے۔ پولیس گرفتاری کی فکر میں چل چکی ہے۔ اگر میں چند منٹ یہاں ٹھیرا تو گرفتار ہو جاؤں گا۔"

مہرو نے اسے تسلی دی۔ اور تشفی آمیز باتوں سے مطمئن کر کے کمرے میں بٹھایا۔ پھر اس کمرہ کو اظہار حفاظت و ہمدردی کے رنگ میں چاروں طرف سے بند کر دیا۔ خود دوسرے کمرے میں جا کر پولیس کو ٹیلیفون کیا:-

"کیا انسپکٹر کریم بخش ہیں۔۔۔۔ میں ہوں مہرو۔۔۔ نمبر ۱ میں عرض کرتی ہوں۔۔۔۔ خان بہادر وحید اللہ خاں منیجر بنک۔۔۔۔ آپ سمجھ گئے؟۔۔۔۔ جسقدر جلد ہو سکے۔۔۔"

ٹیلیفون کر کے مہرو پھر وحید اللہ کے پاس پہنچی۔ اس نے پوچھا مہرو! تم تیار ہو؟ ابھی وہ پورے الفاظ بھی ادا نہ کر چکا تھا کہ مہرو کے خوفناک قہقہہ نے اس طلسم کو توڑ دیا۔ اس نے کہنا شروع کیا:-

"مہرو۔ مہرو۔ وحید! تو مجھے نہیں جانتا؟ تجھے اپنے بنک کے ہیڈ کلرک حمید۔ اور اس کی بیٹی شمسہ کا انجام معلوم ہے؟ پھر تو آج مجھ سے کیا توقع رکھتا ہے؟؟"

شمسہ! شمسہ!! دو مرتبہ وحید اللہ کے منہ سے نکلا۔ اور دوسرے لمحہ وہ شمسہ کے پاؤں پر جھکا ہوا گڑگڑا رہا تھا۔ شمسہ تھوڑی دیر چپ کھڑی رہی۔۔۔۔۔۔ آخر عورت ذات تھی۔ پہلو میں رقیق اور معصوم دل رکھتی تھی۔ اس نے کہا وحید اٹھ۔ میں نے سنا ہے کہ معاف کرنا شدید ترین انتقام ہے۔ اس لئے میں تجھے معاف کرتی ہوں۔ ادھر پولیس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ادھر کمرہ کی عقبی کھڑکی کھلی۔ وحید اللہ شب کی تاریکی میں نظروں سے غائب ہو گیا۔

(۳)

لیکن ابھی قدرت کو انتقام کی تصویر مکمل کرنا تھی۔ ان واقعات کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ وحید اللہ متعدد خوفناک بیماریوں کا شکار ہو کر آگرہ کے مشہور ڈاکٹر زیدی کے اسپتال میں داخل ہوا۔

ایکدن نرس نے زیدی کو اطلاع دی کہ ایک مریض قریب المرگ ہے زیدی معہ اپنی بیگم کے فوراً ہسپتال پہنچا۔ بیگم زیدی مریض کو دیکھتے ہی چونک پڑی۔ مریض نے اٹھنے زرد اور کمزور ہاتھ اٹھانے کی ناکام کوشش کی اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا شم۔۔۔۔ سہ۔۔"

مطارحاتِ زرّیں

(جناب چودھری نصیرالدین صاحب نصیر راجگڑھی)

کھو دیا دنیا سے مجھ کو حسرتِ ناکام نے
زندگی بیکار کر دی گردشِ ایّام نے!

دل کی دنیا میں قیامت کروٹیں لینے لگی
لب تک آتے ہی غضب ڈھایا کسی کے نام نے

شورِ یارب، نالۂ شبگیر، آہِ صبحدم،
ہجر میں کیا کیا کیا ہے عاشقِ ناکام نے!

کاش وہ آلام بھی جو ساری دنیا کو دیئے
لکھ دیئے ہوتے مری تقدیر میں قسّام نے!

زندگی کی آرزو بھی اب تو رخصت ہو چکی
کر دیا مایوس ایسا کثرتِ آلام نے!

اللہ اللہ خونِ ناحق کی پشیمانی نصیر
خون کے آنسو بہائے تیغِ خون آشام نے



سراج الدین ظفر

افسانہ

صحیح علاج

از جناب سراج الدین ظفر
۱۱۹ سرکلر روڈ - لاہور۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

"ارے کون ہے تو"

ہری کا ہاتھ رک گیا - اس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ چند قدم پر ایک حسین دوشیزہ قہر آلود نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔

"تھوڑی سی گھاس کاٹنا تھی دیوی" خوف اور رعب حسن سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"بس بس کوئی گھاس واس نہیں۔ چور کہیں کا۔ تیرے باوا کا کھیت تھا جو یونہی چلا آیا۔" غصہ سے اس کا حسین چہرہ تمتا کر اور زیادہ دلکش بن گیا۔

"خفا کیوں ہوتی ہو دیوی لو میں چلا جاتا ہوں" یہ کہکر اس نے ڈرتے ڈرتے گھاس کا گٹھا اٹھا لیا۔

"نہیں نہیں تم یہ گھاس نہیں لے جا سکتے"

ہری نے کچھ ایسی حسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا کہ اس کا دل پسیج گیا۔

"اچھا آج تو لیجاؤ۔ لیکن پھر کبھی نہ آنا - ورنہ . . ."

ہری اور اس کی بوڑھی ماں شیو جی کے مندر کے پاس ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں رہتے تھے اور منڈی میں گھاس بیچکر گزر بسر کرتے تھے۔ آج جب وہ منڈی سے واپس آیا تو اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ صبح کا واقعہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔

"بیٹا آج اداس کیوں ہو۔ طبیعت تو اچھی ہے؟"

ماں نے اسے خاموش دیکھکر پوچھا۔

"اچھا ہوں، ذرا تھک گیا تھا آج . . . کیوں ماں وہ رامو کے کنوئیں کے اس طرف کس کا کھیت ہے؟

"کیا تم ٹھاکر جے سنگھ کے کھیت کو پوچھتے ہو؟

ہری خاموش ہو گیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا - اس نے دل میں کہا "کیا وہ ٹھاکر جی کی لڑکی ہے؟ آہ ظالم کیسی موہنی ہے - اس کی ہرنی کی سی آنکھیں اور غصہ سے تمتایا ہوا چہرہ کیسا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا اسے میں ساری عمر نہ بھولونگا۔ وہ تو کوئی دیوی ہے دیوی - جی چاہتا ہے کہ اسے پھر دیکھوں مگر کیسے دیکھ سکتا ہوں - اس نے تو مجھے منع کر دیا ہے۔ وہ ناراض ہو جائے گی بالکل ناراض ہو جائے گی۔

دوسرے دن صبح جب وہ گھر یا جالی لیکر چلا تو اس کا ارادہ ٹھاکر جی کے کھیت میں جانے کا نہ تھا. . . . . مگر نہ معلوم اس کے پاؤں اس طرف کیوں اٹھ رہے تھے۔

ٹھاکر جی کی نور نظر رویا حسب معمول کھیتوں کے کنارے کنارے چہل قدمی کر رہی تھی . . . . اس نے ہری کو آتے دیکھا۔

"وہ آج پھر آگیا . . . مجھ سے غلطی ہوئی۔ کل گٹھا نہ لیجانے دیتی تو اچھا تھا۔" اس نے اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے کہا

ہری نے جو رویا کو آتے ہوئے دیکھا تو کلیجہ دھک سے ہو گیا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی نگاہیں رحم کی التجائیں کر رہی تھیں تھیں آنکھیں چار ہوتے ہی رویا کا غصہ نہ جانے کیوں کچھ ٹھنڈا سا ہو گیا۔

"ارے تم پھر آگئے؟" اس نے رکتے رکتے کہا۔

"دیوی مجھ سے غلطی ہوئی . . معاف کر دو . . . . "

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر زبان نے یاوری نہ کی۔

"اچھا خیر آج اور لیجاؤ لیکن پھر کبھی نہ آنا"

ہری نے احسانمند نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور گھاس چھیلنا شروع کر دی۔ لیکن آج کی خوشی نے بھی اس کے رواں رواں ہاتھوں پر وہی اثر کیا جو کل خوف و ہراس نے کیا تھا۔

"ہائیں تمہارے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں" رویا نے کہا۔

"کچھ نہیں ذرا یونہی ۔"

روپا اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی ۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی ... میرا نام ... ہری "

اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا ۔

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"یہیں شیوجی کے مندر کے پاس"

روپا کچھ اور پوچھنے کو تھی لیکن یکایک رک گئی ۔ اور یہ دیکھ کر کہ وہ کھیت میں اکیلی ایک اجنبی سے گفتگو کر رہی ہے ایک طرف کو ہولی ۔

اُف کتنی ظالم ہے ۔ میرے حال پر رحم بھی نہیں آتا ۔ پھر آنے کو منع کیا ہے ... اچھا اب میں نہیں آؤنگا ۔

ہری انہی خیالات میں کھویا ہوا منڈی کو چلا گیا شام کو گھر آیا تو طبیعت پریشان تھی ۔

تمام رات بےچینی میں گزری ۔ صبح ہوتے ہی گھاس چھیلنے کے بہانے گھر سے نکل کھڑا ہوا ۔ لیکن آج وہ ٹھاکر جی کے کھیت میں نہ گیا بلکہ ان کے کھیت سے کترا کر ذرا دور ایک اور کھیت کا رخ کیا ۔ اس کی طبیعت ابھی تک مضمحل تھی ۔ وہاں جا کر وہ بیدلی سے گھاس کاٹنے لگا ۔ مگر جلد ہی اس کی طبیعت اکتا گئی ۔ کھرپا ایک طرف رکھ کر وہ گھاس پر لیٹ گیا ۔ اور نہ معلوم کب تک لیٹا رہا ۔ روپا کا تصور اس کے دل اور دماغ میں سمایا ہوا تھا یکایک اس کا سر چکرانے لگا ۔ اور اسے اپنا بدن تپتا ہوا معلوم ہوا ۔ جب وہ گھر پہنچا تو اسے زور کا بخار چڑھا ہوا تھا ۔

روپا الہڑ اور کمسن ۔ روپا عشق سے ناواقف تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ عشق کی چنگاری اس کے دل میں سلگ رہی ہے ۔ ہری کی حسرت بھری نگاہوں نے اس پر خاص اثر کیا تھا ۔ مگر کیا اور کیسا ؟ اس کی اسے مطلق خبر نہ تھی ۔ وہ اس کی یاد میں ایک لذت محسوس کرنے لگی مگر کیوں ؟ یہ وہ نہ جانتی تھی ۔

"وہ غریب معلوم ہوتا ہے ۔ بہت غریب ۔ کہنے کو گھسیارا ہے مگر ویسے گھسیارا معلوم نہیں ہوتا ۔ یہ اور اسی قسم کے خیالات اس کے دل میں چکر لگا رہے تھے ۔ آج روپا دوپہر تک کھیتوں میں پریشان سی پھرتی رہی ۔ اس کا دل ہری کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کا خواہشمند تھا ۔

"آہ ! وہ اب نہیں آئے گا ۔ میں نے اسے کیوں منع کیا" اس نے بار بار اپنے آپ کو ملامت کی اور مایوس ہو کر گھر چلی آئی

اس دن سے وہ ہر روز صبح کے وقت کھیتوں میں چکر لگاتی لہلہاتی ہوئی گھاس پر بیٹھ کے روتی، ہری کے آنے کا انتظار کرتی اس کے آنے کی دعائیں مانگتی اور مایوس ہو کر گھر واپس آجایا کرتی ۔ رفتہ رفتہ اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا ۔ اس کی متجسس آنکھیں نیند سے بیگانہ ہوگئیں ۔ ٹھاکر صاحب بیٹی کی حالت دیکھ کر بہت متفکر ہوئے ۔ ویدوں کو بلایا ۔ علاج شروع ہوا مگر لاحاصل ۔

سردیاں گزر گئیں ۔ بہار آئی ۔ دلوں کی امنگیں جوان ہونے لگیں مگر روپا کی حالت میں کوئی خوشگوار تغیر رونما نہ ہوا ۔ وہ ہری دوب کو دیکھتی اور رہ جاتی ۔ بہار اس کے لئے بالکل بیکار تھی ، بے کیف تھی ۔ خزاں سے بدتر تھی ۔ اس کی ڈوبی ہوئی آنکھیں ابھی تک ہری کا راستہ دیکھ رہی تھیں مگر افسوس ۔

"ہری نہ آنا تھا نہ آیا"

بسنت کا دن آیا ۔ روپا کا زرد چہرہ بسنتی دوپٹہ میں اور زیادہ دلکش معلوم ہونے لگا ۔ وہ بسنت کی پری معلوم ہونے لگی ۔ آئینہ دیکھتے وقت یکایک اسے ہری کا خیال آجاتا ۔ تو اس وقت اس کی آنکھیں پرنم ہوجایا کرتیں ۔ کاش وہ اس وقت اس کے پاس ہوتا ۔ وہ اکثر درشنوں کے لئے شیوجی کے مندر میں جاتی اور تسکین روح کی تجویز کرتی ۔ آج بھی وہ مندر میں گئی اور صدق دل سے ہری کو دیکھنے کی دعائیں مانگتی رہی ۔ اس کے پاس ہی ایک کمزور سی بوڑھی عورت مورتی کے سامنے سر جھکا زار قطار رو رہی تھی ۔ اس کے گریۂ بیکسی ۔ سے روپا کے دل میں ایک ٹھیس سی لگی ۔

"کیوں مائی تم اس قدر کیوں رو رہی ہو۔ تمہیں کیا دکھ ہے؟ کیا میں تمہاری کوئی خدمت نہیں کر سکتی؟"

باہر آکر روپا نے بڑھیا سے دریافت کیا۔

"کیا کہوں بیٹی"۔ بوڑھی عورت نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "میرا اکلوتا بیٹا دو تین مہینے سے بیمار پڑا ہے۔ نہ معلوم اسے کیا ہو گیا ہے حکیموں ویدوں کا علاج بھی کر دیکھا ہے کچھ آرام نہیں ہوتا آہ مجھ سے اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔"

روپا کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں ہری نہ ہو۔

"مائی مجھے اپنے ساتھ لیچلو۔ میں تمہارے لڑکے کو دیکھنا چاہتی ہوں" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور چپ چاپ بڑھیا کے ساتھ ہولی۔

بڑھیا اسے قریب ہی ایک ٹوٹی جھونپڑی کے دروازہ پر کھڑا کر کے وید کو بلانے چلی گئی۔

روپا نے اندر جاکر دیکھا تو چارپائی پر ایک شخص پڑا ہوا بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔

"نہیں نہیں دیوی ناراض کیوں ہوتی ہو۔ تو میں چلا جاتا ہوں"

"ہاں ہاں میں جا رہا ہوں۔ دور۔ بہت دور۔"

روپا چارپائی کے قریب آگئی۔ یکایک اس کی نگاہیں مریض کے چہرے پر پڑیں۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔

ہری چارپائی پر آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ بخار سے اس کا جسم پھنکا جا رہا تھا۔

"ہری۔ ہری!" روپا نے بھرائی ہوئی آواز میں روتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہچانتے ہو؟"

ہری نے آنکھیں کھولدیں۔ . . . "آہ دیوی! اب میں تمہارے کھیت میں کبھی نہیں جاؤنگا۔ مجھے معاف کر دو"

اس نے ہری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "ہری! پرماتما کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔ دیکھو میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ اب ہم تم دونوں ملکر گھاس چھیلا کریں گے۔"

ہری نے بے تابانہ جوش انبساط سے اپنے ہاتھ روپا کے گلے کی طرف بڑھا دیئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں نے اپنے مرض کا صحیح علاج پالیا ہے۔ دونوں زبان حال سے کہہ رہے تھے

سہ کور بہ چشمے کہ لذت یاب دیدارے نشد
بشکند دستے کہ خم در گردن یارے نشد

بڑھیا کی واپسی سے پہلے پہلے ہری قابل اطمینان حد تک شفایاب ہو چکا تھا۔

کاش میں مصور ہوتا

(جناب ملک سکندر علی صاحب لاہور)

کاش میں مصور ہوتا . . . تمہاری تصویر بناتا۔ اس کو سامنے رکھکر تم سے باتیں کرتا اور شکایتیں بھی . . . . کاش میں مصور ہوتا.

اگر میں مصور ہوتا . . . چاند میں . . . تمہاری تصویر ایک عمدہ سفید نور کی طرح سفید کاغذ پر بناتا اور اس کے نیچے حسین حروف میں، تمہاری طرح حسین حروف میں لکھدیتا . . . . .

"چاند میں چاند"

مصور ہوتا . . . . . صبح کے وقت جب نسیم سحری کے ن سے چھوتے، میرے دماغ کو تازگی بخشتے جس میں بیخود و مدہوش ہو جاتا . . . تو میں سمجھتا کہ تیرے سیاہ چمکیلے اور ریشم کی طرح نرم بالوں نے اپنا سایہ ڈال کر مجھ پر یہ حالت طاری کر دی ہے۔ مگر آہ ایسا کہاں؟! کاش میں مصور ہوتا

میں مصور ہوتا تو . . . . تیری ایک ایسی تصویر بناتا کہ دنیا اسے دیوتا کی تصویر سمجھتی۔ حسن کے دیوتا کی۔ ایسے دیوتا کی جو کیوپڈ کا مدمقابل ٹھہرتا۔ سنگتراش اس کے مجسمے تیار کرتے۔ اہل دل اسے پوجتے حتی کہ کیوپڈ بھی اس کے سامنے سرنیاز جھکا دیتا۔ ہاں اگر میں مصور ہوتا تو ایک چھوٹی سی تصویر بناتا جسکے نیچے لکھتا "ناکامی انتظار"، کاش میں۔"

غزل

(از جناب غلام سرور صاحب فگار منشی فاضل سیالکوٹی)

مدام مست مے خوشگوار رہنے دے
نہ چھیڑ قصۂ غم بار بار رہنے دے

ابھی تو جنت نظارہ ہے جمال ان کا
پیام ہستی ناپائدار رہنے دے

عجب نہیں کہ اسی میں ہو ناقہ لیلیٰ
نہ دے فریب حجاب غبار رہنے دے

مزا ہو وعدۂ صبر آزما قیامت تک
حریف سوز تپ انتظار رہنے دے

پرانے بادہ پرستوں کا یہ بھی ہے انداز
جنوں سے دامن دل تار تار رہنے دے

مجھے بھی حسن تکلم میں لطف افزوں ہو
گناہگار ہی پروردگار رہنے دے

یہ اس کی مرضی ہے مجھ کو پلائے یا نہ پلائے
وہ میرا نام مگر بادہ خوار رہنے دے

یہ بحر عشق ہے اے ناخدا خدا حافظ!
فنا پہ کشتی دل کا مدار رہنے دے

فگار لکھنے کو اشعار تو لکھیں ہم بھی،
جو چین سی خلش روزگار رہنے دے

غزل

(عزیزم جناب غلام احمد خاں شیدا سلمہ جواہر پوری)

موسیٰ کی طرح کس نے دکھائی ضیا مجھے
صبر و قرار و ہوش نہ مطلق رہا مجھے!

دامن سے پوچھتا ہوں کبھی آستیں سے میں
اس اشک بیقرار نے رسوا کیا مجھے

تنگ آگیا ہوں صدمۂ درد فراق سے
اب تو خدا کے واسطے صورت دکھا مجھے

یا مجھ کو اپنے دل پہ بھی کچھ اختیار دے
یا آ ہی جائے ہجر میں یارب قضا مجھے

افسردہ ہو گئی ہے مرے دل کی انجمن
بھر بھر کے ساغر مے کہنہ پلا مجھے

اب میں ہوں اور دشت نوردی کا شوق ہے
یاد آگیا جنوں کا وہ عہد وفا مجھے

دل باغ باغ ہو گیا اللہ رے اسکا نام
کس کا پیام دیتی ہے باد صبا مجھے

اب کرنے آئے ہیں مجھے تلقین صبر و ہوش
جب ساتھ اپنے لے چلا پیک قضا مجھے!

شیدا انہوں نے وعدۂ فردا کیا ہے آج
کل ہو نصیب ہجر میں کیونکر بھلا مجھے

خمسہ نعتیہ بر غزل جناب آصغر کلکتہ

(از جناب اشرف خانصاحب آثر چاندڈری مدرس ۔۔۔)

جمے میرے تن پر غبارِ مدینہ
چبھیں میرے تلووں میں خارِ مدینہ
تمنا ہے یہ شہریارِ مدینہ
دکھا مجھ کو اے تاجدارِ مدینہ
بہارِ مدینہ بہارِ مدینہ

میں بگڑی ہوئی اپنی قسمت بناؤں
مصیبت سے چھوٹوں میں آرام پاؤں
مدینہ کو میں سر کے بل چل کے جاؤں
تمنا ہے آنکھوں میں اپنی لگاؤں
جو ہاتھ آئے گرد و غبارِ مدینہ

میں سمجھونگا مجھ کو ملی آج عزت
برآئی تمنا کھلی میری قسمت
محمد بلائیں جو بہرِ زیارت
میں سمجھوں گا ہاتھ آگئی میرے جنت!
جو ہو قرب قربِ جوارِ مدینہ

جو ہونا ہے ہوگا وہی گنہ گارو!!
نہ گھبراؤ تم اور ہمت نہ ہارو!!
بھروسہ شفیع قیامت پہ رکھو
قیامت میں بخشائیں گے عاصیوں کو
حبیب خدا تاجدارِ مدینہ

ابھی دور مجھ سے مری بے کسی ہو!
ابھی دردِ فرقت میں میرے کمی ہو!
تپِ غم سے گو لاکھ سوکھی ہوئی ہو
ابھی کشتِ امید میری ہری ہو
جو ہو فیض ابرِ بہارِ مدینہ

دکھا دیجئے اپنا روئے منور!
جگا دیجئے میرا سوتا مقدر
اثر تا بکے آپ کے غم میں مضطر
سسکتا رہے ہند میں کب تک اصغر
کرم کیجیے اے تاجدارِ مدینہ

استاد تجلّی مرحوم

(جناب سید نادم رضوی الناظر سیتاپوری معاون ایڈیٹر روزنامہ اثنا عشری لاہور)

صوبہ اودھ میں استاد تجلّی مرحوم سے شاید ہی کوئی ناواقف ہو۔ آپ امیر حسن خاں بہادر المتخلص بہ سحر و حبیب (صاحب دیوان) والی ریاست محمود آباد کے استاد تھے۔ موضع کرد اضلع بارہ بنکی کو آپ کی وطنیت کا شرف حاصل ہے۔ اپنے گھر سے خوش حال تھے شعر و شاعری کا مذاق بچپن سے رکھتے تھے۔ تحصیل علم کے بعد لکھنؤ تشریف لے گئے۔ جہاں محمد عباس سلیم تلمیذ حضرت آتش کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ استاد کے انتقال کے بعد محمود آباد (ضلع سیتاپور) پہنچے۔ مہاراجہ امیر حسن خاں مرحوم کا عہد تھا وہ خود علم دوست اور صاحب دیوان تھے۔ انہوں نے استاد مرحوم کی قدردانی کی اور اپنا استاد بنایا۔ شعر و سخن کے خوب چرچے رہے ماہانہ مشاعرے ہوئے۔ لیکن جلد ہی یہ سماں بدل گیا۔

ایک دفعہ تجلّی صاحب کسی مقدمہ کے سلسلہ میں سیتاپور تشریف لے گئے تھے۔ عدالت میں موجود تھے کہ یکایک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے آپ کا انتقال ہو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہیں سیتاپور میں آپ کا مزار ہے۔

مرحوم کی شاعری کے ثبوت میں ان کے شاگرد مہاراجہ صاحب محمود آباد کا نام لے دینا کافی ہے۔ استاد مرحوم کے چار قلمی دیوان غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ استاد تجلّی مرحوم حضرت خواجہ آتش کے پیرو تھے۔ طبیعت نہایت سلجھی ہوئی پائی تھی۔ سلاست، روانی، جدت طرازی ان کا حصہ تھی۔ آپ کے کلام میں یہ خصوصیت ہے کہ جس "طرح" میں غزل کہتے حتی الوسع کوئی قافیہ باقی نہ چھوڑتے کبھی ساری غزل میں ایک ہی قافیہ کو مختلف طریقوں سے نظم فرما دیتے مثال کے طور پر ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کھل جائے راز و مشورہ شاہ و وزیر کا ÷ لیکن ملے نہ بھید کسی کو "فقیر" کا
تا حشر پھر نہ تشنہ خون غنیم ہو ÷ پی لے جو بادشہ بھی پیالہ فقیر کا
ایوان خسروی میں ہے یاد قبر بھی ÷ مسند پہ بھول جائے نہ تکیہ فقیر کا
کیا جانے بادشہ کو ہے کس بات پر غرور ÷ کہتے ہیں جن کو شاہ لقب ہے فقیر کا

سرنامہ دیوان پر جو غزل درج ہے اس کے چند شعر یہ ہیں۔

تو وہ اول ہے کہ تجھ سے پیشتر کوئی نہ تھا ÷ جلوہ گر تو جب سے ہے جب جلوہ گر کوئی نہ تھا
شان رزاقی ہے تیری تو مجھے دیتا ہے رزق ÷ ورنہ تیری ذات میں یارب ہنر کوئی نہ تھا
خیر گزری نسل آدم سے تمہیں پیدا کیا ÷ تھے بشر لاکھوں مگر خیر البشر کوئی نہ تھا
جب تلک گاہک ہے تھی رونق بازار بھی ÷ جب ہنر کے قدرداں تھے بے ہنر کوئی نہ تھا

دیگر

سر پہ یہ بار غم عشق اٹھانا ہی نہ تھا ÷ دل کو آنا ہی نہ تھا جان کو جانا ہی نہ تھا
عشق اور حسن کی ترکیب، پڑھانا ہی نہ تھا ÷ قیس کو مکتب لیلا میں بٹھانا ہی نہ تھا
مفت بدنام ہوا رند نہیں آکر واعظ ÷ وعظ کو کیا کسی مسجد میں ٹھکانا ہی نہ تھا
ضد سے وال اور بڑھا دی گئی میعاد فراق ÷ وعدہ وصل تمہیں یاد دلانا ہی نہ تھا!
ان کو بھی اپنا رقیب آپ بنایا میں نے ÷ آئینہ میں انہیں حسن اپنا دکھانا ہی نہ تھا

رباعی

وصاف علیؑ حاضر و غائب ہوں میں ÷ مدحت گر مظہر العجائب ہوں میں
بہتر ہوں نظامی سے اگر نظم ہے خوب ÷ صائب ہے مری فکر تو صائب ہوں میں

استاد مرحوم کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

محفل یار سے اٹھنے کو اٹھے ہم لیکن
درد کی طرح اٹھے گر پڑے آنسو کی طرح

مجھے افسوس ہے کہ میرے ضروری سامان کے ساتھ ہی دیوان تجلّی بھی سیتاپور رہ گیا اور میں اپنے ساتھ نہ لا سکا۔ ورنہ دیوان سے جو انتخاب پیش کرتا وہ مرحوم کے قدرت کلام اور مہارت سخن کو نہایت اچھی طرح واضح کر سکتا۔

اگر کوئی صاحب تجلّی صاحب کے متعلق اس سے زیادہ معلومات بہم پہنچا سکیں تو میں ان کا شکر گزار رہونگا۔ (السید نادم)

محاورے

محاورات علی العموم وہی صحیح سمجھے جاتے ہیں جو روزمرہ گھر آنگن میں بولے جاتے ہوں اسی بات کو پیش نظر رکھکر جناب "گمنام" نے یہ مضمون ارسال فرمایا ہے۔ جس سے یہ معلوم کرنا بھی دشوار ہو گیا ہے کہ لکھنے والی کوئی خاتون محترمہ ہیں یا "خان محترم" بہرحال وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ——————— (مدیر)

آٹا ہو جانا ۔ گھن لگنا ۔ پس کر ریزہ ریزہ ہو جانا ۔ گل جانا ؎

کل حضرت کھٹمل نے میرے پیٹ میں کاٹا
کروٹ جو میں لیتا ہوں تو وہ ہو گئے آٹا

آڑے آجانا ۔ سدراہ ہو جانا ۔ ؎

ٹل گئی آج سر سے آئی ہوئی ✽ آڑے آیا لیا دیا میرا

آفت کی پرکالہ ۔ شوخ شریر کمسن لڑکی ؎

نہ تم اتنے سے سن پر جاؤ اس لڑکی کے اے مرزا
یہ آفت کی پرکالہ یہ شر کرنے کی بانی ہے

آنچل ۔ دلائی یا دوپٹہ کا پلو ۔ زنانہ سینہ کا ابھار ؎

کھلا ہے سینہ دوپٹہ تک کا ہوش نہیں!
کنواری بالی ہے آنچل کو دیکھ بھال کے چل

آنچل ڈالنا ۔ بھائی کی شادی کے وقت بہنیں دوپٹہ کا پلو یا اوڑھنی کا آنچل دولہا کے سر پر شانوں پر ڈالتی ہیں ۔ اسے آنچل ڈالنا کہتے ہیں ۔ صوبہ متحدہ کے بڑے بڑے شہروں میں اب تک یہ رسم جاری ہے۔

آنکھ ناک سے ڈر ۔ جب کوئی منہ پر جھوٹ بولے یا جھوٹی قسم کھائے تو کہتے ہیں ؎

آہ ظالم خدائے پاک سے ڈر ✽ جھوٹ مت بول آنکھ ناک سے ڈر

آنکھیں پٹم ہونا ۔ بددعا ہے ۔ آنکھیں پھوٹ جانا ؎

یا الٰہی جو جھوٹی قسمیں کھائیں ✽ دونوں آنکھیں ابھی پٹم ہو جائیں

آنکھیں چار کرنا ۔ ڈھٹائی سے دیکھنا جتا کر کے نظر ملانا ؎

جھوٹ کہتا ہے اور مکرتا ہے ✽ اور پھر آنکھیں چار کرتا ہے

آہ نہ آئے ۔ رحم نہ آئے ۔ ترس نہ آئے ؎

رحم تجھ پر خدا گواہ نہ آئے ✽ تیرے ٹکڑے کروں تو آہ نہ آئے

آئیں بیوی عاقلہ سب کاموں میں داخلہ ۔ ہر بات میں دخل در معقولات دینا ۔

اپنی والی پر آنا ۔ ضد کرنا ۔ سخن پروری کرنا ۔ بات کی پچ کرنا ؎

اپنی والی پہ میں جو آؤنگی ✽ تکے بوٹی ترے اڑاؤں گی!

اللے تللے کرنا ۔ نضول خرچی ۔ عیش و عشرت میں روپیہ برباد کرنا ؎

واں تو سنتے تھے ہم کہ مرتے ہیں ✽ یہ اللّے تللّے کرتے ہیں!!

اللہ آمین کرنا ۔ منت مرادوں سے پالنا ۔ غور پرداخت سے پرورش کرنا ۔ ؎

اللہ آمیں سے ہم تو یوں پالیں ✽
آپ آفت میں جان کو ڈالیں ✽

اوچھال چھکا ۔ بدوضع ۔ بدچلن ۔ خراب ۔ ہڑدنگی ؎

کھیلتی ہے بدا بدی جو سر
چھوکری کیا اوچھال چھکا ہے

اول جلول ۔ بے ڈھنگا بے سلیقہ آدمی ؎

بات کا کچھ سلیقہ خاک نہ دھول
نوج ایسا ہو کوئی اول جلول!

آدھی رات کو جمائی آئے شام سے منہ پھیلائے

وقت سے پہلے کام کاج پھیلا بیٹھنا ۔ یا کسی کام کا بہت پہلے سے انتظام شروع کر دیا جائے تو یہ محاورہ بولا جاتا ہے ۔ اگر ناظرین اور ناظرات "بنات" نے پسند کیا تو کبھی کبھی اس سلسلہ میں کچھ لکھکر بھیجا جایا کریگا ۔ ("گمنام")

صنفِ لطیف کے اہم کارنامے

(تحریر از جناب ابوالنعیم سید اکبر حسینی آرزو حیدر آباد دکن)

یہ قول عین حقیقت پر مبنی ہے کہ "انسانیت کی نگہداشت کا مدار صنفِ نازک پر ہے"۔ تاریخ ایسی درخشاں تمثیلات سے خالی نہیں کہ عورتوں نے ملکی انقلاب یا وطن کے مقدرات کو بدلنے میں مردوں کے دوش بدوش کام کیا ہے۔

سرکارِ دو عالم فخرِ موجودات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اسلامی ممالک میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہوا۔ جو مذہب خیالات و ساتیر اور روایات پر مبنی تھا۔ اس سے مسلمانوں کی مذہبی، قومی اور معاشی زندگی میں ایک تغیر پیدا ہوگیا۔

اب وہ ضلالت و جہالت کی تاریکی جو کئی پشت سے عربوں کو گھیرے ہوئے تھی خورشیدِ رسالت کی ضیا پاشیوں سے کافور ہو چکی تھی۔ شجاعت جرأت اور مردانہ جوش جن سے غلط طور پر بغض و عناد کی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام لیا جاتا تھا آخر جائز طور پر اور مناسب موقعہ سے استعمال ہونے لگے۔ ظہورِ اسلام سے قبل عرب معرکہ آرائی اور ہنگامہ و فساد کا مرکز تھا لیکن اسلام نے وہ انقلاب پیدا کیا کہ سارے عرب میں اخوت و محبت کا دریا موجیں مارنے لگا۔

خلیفہ دوم حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو فتوحات کا سلسلہ بندھا تھا اس کے متعدد آثار روئے زمین پر اب تک باقی ہیں آپ کے عہدِ معدلت مہد میں بعض معرکہ آرائیاں ایسی بھی ہوئیں کہ مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی حق پرستی اور وحدانیت کے حقیقی جوش میں بہادری کے جوہر اور شجاعت کے کمالات دکھائے۔

عہدِ جاہلیت میں بھی اس کا رواج تھا کہ بچے اور عورتیں عرصۂ کارزار میں رضاکارانہ حیثیت سے وہ کارِ نمایاں انجام دیتے کہ مردِ میدان بھی انگشت بدنداں رہ جاتے۔ ان سے متعلق زخم رسیدہ سپاہیوں کی مرہم پٹی یا قیدیوں کی حفاظت اور گھوڑوں کی خبرگیری ہوتی۔ لیکن زیادہ تر وہ ایسی جوشیلی قومی نظمیں گایا کرتیں کہ دل کانپ اٹھتے اور رگ و پے میں بہادرانہ جوش کی لہر دوڑ جاتی۔ یہ طریقہ اشاعتِ اسلام کے بعد تک جاری رہا

حضور اکرم سرورِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور کے اکثر غزوات میں صنفِ نازک نے اپنی خدمات پیش کیں۔ کہا جاتا ہے کہ غزوۂ احد میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی مجروحین کو پانی پلانے میں مدد کی تھی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں صنفِ نازک کو حسبِ ذیل خدمات سپرد تھیں:۔

(۱) مجروحین کو پانی پلانا۔

(۲) سپاہیوں کی خورد و نوش کا انتظام

(۳) مجروحین کی تیمارداری۔ مرہم پٹی وغیرہ۔

(۴) مقتولین کو میدانِ جنگ سے اٹھا لیجانا اور تدفین وغیرہ۔

(۵) بوقتِ ضرورت ہمت افزائی اور جنگی امداد وغیرہ۔

جنگِ قادسیہ میں عورتوں ہی نے جوش دلا کر مردوں کے دل بڑھائے اور قدم جمائے تھے۔ چنانچہ ان کی خدمات زیادہ اہم ہیں اسی میں عرب کی مشہور شاعرہ خنسا بھی تھی جس کی پرجوش نظموں نے فرزندانِ اسلام کو جان لڑانے پر کمربستہ کیا تھا۔

یرموک کی لڑائی میں رومی ایسے وحشیانہ جارحانہ جوش سے بڑھ آئے تھے کہ میسرہ پسپا ہونے کو تھا۔ مسلمان پیچھے ہٹ رہے تھے اور رومی آگے بڑھے جا رہے تھے۔ جب وہ مسلمان خواتین کے خیموں تک پہنچ گئے تو عورتیں بپھری ہوئی شیرنیوں کی طرح خیموں سے نکل پڑیں ان کا جوش دیکھ کر مردوں کی رگِ حمیت و شجاعت میں از سرِ نو جان پڑ گئی اور مسلمانوں نے اس زور سے یکبارگی حملہ کیا کہ رومیوں کے چھکے چھوٹ گئے پنجے اکھڑ گئے۔ تا بہ مقاومت لانا دشوار ہوگئی۔ اس معرکہ میں حضرت معاویہؓ کی ہمشیرہ جویریہؓ زخمی ہوئی تھیں اور آپ کی والدہ نے جوش دلا کر لڑنے مرنے پر آمادہ کیا تھا۔

ہر ملک جون آف آرک جیسی اولوالعزم عورت پر فخر کرسکتا ہے لیکن اسلام میں بھی متعدد خواتین نے بہادری اور شجاعت کے وہ وہ جوہر دکھائے ہیں کہ دنیا کی دوسری اقوام میں شاید ہی ایسی شاذ مثالیں مل سکیں۔

تاریخ ہند شاہد ہے کہ سلاطین اسلام کے دور حکومت میں خود ہندوستان میں بعض ایسی عدیم النظیر ہستیاں عالم وجود میں آکر شہرۂ آفاق ہوئی ہیں جو نہ صرف شجاعت و مردانگی بلکہ انتظام سلطنت، شعر و سخن، تالیف و تصنیف اور ایجاد و اختراع میں بھی کافی استطاعت رکھتی تھیں۔ جن میں سے چند۔ سلطانہ رضیہ، نور جہاں، چاند سلطانہ، زیب النساء وغیرہ ہیں۔ اس مختصر مضمون میں صرف ان خواتین کے حالات پر روشنی ڈالی جائیگی جن کے ذکر سے صفحات تاریخ معرا ہیں۔

گل بہشت

سلطان علاؤ الدین خلجی کو گروہ فاتحین میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ جس کی حکومت کا زیادہ زمانہ فتوحات ہی میں بسر ہوا۔ گل بہشت اسی سلطان کی لونڈی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک روز اپنی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے سلطان نے کہا کہ "ہمارے زبردست لشکر کا مقابلہ کرنے والا ہندوستان میں کوئی نہیں ہے"۔ تو جالور کے راجہ کنیر دیو سے ضبط نہ ہوسکا اور اس کی زبان سے بے اختیار نکلا "جالور کا قلعہ یہ ثابت کردکھائے گا۔ کہ آپ کے شدید ترین حملے بھی کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ بادشاہ کو بہت ناگوار گذرا لیکن اس وقت وہ صبر و تحمل سے کام لیکر خاموش ہو رہا تھوڑے دنوں بعد جب کنیر دیو کو اپنے علاقہ میں جانے کی اجازت مل گئی تو سلطان نے ایک دستہ فوج اپنی کنیز گل بہشت کی سرکردگی میں بھیج دیا۔

گل بہشت نے قلعہ جالور کا محاصرہ کیا اور اس مردانگی سے مقابلہ کیا کہ راجہ حیران و ششدر رہ گیا۔ وہ بار بار تعجب سے کہتا تھا کہ یہ بلادلیر و جرأت لڑکا! اور یہ ماہ چہرہ نا! شجاعت و تہور!!! اسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ یہ لڑکا ہی نہیں بلکہ گلوں میں کھیلنے والی لڑکی جنت کا پھول "گل بہشت" ہے۔ عین اس وقت جبکہ راجہ شکست پر شکست کھا کر پسپا ہونے کو تھا گل بہشت اچانک بیمار ہوکر اپنے اصل مقام روضۂ بہشت کو سدھار گئی۔

گل بہشت کی موت سے جب راجہ کی ہمت بڑھ گئی تو وہ نئے جوش سے معرکہ آرا ہوا۔ اور غصہ میں گل بہشت مرحومہ کو مردہ دیکھکر برا بھلا بھی کہا۔ لیکن کمال الدین نامی فوجی افسر نے غیر معمولی بہادری سے کام لیکر قلعہ پر قبضہ کرلیا۔

حمیدہ بیگم

شہنشاہ جہانگیر کے عہد حکومت میں دولت آباد کا قلعہ نظام الملک کی نگرانی میں تھا۔ ان کی لائق اور مدبر و زیرک بیوی "حمیدہ بیگم" کے نام سے موسوم تھی جو اپنے شوہر کی طرح حاکم کے مزاج میں خود بھی رسوخ رکھتی تھی۔

جب عادل خاں نے نظام الملک کے مقابلہ میں ایک جرار فوج بھیجی تو اس کی پریشانی کو دیکھکر حمیدہ بیگم نے اپنی خدمات پیش کیں سپہ سالار افواج کی حیثیت سے خود میدان جنگ میں گئی اور شجاعت و فراست کے سبب آخر میدان مار ہی لیا۔

ام عبن

ام عبن کی پر از واقعات زندگی خود ایک افسانہ ہے۔ سن شعور سے قبل بھی اس کو فنون سپہ گری اور جنگ سے خاص دلچسپی تھی والدین کی حسن تربیت، قومی جوش اور حالات حاضرہ نے شوق کی پوری پوری تکمیل کردی۔ مردانہ شجاعت اور غیر معمولی جرأت کے سبب اس کو حضرت خلیفہ دوم کے زمانہ میں ایشیائے کوچک کے رومیوں کے خلاف جنگ میں جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

بیاہ کے بعد بھی حب الوطنی کے حقیقی جذبات اور قومی محبت کے سچے جوش نے جنگ میں حصہ لینے سے باز نہ رکھا۔

جس وقت حق پرست موحدین نے دمشق پر چڑھائی کی تو اس لشکر میں عروس و نوشہ یعنی ام عبن اور اس کا نیک شوہر بھی شامل تھے محاصرہ سے قبل ہی مقابلہ کرکے اس کے خاوند نے رفیقۂ حیات کو تن بہ تقدیر تنہا چھوڑ کر جام شہادت نوش کیا۔

امیدوں کا آفتاب اس طرح جب اچانک غروب ہوا تو ام عبن کا انتہائی حزن و ملال انتہائی جوشِ انتقام میں تبدیل ہو گیا۔ حالانکہ یہ صدمہ ایسا جانکاہ اور غم و ہم ایسا ہوشربا تھا کہ مردِ میدان کے پائے استقلال میں بھی لغزش آجاتی لیکن مجسمۂ تہور و شجاعت ام عبن کے تیور پر بل نہ آیا۔ اس کی ہمت پست نہ ہوئی۔ اس نے نہ ماتمی لباس پہنا نہ اور کسی طرح اپنے رنج و ملال کا اظہار ہونے دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں جذب کر چکی ہے۔ سو صابر و شاکر نظر آرہی تھی۔

اس نے شوہر کے جنازہ پر کھڑے ہو کر بآواز بلند کہا:۔

"پیارے شوہر! تم خوش نصیب تھے کہ اتنی جلد جامِ شہادت مل گیا۔ اور تم میرا قافلہ بلکہ وہاں جا پہنچے جہاں ہر ایک کو جانا ضروری ہے۔ ہجر و وصال کسی کا اختیاری فعل نہیں۔ تمہاری اس شاندار موت کا دشمن سے انتقام لونگی اور اسی جانبازی میں سر کے بل آکر تم سے ملونگی۔ مجھے تم سے حد درجہ محبت تھی۔ تمہارے بعد میں نے اپنی زندگی کلیتہً خدمت اسلام کے لئے وقف کر دی ہے اس لئے کوئی دوسرا انسان میرے جسم کو نہ چھو سکے گا۔"

اس تمام پرجوش تقریر کے دوران میں آنسو کا ایک قطرہ بھی اس کی آنکھ سے نہ نکلا۔ اس کے بعد پورے اطمینان قلب کے ساتھ اپنے رفیق زندگی کو سپرد خاک کیا۔ بیاہیا نہ لباس زیب تن کیا ضروری اسلحہ سے آراستہ ہوئی اور میدان جنگ کا رخ کیا۔ اس زمانہ میں دمشق پر تھامس جیسے بہادر جنگجو کی حکومت تھی جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ہرقل کا داماد تھا۔

مسیحی افواج اسی کی سرکردگی میں اشاروں پر کام کر رہی تھیں نصرت و ظفر کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ فرزندان اسلام بار بار کی پسپائی اور دشمن کی چڑھائی سے شکستہ دل اور قدم برداشتہ ہو رہے تھے ایسے سخت امتحان کے وقت ام عبن بلاخوف و دہشت دشمن کی فوج میں مردانہ وار گھس گئی اس نے پہلا ہی تیر اس قادر اندازی کے ساتھ رومی علم بردار پر مارا کہ ایک وار سے سرنگوں ہو گیا۔ رومی آگے اٹھانے کی خاطر بڑی سرعت سے بڑھے۔ مسلمانوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور گھمسان کا رن پڑا۔ اور اس معرکہ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔

جب اس فتح کی مسرت نے دل بڑھایا تو ام عبن نے عرصۂ کارزار میں بہادری کے ایسے ایسے جوہر دکھائے اور ایسی جانبازی سے دشمن کا مقابلہ کیا کہ بڑے بڑے کار آزمودہ جوانمرد عش عش کر اٹھے۔

بہادر و شجیعہ ام عبن کے دوسرے تیر نے تھامس کی آنکھ کو اپنا ہدف و نشانہ بنایا۔ یہی وہ سردار افواج تھا جس کے اعتبار پر اور جس کے حسن تدبیر سے کام لینے پر جنگ اور فتح کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ اس کے زیر ہوتے ہی رومیوں کے قدم اکھڑ گئے اور اس خطرناک جنگ میں محض ام عبن کی شجاعانہ جدوجہد سے عظیم الشان فتح مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔ اپنی اس شاندار کامیابی پر ام عبن مسکرا رہی تھی۔ اور اس کا تیر کمان کسی اور جہاد کا منتظر۔"

(یہاں ہم عرب کے مشہور شاعر عمر بن کلثوم کی ایک رزمیہ نظم کا ترجمہ ادا کرنا چاہتے ہیں جس سے عربوں اور عرب عورتوں کی ذہنیت کا اندازہ زیادہ اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"ہماری صف کے پیچھے حسین گوری عورتیں ہیں۔ ہمکو برابر ڈر رہتا ہے کہ ان کی بے عزتی نہ ہو اور دشمن ان تک نہ پہنچ سکے۔ ان پیچھے آنیوالی عورتوں نے اپنے شوہروں سے عہد لیا ہے کہ جان سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ وہ ہمارے ساتھ اس لئے رہتی ہیں کہ ہم دشمنوں سے ہتھیار اور گھوڑے چھین کر ان کے سپرد کر دیں اور دشمنوں کو گرفتار کر کے ان کی نگرانی میں دیدیں۔ یہ جشم بن بکر کے معزز خاندان کی عورتیں ہیں جو خوبصورت بھی ہیں اور مذہبی عزت اور خاندانی شوکت و وقار کی بھی مالک ہیں۔ مگر پھر بھی یہ ہمارے گھوڑوں کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ یہ میدان جنگ میں گاتی ہوئی خوشی خوشی چلتی ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اگر تم ہمارے **جان و مال اور عزت کو دشمن کے حملہ سے محفوظ نہ رکھ سکے تو یاد رکھو کہ تم ہمارے شوہر نہیں۔"**

اب ذرا ہندوستان کی موجودہ مسلم خواتین کی حالت ملاحظہ کیجئے اور یہ بھی دیکھئے کہ گزشتہ ایک صدی کی مدت میں ہم نے دنیا کی رفتار ترقی کے ساتھ کتنی ترقی کر لی ہے؟!!! (مترجم)

تیر و نشتر

(ادارہ)

کیا مجھ عشق نے ظالم کو آب آہستہ آہستہ	کہ آتش گل کو کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ	ولی مرحوم
پروانہ وار عشق میں تیرے جو جی جلا گیا	اس کا کفن ہو رشتۂ شمع نگاہ سے !	" "
بوئے گل یا نوائے بلبل تھی ؟	عمر افسوس کیا شتاب گئی	میر "
یارب بہ زاہداں چہ دہی خلد رائگاں	جور بتاں نہ دیدہ و دل خوں نہ کردہ کس	غالب "
ہر سنگ کہ بر سینہ زدم نقش تو بگرفت !	ایں ہم ہے از بہر پرستیدن من شد !!	طالب آملی
یہاں برخاستہ دل آئے اور دل برداشتہ نکلے	سفر تھا زندگی کا مختصر اور سخت انجمن کا !!	ابو نعیم آرزو
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس	آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا	مومن مرحوم
وحشت کے بیاباں میں یہ بکھرے ہیں کیوں ہم	ان خاک کے ذروں کی تمنا تو نہیں ہم ؟	بیتاب
زندگی موج آب ہے گویا !	دم کا آنا حباب ہے گویا	نفیر
آدمی بلبلا ہے پانی کا	کیا بھروسا ہے زندگانی کا	نامعلوم
اشک آنکھوں سے جو نکلا سو وہ گوہر نکلا	بعد مدت کے مری چشم کا جوہر نکلا !	فارغ
فلک رلائے تو ہے ہمکو، لیک یہ ڈر ہے	کہ بلبلا سا کہیں آپ ہی بہا نہ پھرے	قائم
مجھ سا کوئی جہان میں آشفتہ سر نہیں !	ہے یوں تو زلف یار بھی پر اس قدر نہیں !	"
قتل کر مجھ کو مری نعش پہ بولا قاتل	ہائے یارو! یہ گماں تھا مجھے معلوم نہ تھا	گمان
ہم نے کیا کیا نہ ترے ہجر میں محبوب کیا	صبر ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا	مضمون
بھولی نہیں ہے مجھ کو بتوں کی ادا ہنوز !	دل کے نگیں پہ نقش ہے نام خدا ہنوز !	منعم
تصویر اس کی کھینچ کے ناز و ادا کے ساتھ	نازاں ہے اپنے آپ پہ دست قضا ہنوز !	
ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر	تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا	محمد تقی میر
عارض اس کے تھے عرق سے یوں سحر بھیگے ہوئے	جس طرح شبنم سے دو گلبرگ تر بھیگے ہوئے	"
ڈروں ہیں کس لئے رنجش سے پیار میں کیا تھا	میں اب خزاں کو جو روؤں بہار میں کیا تھا ؟	ممتاز
نزع تک وصل کی ہے یار امید	ہے مثل ایک دم ہزار امید	مستمند
کہتا وہ تھا کہ باز آ ہر دم کی اس ہنسی سے	آخر گیا نہ ظالم اک بے گناہ جی سے ! ؟	مائل
ہے نہاں داغ جگر زخم نمایاں کے تلے	جس طرح لالہ کہیں ہو گل خنداں کے تلے !	مصحفی
عجب قسمت ہے اپنے دل کی بازار محبت میں	جو کوئی صبح اس کو لے گیا تو شام لے آیا	مجذوب
اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں	"عارضی" میری زندگانی ہے	ناجی

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں مہرو سے	سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ !!	ولی
جائے سنگ لوح تربت نصب کیجو آئینہ	تاکوئی جلوہ [illegible] حسرت کش دیدار تھا	یار
آفریں اے دست گستاخ محبت آفریں	لگ جا [illegible] سے گلے کا ہار تھا	
لام نستعلیق کا ہے اس بت خوش خط کی زلف	ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے	احسن (اسلام)
علی کا بیاہ ایسا جگمگا تھا	شب معراج جس کا رتجگا تھا	افگار
بیوفا تیری کچھ نہیں تقصیر	مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں	اثر
چمن کے تخت پر جب دن شہ گل کا تجمل تھا	ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شور تھا قل تھا	عاصی
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں	بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا	
بینوا ہوں زکوٰۃ حسن کی دے	او میاں مالدار کی صورت !	بینوا
ایسے ہی میرے بخت جو ماتے تھے نیند کے	خواب عدم سے کاہے کو مجھ کو جگا دیا ؟	بیان
عالم میں گو کہ عشق نے رسوا کیا مجھے	لیکن تجھے تو شہرۂ آفاق کر دیا ؟ !	"
میں کیا خلل نہ اٹھائے فلک کے کینے سے	کسی کو کام نہ ڈالے خدا کمینے سے	بیتاب
دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے	کام عشاق کا تمام کیا	پیام
دل مرا گرد لب یار کے منڈلاتا ہے	یہ شکر خوردہ شکر چھوڑ کہاں جاتا ہے	"
حسن اور عشق کو جب روز کہ ایجاد کیا	مجھ کو دیوانہ کیا تجھ کو پریزاد کیا	میاں صلاح الدین مکین مرحوم
ہاتھ میں اس کے ہاتھ تھا ہیہات	دل مرا گم ہوا ہے ہاتھوں ہات	تاباں
جنوں کا یاں تلک ہے گرم بازار	کہ پتھر بھی نہیں سر کا خریدار	جنوں
ہر بن مو سے مرے شعلہ نمایاں کر دے	دل تو جلتا ہے پر اب سر و چراغاں کر دے	جرات (میر مستقیم نام)
نالۂ و آہ و فغاں میرا ہی دم بھرتے ہیں	آپکا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں	جرات (قلندر بخش نام)
پھر وہی تم ہو وہی ہم ہیں وہی راتیں ہیں !	پھر وہی عیش وہی دن ہیں وہی راتیں ہیں !	حشمت
قتال جہاں معشوق جو تھے ہیں سونے پڑے مرقد ان کے	یا مرنے والے لاکھوں تھے یا رونے والا کوئی نہیں	آرزو لکھنوی
لب پہ نالہ نہیں، شکوہ نہیں فریاد نہیں	سچ تو یہ ہے کہ ترا کوئی ستم یاد نہیں !	شمیم
میں رہروان عشق میں ہوں وہ شکستہ پا	جو تھک کے گر پڑا تری منزل کے سامنے	"
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں	جسکے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں	غالب
رات بھر کمبخت کو پھر نیند آ سکتی نہیں ، !	جسکے سینے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں	اختر شیرانی
در عشق تری جیوڑی یہ ست مچا مچ !!	یہ پھرکی وہ دنّا یہ پچ وہ غچا پچ ! !	انگریش (داد طلب ہے)
دل سے نکل رہے ہیں مرے "شعلہ ہائے سرد"	اک آہ سے کر دوں گا ابھی آسماں کو گرد !	(میر تقی میر کے ہم وطن ہیں)
کوئی معشوق دلربا نہ ملا	یعنی دفتر میں مرتبا نہ ملا	کلرک (کتنا بلند تخیل ہے)
وہ جھروکے میں سے جھانکیں تو مرا تپنا پوچھو	کھاٹ بچھا دوں ؟ کھاٹ ؟ ؟	علیگ (کیا مزہ ہے)
مرے گھر سے گیا کوئی تو یہ کہتا گیا کوئی ——	"یہی تو میں کہ ان کے گھر کوئی پھر مہمان ہوگا"	ریاض (دہقان کی یہ وضع!)

غزل

از جناب علی احمد صاحب علی فرزند نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل مدظلہ العالی :-

دل کو لگی ہے چوٹ تو بسمل جگر بھی ہے
اک حشر ہے ادھر تو اک آفت ادھر بھی ہے

کہتے ہیں دردِ دل کا ہی کیوں ذکر بار بار
دل میں ہمیں تمہارے ہیں تم کو خبر بھی ہے

ہیں ایسے بھولے آئینہ میں عکس دیکھ کر
پلٹا کے دیکھنے لگے کوئی ادھر بھی ہے

تم میرے قتل کیلئے کستے ہو کیا کمر
دیکھو تو غور سے کہ تمہارے کمر بھی ہے

سمجھو مری فغاں کو نہ فریاد عندلیب
یہ آہ ہے وہ آہ کہ جس میں اثر بھی ہے

پوچھا کیا فراق میں تاروں سے رات بھر
اس انجمن میں کیا مرا رشکِ قمر بھی ہے

رکھیں نہ دست ناز میں پھر تو کیا کریں؟
باندھیں کہاں وہ تیغ کہ ان کے کمر بھی ہے

بیخواب و بیقرار کہاں تک یہ چشم و دل
آخر شب فراق کی یارب سحر بھی ہے؟

پہنچائے گی غبار مرا کوئے یار تک
کوچے میں اس کے باد صبا کا گزر بھی ہے

تنہائی ساتھ ساتھ چلی ہے مکان سے
میری رفیق بھی ہے یہی ہمسفر بھی ہے

دل ہو چکا شکار تو غم ہے اے علی
تیار ان کے واسطے اپنا جگر بھی ہے

دکن میں

منشی محمد صالح صاحب مسجد باغ عامہ خاص بلدہ حیدرآباد ایجنٹ اخبارات و رسائل سے اور مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ بلدہ حیدرآباد سے ہر مہینہ تازہ کائنات مل سکتا ہے دکن کے دوسرے اضلاع میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ (مینیجر کائنات لاہور)

بمبئی کی مشہور فرم مظفری کمپنی سے کائنات کا سالنامہ خریدیئے

رنگون کے مشہور ایجنٹ عبدالرزاق خانصاحب فیض آبادی سے کائنات خرید لیجیے

مزاحیہ

سفر کی دلچسپیاں

(از جناب سید اعجاز علی صاحب نگینوی)

{ہم سید صاحب کے اس شکوہ کو منظور کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نے انکے ہیرو کا نام نیا [illegible] مضمون خوب ہے (مدیر)}

یادش بخیر! چچا چھکن کا نام آپنے سنا ہوگا۔ ہم کو ایک روز ریل کے تیسرے درجہ میں درشن ہو ہی گئے۔

ریل کے درجہ میں داخل ہوتے ہی پندرہ بیس قوی الجثہ، کثیف لباس میں نیم عریاں، چادر لپیٹے، پاؤں جوتوں سے آزاد، کدال اور پھاوڑوں سے مسلح، بعض کے ہاتھوں میں حقے، ہندوستان کی آبادی میں تقریباً ۹۰ فیصدی کے دعویدار، محنت اور مشقت کے دلدادہ، محبت اور اخلاص کا نمونہ۔ تکلف سے مبرا۔ توکل کے عالم [illegible] کسان تھے۔ ایک نے دروازہ کی طرف رخ کیا دوسروں نے تقلید کی اور یااللہ کہکر جھٹ داخلون۔ میں ابھی سنبھل کر بیٹھا بھی نہ تھا کہ وہ ملک الموت کے ہمرفتار میرے سر پر تھے۔ سامان لگانا بھول گیا۔ ہاتھ سامان کی طرف تھے اور نظر سیٹ کی طرف۔ میری آنکھیں وہی کچھ دیکھ رہی تھیں جس کا اندیشہ تیسرے درجہ کے مسافر کو ہر وقت لگا رہتا ہے۔ جب تک سامان لگایا تب تک میری جگہ پُر ہو چکی تھی ڈبہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مسافر بکسوں، پلندوں اور فرش پر بیٹھے ہوئے تھے کچھ کھڑکی سے لگے کھڑے ہوئے تھے۔ خداوندان ریلوے نے "۳۰ آدمیوں کیلئے" لکھا تھا لیکن یہاں تھے ۳۰ اور ۱۵ = ۴۵۔ کھڑے کھڑے دعا مانگتا رہا کہ اللہ میاں جلدی سے اگلا اسٹیشن آجائے دور کا رستہ قریب کر دے۔ میری دعا اس وقت دُکھے دل کی دعا تھی فرا ٹے بھرتی ہوئی قبول ہو رہی تھی۔ یہانتک کہ مراد بر آئی دوسرا اسٹیشن آتے ہی میں نے اسباب سنبھالا اور ایک ایسے درجہ میں جا بیٹھا جہاں اچھی خاصی جگہ موجود تھی۔ کچھ سپید پوش ایک طرف بیٹھے اور لیٹے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ایک کھچیا ڈاڑھی لیئے [illegible] فرنچ کٹ۔ میانہ قد۔ سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں۔ منڈا ہوا سر رنگ آبنوسی۔ دور سے "چڑی کا غلام" معلوم ہو رہے تھے۔ [illegible] ہمدم رواں" تھے "چچا چھکن"۔ "چچا چھکن" کی پیہم پکار تھی

ان کے حرکات و سکنات کو دیکھکر ڈارون کی تھیوری کسی قدر درست معلوم ہونے لگی۔ اگر اس کے زمانہ میں "چچا چھکن" موجود ہوتے تو تمثیلاً پیش کئے جا سکتے تھے۔ چار و ناچار یہ تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ بادی النظر میں اشرف المخلوقات تھے۔ یوں بھی ان میں اور بن مانس میں اچھا خاصا فرق تھا۔ ان سے پورا تعارف کرانے کے لئے یہ شعر کافی مدد و معاون ہو سکتا ہے کہ ؎

"یوں بھی تھی ذات آپکی مستجمع الصفات"
پھر اس پہ طرہ یہ کہ ذرا بیوقوف تھے!!

یار لوگوں کے چھیڑنے پر بار بار آگ بگولا ہو ہو جاتے لیکن فسانۂ آزاد کے خوجی کی طرح محض چلاکر خاموش ہو رہتے۔ مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی "آپ کون ہیں؟ کہاں سے آرہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟" وہ بہت جلد بے تکلف ہو گئے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ پہلا سوال ہی بے تکلفی کا نمونہ تھا اگر میں بھی اتنی جلد بے تکلف ہو جانے کا عادی ہوتا تو "آپ کون ہیں؟" کا جواب ایسا باون تولہ کا دیتا کہ چچا بھی یاد ہی کرتے۔

چچا۔ "حقہ حاضر ہے"

میں۔ "شکریہ"

چچا۔ "آپ تکلف کرتے ہیں"

میں "اس نعمت سے محروم ہوں"

چچا "پان تو کھائیے گا یا اس سے بھی پرہیز ہے؟"

میں "بہت اچھا" پان اور چچا کے ہاتھ کا نیا ہے۔ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ پان کے نقوش میں کتھے اور چونے کی سُرخی اور قلعی اس استادی سے کتنی لگی گئی تھی کہ ایسا ویسا معمار بھی کیا کھا سکے گر گیا۔ چھالیہ کیا تھی چچا کے چہرے کے داغوں کا مکمل نمونہ تھی۔ کوئی بڑا تو کوئی چھوٹا کوئی نکیلا۔ شاید بچپن میں چچا نے لاکڑا کا کڑا چیچک سے ملاقات کی تھی جانے چہرے کی ایسی بلائیں لے گئی کہ ہمیشہ کے لئے یادگار رہیں

بہتیرا سوچا تھا کہ نظر بچا کر پان کھڑکی سے باہر پھینک دوں مگر ایسک وہ چھوٹی چھوٹی اندر کو گھسی ہوئی آنکھیں جو سب سے زیادہ خصوصیات کی حامل تھیں برابر میرے اسی ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں جس میں پان تھا اگر پھینکتے ہوئے دیکھ لیتے تو اتنا شور مچاتے کہ سارا ریل کا ڈبہ سر پر اٹھا لیتے اور ہمسائے سمجھتے کہ شاید ڈاکہ پڑ گیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی نیک دل خطرے کی زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لیتا۔ یہ تھے وہ خیالات جو میرے دماغ میں آ آ کر مجھے پان کھانے پر مجبور کر رہے تھے آخر میں نے ہمت کر کے کھا ہی لیا۔

چچا۔" اب حقہ سہی " (مسکرا کر) آپ تو پینا پڑے گا "

میں ۔ اچھا آپ کی خاطر آج پہلی دفعہ پی کر دیکھتا ہوں۔

حقہ کی نے منہ سے لگا کر جو پوری طاقت سے پھونک پلاتا ہوں تو پانی اپنی سطح سے طغیانی کرتا ہوا ایکدم چلم سے باہر۔ ۔ ۔ ۔ !!-

چچا۔" ارے میرے یار تو نے غضب کر دیا "

میں" مجھے خود تعجب ہے کہ آپ کے پینے سے دھواں کیوں نکلتا ہے اور میرے پینے سے پانی کیوں برآمد ہوا ؟!! "

یار لوگوں کے قہقہوں سے سارا درجہ گونج گیا۔

چچا۔" اب ہم اس درجہ سے جاتے ہیں "

ایک۔" جائے آپکی آبرو "

دوسرا۔" جائے آپ کی عقل "

تیسرا " جائیں آپ کے دشمن

ایک دیہاتی عورت بھی قریب ہی بیٹھی تھی کہیں اس نے بھی آہستہ سے کہہ دیا کہ " جائے آپ کی بلا "، بس پھر کیا تھا چچا کا پارہ چڑھ گیا۔ دانت پیس پیس کر کہنا شروع کیا اری مسری تیرے ساتھ تو نکاح کر کے چھوڑونگا نکاح ! " جب یار لوگوں نے دیکھا کہ سب کو چھوڑ کر غریب عورت کے پیچھے پنجے جھاڑ کے پڑ گئے تو پھر نہیں سمجھایا کہ چچا ! آپ سا بہادر مرد اور عورت کے منہ لگے شرم کی بات ہے۔ بڑی ہی شرم کی بات ہے۔ شرم۔ شرم چچا شرم

چچا۔" اماں کوئی میں نے نکاح کر تو نہیں لیا جو شرم شرم کے نعرے لگا رہے ہو۔ " میں اب خاموش ہو گیا۔"

چچا اور سکرین دو منٹ دباتیں بمشکل سے ایک منٹ چپ رہے ہونگے۔ پھر ادھر دیکھا۔ ادھر دیکھا۔ کھڑے ہو گئے

میں " کہاں چلے چچا ؟ "

چچا " ذرا پیشاب کے لئے "

ایک ۔" چچا پیشاب کے بہانہ خطرے کی زنجیر کھینچنے جا رہے ہیں عورت پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کریں گے "

دوسرا ۔" چچا کو غیرت آ گئی ریل سے کود کر جان پر کھیلنے جا رہے ہیں "

چچا ۔" کیا بھونک رہے ہو ؟ پیشاب کو جانے دو گے یا نہیں ؟ "

ریل کے پاخانہ کا کواڑ تھا سخت ۔ پہلے تو ہاتھوں سے زور کیا پھر لات ماری ۔ کواڑ نہ کھلا ۔ اب چچا ہیں کہ کواڑ سے دست و گریباں ہیں ۔ لات پر لات مار رہے ہیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا ۔ پانچ سات منٹ کی مسلسل جدوجہد کے بعد ایک دوست کی امداد سے کواڑ کھل گیا ۔ اندر داخل ہوئے تو کواڑ کھلا رہنے دیا کہ مبادا پھر وہی وقت مصیبت پیش آئے تو اندر کوئی امداد کرنے والا بھی نہ ہوگا پیشاب کے لئے بیٹھے تو عجیب بے تکے پن سے ۔ ہوا تیزی سے چل رہی تھی یا تو ہوا کے سبب سے یا ان کی بے تکی بیٹھک کی وجہ سے چھینٹے اڑنے لگیں ۔ چچا ان چھینٹوں کی زد سے بچنے کیلئے تھوڑے تھوڑے اٹھتے جا رہے تھے حتیٰ کہ آخر میں سیدھے کھڑے ہو گئے ۔

" چچا کرشان ہو گئے "، سب نے متفقہ فتویٰ دے دیا ۔

گاڑی کی رفتار دھیمی ہو چکی تھی سٹیشن قریب آ چکا تھا ۔ چچا کمر بند باندھتے ہوئے اور یاران طریق کی پھبتیوں کا جواب سوچتے ہوئے اپنی سیٹ کی طرف آ رہے تھے کہ اتنے میں کمبخت گاڑی ٹھہر گئی ۔ چچا نے کمر بند چھوڑ کر ہر چند ہوا کی کوٹیا بھری دجی ہاں کو سیا ! ریل کے ڈبہ کی " بر خلائے لسیط " کو دونوں ہاتھوں سے اپنی طرف سمیٹنے کا نام کیا ہے آپ ہی تجویز کیجئے) لیکن چچا کو کامیابی نہ ہوئی اور لڑکھڑا کے اسی غریب دیہاتن پر گرے جس سے نکاح کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا ۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ " وہ نکاح کر لیا " " وہ نکاح ہو گیا "، کسی نے کہا کہ " بالجبر " ہے ۔ کسی نے کہا [illegible] ضرورت ہی نہ تھی دل را بہ دل رہیست " کوئی بولا چچا ہماری مٹھائی ؟

مجھے اسی سٹیشن پر اترنا تھا احباب نے رخصت [illegible] اور ہم پیدل کی یاری سٹیشن پر دستے ماری کرتے ہوئے [illegible] کے پیچھے [illegible]

غزل

جناب انعام اللہ خاں صاحب ناصر

عقل کہتی ہے جنوں سے سرگراں ہو جائیے
دل یہ کہتا ہے کہ وقفِ امتحاں ہو جائیے

ضعف کو مدنظر ہے سایۂ سنگِ نشاں
شوق کہتا ہے غبارِ کارواں ہو جائیے

خاک چھانی ہے بہت کچھ بتکدے کی راہ میں
اب کسی کافر کا سنگِ آستاں ہو جائیے

خوگرِ تسلیم ہوں ہر حال میں رہتا ہوں خوش
مہرباں ہو جائیے نامہرباں ہو جائیے!

ننگ ہمت ہے تنگ ظرفوں سے جستجو کا سوال
پیکرِ اشکِ یاس بحرِ بیکراں ہو جائیے

سوز کی لذت تو یہ کہتی ہے اے شوقِ فغاں
بے دہن ہو جائیے اور بے زباں ہو جائیے

کنجِ تنہائی میں کب تک عاشقی اور احتیاط
اے جنوں بس اب تو رسوائے جہاں ہو جائیے

غزل

جناب مختار احمد صاحب مختار

محفل میں بھی ہے سامانِ طرب بار بھی ہیں
رقصِ مستانہ میں ساقی بھی ہے میخوار بھی ہیں

خوبیاں لاکھ ہوں ہوتی ہے برائی بھی ضرور
گل کے پہلو میں کھٹکتے ہوئے کچھ خار بھی ہیں

سوزشِ مہرِ قیامت کا نہیں ہے کھٹکا،
سائے میں عرش کے کچھ ہم سے گنہگار بھی ہیں

ساقیا پینے پلانے کا ہے ہنگام یہی،
سال نو جلوہ نما ہے گل و گلزار بھی ہیں!

عمر بھر جن کی محبت میں گزاری ہم نے،
بے وفا عہد شکن ظالم و عیار بھی ہیں

حور و کوثر کے مزے ہم کو ملے دنیا میں
ہاتھ میں جام بھی پہلو میں وہ سرکار بھی ہیں

جنبشِ تیغِ نظر! حصہ بقدرِ ہمت!
تیری جانبازوں میں مجبور بھی مختار بھی ہیں!

ہر شہر میں محنتی اور متدین ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ (مینیجر)

عورت کا انتقام

(از جناب سید محمود صاحب مورخ بی اے)

نوٹ:- یہ افسانہ نہیں بالکل سچا واقعہ ہے جس کا علم مجھے ایک دوست کی پرائیوٹ یادداشت کی ورق گردانی سے ہوا۔ جو ضروری ردوبدل اور ترمیم کے ساتھ ہدیہ ناظرین ہے۔ ترمیم کی ضرورت اس لئے سمجھی گئی کہ مجھے کسی کی تحقیر مدنظر نہیں۔ میں مشکور ہوں کہ میرے محترم دوست نے اسے شائع کرنے کی اجازت دیدی۔ ردوبدل میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ متعلقین پر تاریکی کا پردہ پڑا رہے مگر واقعہ کی دلچسپی بحال رہے۔ (مورخ)

اکتوبر ۳۲ء کی ایک شام تھی۔ عیش باغ (لکھنؤ) ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر چند مسافر ٹہل رہے تھے۔ ٹرین وقت مقررہ پر دھوئیں کے بادل اڑاتی، سیٹی بجاتی، شور مچاتی آئی۔ قلی مزدوری کے لئے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ سودہ فروش "پوری کچوری"، "حلوہ گرم"، "چائے پیو"، "پان بیڑی سگریٹ" کی صدائیں لگانے لگے۔ بعض مسافر پریشان صورت بنائے جگہ کی تلاش میں ڈبے جھانکتے پھرتے تھے۔ اتنے میں ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی عورت ایک ضعیفہ کے ساتھ پلیٹ فارم پر آئی اور ایک زنانہ درجہ میں جا بیٹھی۔ وہ ایک نہایت حسین نوجوان لڑکی تھی اور پریشان سی معلوم ہوتی تھی۔ گاڑی میں بیٹھکر اس نے ضعیفہ سے کہا:-

لڑکی۔ پاربتی! میں کس زبان سے تیرے احسانات کا شکریہ ادا کروں انسوس اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں کہ تیری وفاداری کا صلہ دوں۔ اگر آج تو جان پر کھیل کر میری مدد نہ کرتی تو میرا دغا باز چچا ضرور کامیاب ہو جاتا ——— (آبدیدہ ہوکر) میرا جی تیرے اس طرح جانے کو جی نہیں چاہتا مگر مجبوری سب کچھ کرا رہی ہے میں ایک دفعہ پھر التجا کرتی ہوں کہ میرے ساتھ چل۔ رام سنگھ بہت ظالم ہے۔ اور اگر اسے معلوم ہو گیا اور ضرور معلوم ہوگا کہ میں تیری ہی مدد سے فرار ہوئی ہوں تو وہ تجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔ اس ظالم سے یہ بھی دور نہیں کہ تیرے بے گناہ خاندان پر ظلم کرے میرا کہا مان لے اور میرے ساتھ چل۔"

پاربتی۔ کملا! گھبراؤ مت۔ پرماتما میری حفاظت کریگا۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ رام سنگھ مجھ پر کیا ظلم کرے گا۔ میں نے جس کا نمک کھایا ہے اس کی اولاد پر آنچ نہ آنے دونگی۔ اگر تیری حفاظت میں میری جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔ پرماتما کا شکر ہے کہ میں نے ثابت قدمی سے اپنا فرض ادا کر دیا۔ میرا تیرے ساتھ جانا فضول ہے بوڑھی ہو گئی ہوں سال دو سال سے زیادہ کی مہمان نہیں اب تو میری یہی پرارتھنا ہے کہ رام تجھے خوش رکھے۔

(۲)

گاڑی حرکت میں آچکی تھی مگر ابھی پلیٹ فارم نہیں چھوڑا تھا کہ ناگہاں "گاڑی روکو" "گاڑی روکو" کی صدا بلند ہوئی۔ نو دس لٹھ بند گنوار اور ایک ادھیڑ عمر کا معزز آدمی گرانبہا لباس پہنے پلیٹ فارم پر آگئے۔ گنواروں نے گارڈ کو حلقہ میں لے لیا اور وہ معزز آدمی جو ان کا سردار معلوم ہوتا تھا کہنے لگا:-

"گاڑی روک لو اس میں ایک مفرور قیدی سوار ہے۔ میں راجہ رام سنگھ تعلقدار اور آنریری مجسٹریٹ ہوں۔"

گاڑی روک لی گئی۔ پاربتی اور کملا کو گاڑی سے اتار لیا گیا

راجہ۔ "اس بھکارنی کی تلاشی لو۔ اس کے کپڑے اتار لو۔"

کملا۔ چچا! آخر میں تمہاری بھتیجی ہوں اگر تمہیں ایک بے گناہ اور بے کس و بے بس عورت کی عزت کا خیال نہیں تو کم از کم اپنے خاندان کی ناک تو مت کاٹو۔ مجھے اس طرح بدنام و رسوا کرکے خود کہاں کے عزت والے رہ جاؤ گے۔ اگر تمہیں زر کا لالچ ہے تو میرے پاس کیا رکھا ہے؟ یاد رکھو ظلم کا بدلہ ضرور ملتا ہے۔ بفرض محال اگر تمہیں بیکسوں کو ستانا اچھا نہیں اگر پرماتما کا خوف نہیں تو دنیا ہی چھوڑ دے۔ یاد رکھو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ میں اس وقت بے یار و مددگار ہوں لیکن تم مجھ پر ظلم ستم کرکے چین نہ پاؤ گے۔ دکھے دل کی آہ [illegible]

راجہ۔ (کملا کو ٹھکرا کر) بس! بدزبان خاموش۔ اول تو جرم کرنا اور پھر زبان چلانا۔ اگر اب بولی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔ اگر ٹکڑے ٹکڑے دیکھنے کیا ہو؟ اس کی تلاشی لو۔

کملا۔ (گنواروں سے) اگر اس ظالم کو اپنی عزت کا پاس نہیں تو تمہیں میری حالت زار پر رحم کھاؤ۔ اسے تو زر کے لالچ نے اندھا کر دیا ہے۔

دو معزز مسافر کملا کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے مگر گنوار رنگی اس کی مظلومانہ فریاد کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک نے زبردستی اس کے سر پر سے چادر کھینچ لی۔ دو نے اس کی باہیں پکڑ لیں۔ ایک نے اس کی قمیص پھاڑ ڈالی۔ قریب تھا کہ وہ اس پر ہاتھ اٹھا بیٹھیں کہ اتنے میں وہی دونوں معزز مسافر جو دیر سے کھڑے ظلم و مظلومیت کے افعال و کردار کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ آگے بڑھے اور ڈانٹ کر کہا

"خبردار اسے ہاتھ مت لگانا۔ انگریزی راج میں یہ اندھیر ابھی معصوم اور ناتجربہ کار لڑکی کبھی ارتکاب جرم نہیں کر سکتی۔ اگر بالفرض اس نے کوئی جرم کیا بھی ہے تو تمہیں برسر عام اسے بے عزت کرنے کا کیا حق ہے؟"

راجہ (جوش سے) "آپ کو میرے ذاتی معاملہ میں ٹانگ اڑانے کا کیا حق ہے؟ آپ میرے نقصان کے جوابدہ ہونگے۔"

مسافر۔ تم نے گاڑی روک کر اس کمزور مظلوم اور لاوارث لڑکی کی ذلت و توہین کی۔ دکھاؤ وارنٹ گرفتاری کہاں ہے؟

راجہ۔ "وارنٹ کس جانور کا نام ہے۔ میں آنریری مجسٹریٹ ہوں۔ میں نے اپنے اختیار سے گاڑی روکی۔ یہ میری مجرمہ ہے میں اسے ضرور سزا دونگا۔ آپ میرے معاملہ میں دخل نہ دیں اور (گنواروں سے) ڈرتے کیا ہو۔ اسے پکڑ لو۔

مسافر۔ "میں بھی دیکھوں کہ اب اس لڑکی کو کون ہاتھ لگاتا ہے؟!"

یہ سنکر رام سنگھ آگ بگولہ ہوگیا۔ قریب تھا کہ دونوں دست و گریباں ہو جائیں لیکن چند مسافروں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ راجہ صاحب مغلوب الغضب ہو چکے تھے اسے چھوڑ ایک اور مسافر سے الجھ پڑے

مسافر۔ آپ آنریری مجسٹریٹ ہو یا ڈپٹی کلکٹر اس سے ہمیں بحث نہیں البتہ ہم ایک بیکس عورت پر ظلم نہیں ہونے دیں گے اگر اس نے کوئی جرم کیا ہے تو عدالت میں جائیے اور وہاں بھی آپکو اس توہین کا جواب دینا ہوگا۔ خیریت اسی میں ہے کہ تشریف لیجائیے۔

راجہ رام سنگھ تو بس اپنی خدائی تو جبار جانتے تھے وہ بھلا کب کسی کی مانتے تھے۔ اپنے غرور عز و جاہ میں سب مسافروں کو اپنا دشمن بنا لیا۔ اور یہاں تک گرم ہوئے کہ ایک حق پرست و حق آگاہ مسافر کو اٹھا کر پٹخ دیا۔ اس پر دیگر پندرہ مسافروں نے پکڑ کر راجہ جی کا مکوں اور طمانچوں سے منہ لال کر دیا۔ جب خوب مرمت کر لی تو ہاتھ پیر باندھ کر اس کی موٹر میں پھینک آئے۔ اور ڈرائیور سے ڈانٹ کر کہا "ہانک دے"۔ ورنہ تیری بھی شامت آئے گی۔ موٹر یہ جا وہ جا۔

غریب کملا اپنی بے عزتی کے صدمہ سے بیہوش ہو چکی تھی ایک مسافر نے ہوا دے دے کر پانی کے چھینٹوں سے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔

کملا۔ "رحم کر، رام سنگھ رحم کر، میں بے گناہ ہوں، ظالم میں بیگناہ ہوں ... اگر تجھے میری جائداد کے لالچ نے اندھا کر دیا ہے تو لے لے، ساری جائداد لے لے۔ مگر ... مجھے بے عزت نکر!"

یہ کہکر وہ رونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی گھگی بندھ گئی۔ ایک مسافر نے تسلی دلاسا دیکر کہا کہ "دشمن رام سنگھ اب تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا" یہ سنکر کملا نے آنکھیں کھول دیں۔ رام سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو جو مسافروں کو آمادہ بہ جنگ دیکھکر پہلے ہی ادھر ادھر تتر بتر ہو چکے تھے موجود نہ پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ آنسو پونچھے اور کہا کہ میں کس زبان سے اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کروں۔

ایک مسافر۔ "آپ کون ہیں؟ رام سنگھ کون ہے؟ تم پر کیوں ظلم کرتا ہے؟ اور تم کہاں جانا چاہتی ہو؟"

کملا۔ افسوس کہ میں آپ کو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی کہ میں بے گناہ ہوں اور اپنی سسرال (دہلی بھیت) جانا چاہتی ہوں"

(۴)

راجہ رام سنگھ معزز راجپوتی خاندان کا فرد اور اودھ کا ایک مشہور تعلقدار تھا۔ یہ علاقہ اس کے خاندان کو نمک حلالی اور وفاداری کے صلہ میں جہانگیر نے عطا کیا تھا۔ جب غدر کا ہنگامہ بپا ہوا تو اس خاندان نے اپنی بساط سے زیادہ انگریزوں کی مدد کی جس کے صلہ میں جاگیر اور انعامات سے نوازا

نے بھرے دربار میں اعتراف کیا کہ اس خاندان نے اودھ کے تعلقداروں کو ہنگامۂ غدر میں شامل ہونے سے باز رکھا۔ ان خدمات کے صلہ میں راجہ کا موروثی خطاب بحال اور کچھ مزید علاقہ عطا ہوا تھا۔۔

راجہ رام سنگھ کا بھائی راجہ کرم سنگھ اولاد نرینہ سے محروم تھے پختہ عمر میں صرف ایک بیٹی کملا پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش سے چھ ماہ بعد اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ چودہ برس کی ہوئی تو راجہ کرم سنگھ نے اپنی تمام جائداد کملا کے نام رجسٹرڈ کرا دی اور پیلی بھیت کے ایک سربرآوردہ ومعزز خاندان میں شادی کر دی۔ اور جائداد کے کل کاغذ سربمہر لفافہ میں بند کر کے کملا کے خسر کے پاس بھیج دیئے۔

راجہ کرم سنگھ کی موت نے جلدی کی اور وہ کملا کو رخصت کرنے سے پہلے خود ہی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ مرتے وقت انہوں نے اپنی وفادار ملازمہ پاربتی اور اس کے شوہر گیان چند سے کہہ دیا کہ میں اپنی لخت جگر کملا کو تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ رام سنگھ پر مجھے کچھ وشواس نہیں وہ لالچی ہے

لیل ونہار کی ستم ظریفی دیکھئے کہ کرم سنگھ سے چندے بعد گیان چند بھی سرگباش ہو گیا۔ اب راجہ رام سنگھ نے اپنی من مانی کارروائیاں کرنی شروع کیں۔ کرم سنگھ کے تمام وفادار ملازموں کو ایک ایک کر کے موقوف کر دیا۔ پاربتی بیچاری زبردستی رہ پڑی وہ تو اسے بھی نہ رکھنا چاہتا تھا کملا ان حالات کو دیکھ دیکھ کر سہمی جا رہی تھی مگر نہ کچھ کہہ سکتی تھی نہ کر سکتی تھی۔ ۔۔۔۔ رام سنگھ نے کملا کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور آخر قتل کا فیصلہ کیا لیکن پاربتی نے راجہ صاحب کو اس ناپاک ارادہ میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ جب پاربتی کو یقین ہو گیا کہ اگر کملا چند روز بھی اور یہاں ٹھیری تو اس کی جان کی خیر نہیں۔ اس نے کملا کو مشورہ دیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ڈیوڑھی پر راجہ صاحب کے آدمی ہر وقت موجود رہتے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا آخر ایک دن پاربتی اپنے بیٹے کی مدد سے کملا کو اسٹیشن تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئی۔

(۴)

راجہ رام سنگھ اپنے وفادار ملازم میلا رام سے کہہ رہے ہیں کہ کملا نے توہین کے دعوے کے علاوہ نصف جائداد اور چار سال کا زرلگان بھی طلب کیا ہے۔ بیرسٹر کیا کہتا ہے؟

میلا رام۔ کملا نے جو کاغذات عدالت میں پیش کئے ہیں وہ مصدقہ ہیں اور ہمارے پاس جعلی وصیت نامہ ہے۔ اگر عدالت پر اس جعل سازی کا راز کھل گیا تو سزا سے بچنا محال ہے۔ اور توہین چونکہ برسرعام کی گئی تھی اس لئے اس کا جرم مسلم ہے۔ میں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ نصف جائداد اور زرلگان مطلوبہ ادا کر دیا جائے گا اور راجہ صاحب تحریری معافی بھی مانگ لیں گے اس پر کملا کا شوہر اور اس کا وکیل صلح کر لینے پر راضی ہیں مگر کملا کہتی ہے کہ میں اپنی بےعزتی کا بدلہ ضرور لونگی۔

راجہ رام سنگھ۔ کملا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں آج ہی کرنل راجرز اور کمشنر بہادر سے ملونگا آج اودھ میں ان کا طوطی بول رہا ہے۔ میں نے ان دونوں پر صدہا احسان کئے ہیں وہ ضرور میری مدد کریں گے میری موٹر۔ میرے ہاتھی۔ میرے گھوڑے اور میرا روپیہ بے تکلف استعمال کرتے ہیں تو اس کا کچھ بدل بھی ضرور ہونا چاہیئے۔

دوسرے دن پیشی کی تاریخ تھی سٹی مجسٹریٹ نے فرد جرم لگا کر مقدمہ سشن سپرد کر دیا۔ راجہ جی قید تو ضرور ہو جاتے لیکن ایک بہت بڑی رشوت کے طفیل ۵۰ ہزار کی ضمانت پر رہا ہو گئے۔

راجہ رام سنگھ۔ پنڈت میلا رام اور راجہ صاحب کے وکیلوں نے سرتوڑ کوشش کی اور فریق ثانی کے وکیل سے وعدہ کیا کہ اگر صلح ہو گئی تو اسے ایک گرانبہا انعام دیا جائیگا۔ کملا کے شوہر پر جو کملا کا مختار تھا۔ ہر طرف سے زور ڈالا گیا۔ بڑے بڑے رؤسا راجہ صاحب کی سفارش لیکر آئے۔ یہاں تک کہ اسے صلح پر راضی ہونا پڑا۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ نصف جائداد۔ چار سال کا زرلگان کرم سنگھ کی تمام دولت اور ۸۰ ہزار روپیہ نقد بطور تاوان اور ایک تحریری معافی نامہ عدالت میں پیش کریں۔

پیشی کے دن راجہ صاحب کے وکیل نے درخواست دی کہ فریقین میں صلح ہو گئی ہے اس لئے مقدمہ داخل دفتر کیا جائے۔

سشن جج (مدعی کے وکیل سے) کیا واقعی صلح ہو گئی ہے؟

وکیل مدعی۔ جی ہاں سب کچھ طے ہو گیا ہے صرف صلحنامہ پر دستخط باقی ہیں۔

سشن جج۔ خوشی کی بات ہے صلح نامہ پر دستخط کرلو کہ میں مثل داخل دفتر کردوں۔

راجہ صاحب کے وکیل نے کملا کے شوہر سے استدعا کی کہ صلحنامہ پر دستخط کر دیں۔ وہ اٹھا اور قریب تھا کہ دستخط کر دے کہ معاً کمرہ عدالت کا دروازہ کھلا اور کملا نہایت غصہ کی حالت میں اندر داخل ہوئی۔

کملا - (اپنے شوہر سے) خبردار دستخط نہ کرنا - مجھے صلح منظور نہیں اس مقدمہ کا تعلق میری ذات سے ہے میں اپنی سرعام بےحرمتی اور توہین کو فراموش نہیں کر سکتی - میں انتقام لونگی اور ضرور لونگی دسشن جج سے ، میں مختارنامہ توڑتی ہوں - مجھے صلح ہرگز منظور نہیں - آپ مقدمہ جاری رکھیں -

(۵)

کئی ماہ تک مقدمہ چلتا رہا - راجہ صاحب نے وکیلوں پر روپیہ پانی کی طرح خرچ کیا - لیکن سشن سے جو سزا چار سال قید اور اسی ہزار روپیہ جرمانہ کی ہوئی وہ پریوی کونسل تک بحال رہی بالآخر راجہ صاحب نے وائسرائے ہند کے ہاں رحم کی درخواست دی کئی معزز تعلقداروں اور راجاؤں نے رام سنگھ کی سفارش کی۔

مقررہ تاریخ پر وائسرائے کے حضور میں مقدمہ پیش کیا گیا۔ ایک راجہ نے رام سنگھ کی حمایت میں کھڑے ہو کر یہ تقریر کی : —

"مائی لارڈ! راجہ رام سنگھ راجپوتوں کے اس خاندان سے ہے جس کی جاں نثاری اور وفاداری حکومت مسلم ہے - ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ غدر میں انگریزوں کی ایسی مدد کی تھی جس کا اعتراف لارڈ لارنس کو بھرے دربار میں کرنا پڑا تھا - پھر جنگ عظیم میں خود راجہ صاحب نے پانچسو رنگروٹ اور کئی ہزار روپیہ دیا تھا - اس کی اور اس کے خاندان کی بیش بہا اور قابل قدر خدمات کا تقاضا یہی ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیا جائے - اس میں اس کی ہی نہیں بلکہ کل تعلقداران اودھ کی بےعزتی ہے - یہ صرف ایک خاندانی معاملہ ہے - ایک عورت کی بیجا ضد نے اسے اس قدر طول دیدیا ہے - یہ میں اپنی ہی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ جملہ معزز تعلقداروں اور دیگر حاضرین محترم کی خواہش کی نمائندگی کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد چند راجاؤں نے کھڑے ہو کر اس کی تائید کی اور سب نے بیک زبان کہا کہ راجہ رام سنگھ کو رہا کر دینا ہی قرین مصلحت ہے - اس معاملہ نے اودھ میں بےچینی پھیلا دی ہے - اور اگر وائسرائے بہادر نے ہمارے مفید مشورہ پر عمل نہ کیا تو ممکن ہے یہ معاملہ کوئی اور ناگوار صورت اختیار کر لے ۔"

سب سے آخر میں راجہ رام سنگھ نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں اپنی اور اپنے خاندان کی سابقہ خدمات کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا "البتہ میں حضور والا سے دست بستہ رحم کی درخواست کرتا ہوں انسان غلطیوں کا مجموعہ ہے - میں اپنے قصور پر نادم اور پشیمان ہوں - مجھے امید ہے کہ یہاں میری درخواست صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی"

لارڈ ریڈنگ نے اپنے ایڈی کانگ اور ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں سے پندرہ منٹ تک تبادلۂ خیال کیا - پھر وہ فیصلہ سنانے کے لئے کھڑے ہوئے - ابھی ایک لفظ بھی زبان سے نہ کہا تھا کہ ایک خادم نے اطلاع دی "ایک امیر عورت حضور وائسرائے بہادر سے فوراً ملنا چاہتی ہے اور کہتی ہے کہ اس مقدمہ سے اس کا گہرا تعلق ہے اگر اسے فوراً ملنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ خودکشی کر لے گی - وائسرائے نے تھوڑی سی خاموشی کے بعد کہا کہ اسے اندر بھیجدو -

کملا اسی خادم کے ساتھ اندر آئی اور مودبانہ سلام کے بعد کہا :-

"مائی لارڈ! آپ نے میرے مقدمہ کے کاغذات ملاحظہ فرمائے ہونگے اس لئے آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ معاملہ کس قدر سنگین ہے ہزاروں کی موجودگی میں راجہ صاحب نے میری بےعزتی کی - میں بھی اسی خاندان سے ہوں جس کی خدمات کے صلہ میں راجہ صاحب رحم کے ملتجی ہیں - کیا ایک معزز اور شریف خاندان کی بےکس مظلوم عورت کی مجمع عام میں بےعزتی و بےحرمتی کر کے وائسرائے سے بچ جائیگا؟ مجھے یقین ہے کہ انگریز قوم ایسی بےانصاف نہیں کہ راجہ صاحب کو رہا کر کے انصاف کا خون کر دے - اگر راجہ صاحب اپنے خاندان کی زریں خدمات کی بنا پر رحم کی التجا کرتے ہیں تو میں بھی انہی خدمات عالیہ کی یاد تازہ کرا کر درخواست کرتی ہوں کہ مجرم کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ آئندہ کسی کو بےکسوں پر ظلم ڈھانے کا حوصلہ نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

یہاں تک پہنچکر وہ رونے لگی وائسرائے نے کہا مسٹر فکر مت کرو یہ انگریزی عدالت ہے یہاں کبھی انصاف کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد لارڈ ریڈنگ نے ایک طویل تقریر کے دوران میں اپنا فیصلہ سنایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ راجہ رام سنگھ کو چار سال قید بامشقت کے بجائے دو سال قید محض اور ۸۰ ہزار کے بجائے ۵۰ ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا - زرگان اور نصف جائداد کملا کی ملکیت قرار دی گئی۔ (مورخ)

ملت فروشوں سے

(از حضرت جوش ملیح آبادی مدظلہ)

ہوشیار اے بے حیا، غدار، اے نفسِ دنی! — دیکھ آپہنچا وہ اے کمبخت وقت جاں کنی
وقت استغفار کا ہے چونک بھی او بدنصیب — وہ اجل کا سرد چنگل آگیا سر کے قریب
جب تری گردن پہ ہو جائیں گی تیغیں بے نیام — سلطنت کا رعب کیا اس وقت آسکتا ہے کام
وہ وطن توڑے تھے جس کے سر پہ تو نے آسماں — پیسنے کو ہے تری ناپاک گندی ہڈیاں
پھول اپنے روک لے گی نرم پودوں کی لچک — قبر تیری ٹھوکریں کھاتی رہے گی حشر تک!
روح تیری جانبِ گردوں کرے گی جب سفر — بادلوں سے بجلیاں جھپٹیں گی تجھ کو دیکھ کر
تو پکارے گا کوئی حاکم مجھے آکر بچائے! — رعد گرجے گا کہ اب یہ نا سزا بچ کر نہ جائے
آسمانوں پر بھی او کافر نہ پائے گا اماں — چاٹ لینے کو تجھے دوزخ نکالیگا زباں
ابرِ آتش آئے گا تجھ پر برسنے کے لئے — سانپ بل کھانے لگیں گے تجھکو ڈسنے کیلئے
قہرِ حق تجھ کو سنائے گا جہنم کی وعید — تیرا یومِ قتل ٹھیرے گا وطن میں روزِ عید
تیرے مرجانے کے بعد اے سرگروہِ اشقیا! — دانہ دانہ کے لئے ترسیں گے تیرے اقربا!
انگلیاں اٹھیں گی دنیا میں تری اولاد پر — غلغلہ ہوگا وہ آتے ہیں دنائت کے پسر
تیری مستورات کا سڑکوں پہ کل ہوگا قیام — معرضِ دشنام میں تیرا لیا جائے گا نام
کانپ اٹھیں گی ذکر سے تیرے کنواری لڑکیاں — فحش سے بڑھ چڑھ کے سمجھا جائے گا تیرا بیاں
ہر بہادر کو تصور سے ترے آئے گی شرم — خون، تیرا نام لیتے وقت ہو جائے گا گرم
کیا جوانوں کے غضب کا ذکر او مستِ خطاب — سن کے تیرا نام اڑ جائے گا بوڑھوں کا خضاب
آئے گا تاریخ کا جس وقت جنبش میں قلم — قبر تیری دے اٹھے گی لو، جہنم کی قسم

صفحۂ قرطاس پر کانپیں گے یوں تیرے نشاں — تیرگی میں جس طرح شیطان کی پرچھائیاں
جس کو دانائی سمجھتا ہے وہ بیڑے گی خری — لعنتوں میں کھائے گی غوطے تری نام آوری
سخت حیراں ہوں نہ اب تک تجھ پہ کیوں بجلی گری — بیوفا، غیروں کی خاطر بھائیوں کی مخبری!
تاج سے تیری وفاداری کی قسمیں بار بار — بھنبھناتی ہیں ترے ہونٹوں کے گرد او نابکار
دم گھٹا جاتا ہے میرا دور ہو اے تنگ دل — مونہہ سے تیرے جھوٹ کے آتے ہیں بھبکے متصل
خوفِ حق، خوفِ وطن، خوفِ خدا کچھ بھی نہیں — تیرے دل میں خوفِ حاکم کے سوا کچھ بھی نہیں
تجھ سے رو گرداں نہیں ہیں صرف ملت کے زعیم — حاکمانِ وقت بھی تجھ کو سمجھتے ہیں لئیم!
تیری نفرت کی کھٹک دونوں کی آب و گل میں ہے — فرق یہ ہے اپنے لب پر ہے اور ان کے دل میں ہے
تیرے خال و خط کی مسند پر ہے سرگرم خطاب — بزدلی، الٹے ہوئے تاریک چہرے سے نقاب
تیری پلکوں سے شقاوت کا دھواں ہے آشکار — اس دھویں کے سائے میں ہے حبِ ملت کا مزار
اپنی پیشانی پہ بکھرائے ہوئے سازش لٹیں — تیرے ماتھے کی شکن میں لے رہی ہے کروٹیں
تیری چشمِ تنگ کی گردش میں او ننگِ وطن — سو رہا ہے دردِ ملت دیر سے اوڑھے کفن!
قوم کا دل ہے ترے ہونٹوں کے اندر پاش پاش — دوش پر ہے تیرے لہجہ کے تری عزت کی لاش
اُف تری آنکھوں کے ڈورے ہیں یہ خود غرضی کی لہر — جس کی رو ٹپکا رہی ہے ساغرِ جرأت میں زہر
اک خطاب اور اس کا اتنا شوق بیجا! شرم! شرم! — بیچتا پھرتا ہے یارانِ وطن کا خون گرم؟!!
مال و زر کیا ہے، چڑھا دیتا ہے تو یاروں کے سر — صرف اک اپنی تن آسانی کی قربانگاہ پر!!
شرم سے گڑ جا، شرافت کی اڑیں یوں دھجیاں — بھائیوں کا گوشت کھا کھا کر بنا ہے پہلواں؟!
کتنا ہیبت ناک ہوگا نا سزا تیرا مآل! — ذبح کر دے گا تجھے خود تیری ملت کا جلال
خون میں اپنے ہی تجھ کو دیکھ کر لتھڑا ہوا — گونج اٹھے گا نا تحانہ قہقہہ شیطان کا
ہو چکے ہیں مشورے تیری قضا کیواسطے — جاگ اٹھ اب بھی سویرا ہے خدا کیواسطے

نیرنگ (افسانہ)

(از ڈاکٹر سید نادم رضوی الناظری سیتاپوری مقیم لاہور)

"سیٹھ جی! آج کئی دن ہو گئے گھر میں کھانا نہیں پکا لیکن..."

"بچے یا نہ بچے۔ میرا کل روپیہ معہ سود در سود دو ہزار رقم کو جلد سے جلد ادا کرنا ہوگا۔"

"سیٹھ صاحب! قسم کھا کر کہتا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بہن بھائی سب فاقہ سے ہیں...."

"اجی مرزا صاحب! آپ اس وقت باورچی کی دکان پر نہیں ہیں ایک شاہوکار کی دکان پر ہیں جہاں روٹی کا ذکر بیکار ہے یہ بتاؤ کہ حساب کب چکاؤ گے۔"

"اچھا تو پھر سود در سود کی رقم معاف کر دو تو شاید کچھ ادائیگی کی صورت نکل آئے۔"

"کبھی کسی شاہوکار نے بھی کچھ معاف کیا ہے۔ شاہوکار کیا ہوا کوئی مولوی، برہمن ہو گیا۔ میں نے دان کرنے اور معافیاں دینے کو یہ کاروبار جاری نہیں کیا۔

"آخر ابا مرحوم نے تم سے صرف سو روپے ہی تو لئے تھے..."

"کیوں جی! تم سنتے نہیں؟ ابا مرحوم، ابا مرحوم کر رہے ہو۔ اسی کا بس تو رونا ہوا ہے۔ میں تو ہر دفعہ بتا دیتا تھا کہ اب دو سو ہو گئے اب پانسو ہو گئے۔ ہزار ہوئے پر بھی شاید میں نے یاد دہانی کر دی ہوگی۔ ایسا سود کا ڈر ہوتا تو پہلے ہی نہ ادا کر دیتے۔"

سلیمان شکوہ کو غصہ تو بہت آیا۔ کیونکہ ابھی ریاست کی بو دماغ سے نہ جانے پائی تھی۔ ستم روزگار بھی اس کا دل جلانے کو کیا کم تھا کہ اس پر ایک معمولی ساہوکار کی یہ تیز گفتاری اور التجائے عفو و رحم پر یہ زجر و تحقیر۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ رگوں میں تیموری خون کھولنے لگا۔ مگر اپنی مصیبت، ناداری، اور وقت کی ناسازگاری کو دیکھ کر خون کا سا گھونٹ پی گیا۔ اور بغیر ایک کلمہ زبان سے نکالے واپس چلا گیا۔

(۲)

شاہی خاندان کے وہ افراد جنہوں نے رنگا رنگ کی مرغن اغذیہ اور قسم قسم کے لذیذ کھانوں کے سوا کبھی کچھ نہ کھایا تھا آج روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کو ترس رہے ہیں اور بھوک سے بیتاب ہو ہو کر رو رہے ہیں۔ سلیمان شکوہ کو جو آتے دیکھا تو چھوٹے چھوٹے بہن بھائی دوڑے۔

"بھیا کچھ لائے؟"

"دیکھو ابھی لاتا ہوں"

آہ اس وقت ان معصوموں کی کیا حالت ہوئی ہوگی جب سلیمان کی زبان سے یہ جواب نا ہوگا۔ ماں نے اپنے پریشان بیٹے سلیمان کا مایوس چہرہ دیکھا تو کلیجہ کے ٹکڑے ہو گئے۔ پھوٹ پھوٹ کے رونے کو جی چاہتا تھا لیکن اس خیال سے کہ کہیں اسے روتا دیکھ کر معصوم بچے اور نہ ہلاک ہوں سینے پر صبر کی سل رکھ کر خاموش ہو گئی۔

سلیمان شکوہ نے گھر کا رنگ دیکھا تو اسے ایک آخری فیصلہ کرنا پڑا اور وہ یہ تھا کہ شاہزادگی تو گئی سلطنت کے ساتھ۔ اب جیسے دوسرے غریب غربا محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں ایسے ہی مجھے بھی کرنا چاہیئے۔ ورنہ اس ذلت و رسوائی کے لئے تیار رہنا چاہیے جو دو کوڑی کے گنوار سے سر بازار اٹھانی پڑی۔ اگر میں حاجتمند بنکر اس کی دکان پر نہ پہنچتا تو ساہوکار کی مجال نہ تھی جو ایسی سختی سے پیش آتا۔ یہ سوچا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا کہ "دیکھو ابھی لاتا ہوں"

ابھی اسے گئے ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ مہاجن معہ چند سرکاری پیادوں کے اس کے دروازہ پر پہنچا اور سلیمان شکوہ کو آواز دی۔ بچے باہر نکلے تو سیٹھ نے ڈانٹ کر کہا کہ سلیمان کو بھیجو۔ چھپتا کیوں ہے۔ کہو اپنا اسباب اٹھا کر لیجائے یہ گھر اب اسکی ملکیت نہیں۔

سلیمان شکوہ کی والدہ جو اس شور وغل سے دروازہ پر آچکی تھی اپنی بےکسی وبےبسی پر بے اختیار رونے لگی ۔ سرکاری پیادوں نے جب دیکھا کہ کوئی سنتا ہی نہیں تو دندناتے گھستے ہوئے چلے گئے ۔ اور چند ٹوٹے پھوٹے برتنوں اور پھٹے پرانے بستروں کو باہر سڑک پر لا کر ڈال دیا اور جو چھوٹی موٹی چمکدار چیز نظر آئی وہ اپنی جیب میں پہنچائی ۔ شہزادی کو جو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھوکی پیاسی کلیجہ سے لگائے بیٹھی تھی باہر نکال دیا ۔

سلیمان شکوہ جس وقت تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف آرہا تھا تو وہ غیر معمولی مسرور نظر آتا تھا ۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ آج عمر میں پہلی مرتبہ وہ اپنی قوت بازو سے پیدا کر کے بھائی بہن اور ماں کے لئے چند پیسے لا رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا بدھ ایک جمعرات دو ۔ جمعہ تین ۔ آج تیسرا دن اور پانچواں فاقہ ہے ۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ چھٹے فاقہ سے پہلے میں نے اس طویل روزہ کی افطاری خرید لی ہے ۔ اس کے پاس کچھ آٹا ۔ کچھ پکی پکائی روٹی ۔ دو ایک پھل ۔ اور چند پیسے نقد موجود تھے ۔ لیکن آہ ! جس وقت وہ اپنے اجڑے ہوئے گھر کے سامنے پہنچا تو کلیجہ شق ہو گیا ۔ دماغ سے دھواں نکل گیا ۔" اف گھر میں قفل پڑ گیا ۔ میری ماں اور بہنیں دربدر کر دی گئیں ۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے ۔ یہ صبر و استقلال کا نوجوان دیوتا جس نے بڑی سے بڑی مصیبت کے وقت بھی اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کو نم آلود نہ ہونے دیا تھا آج اس نئی افتاد پر ضبط نہ کر سکا ۔ جن آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے ان سے آنسوؤں کی جھڑیاں برس برس کر شعلوں کو سرد کرنے لگیں تھوڑی دیر وہ اپنے آبائی مکان کو پتھر کا بت بنا ہوا تکتا رہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ، ایسی ٹھنڈی جو موسم کو تبدیل کر دینے کی قدرت رکھتی تھی ۔ اپنے بھائی بہن اور ماں کی جستجو میں چل دیا ۔

(۳)

ہا ہا ہا ... کیا قسمت ہے ۔ کیسا عمدہ مکان ہاتھ آیا ہے ۔ اجی مکان کاہے کو یہ تو محل ہے محل ۔ اور کہیں کوئی دولت خزانہ بھی ہو تو دور نہیں کیونکہ شاہی خاندان کا مسکن ہے ۔ شاہی زمانہ کا بنا ہوا ہے اس میں بھی مایہ نہ ہو گی تو اور کہاں ہو گی ۔ وہ لونڈا سلیمان شکوہ جس کے دماغ میں امارت و شاہی کا بھوت بھرا ہوا ہے میرے ایک ہی جھٹکے کا ہوا ۔ دل میں آتا ہے اس لونڈے سے اکبر بادشاہ کا بدلہ لوں جس نے رانیوں سے شادی کی تھی ۔ اب جو کہیں ملے گا تو اس سے کہونگا کہ سنو مرزا جی بہت دنوں کو پھرنا چاہتے ہو تو میں ایک تجویز بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں تمہارا جدی پشتی مکان جو اب میری ملکیت ہے رہنے کو دیدونگا اور تمہیں دس روپے ماہوار کا ملازم بھی کرا دونگا اگر تم اپنی بڑی ہمشیر .... یعنے ہمشیرہ .... یعنے بہن کی شا ...... دی .... سے ... رے .... ایک امیر آدمی کے ساتھ ... سمجھے یعنے ... سے ... رے .... سمجھے ....

اجی یہ بات میں خود اس سے ہرگز نہ کہونگا ۔ وہ غریب سہی مگر پھر بھی آخر ایک مغل بادشاہ کی اولاد میں سے ہے ۔ ذرا غصہ سے دیکھے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی کچے کو چبا جائے گا ۔ وہ تو میں ہی ہوں کہ اس کی ہر تیکھی نظر کو سہار گیا ۔ کیوں منیم جی ؟

ٹھیک ہے سیٹھ جی ۔ وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا کہ تم لینداری تھے وہ دینداری تھا ۔ اب نفع کا سودا تو ہو ہی چکا ٹوٹے کا رہ گیا ہے اسے جانے دو ۔

اتنے میں کسی نے دروازہ پر آواز دی ۔

" کون ہے " سیٹھ نے ڈانٹ کر آواز دی ۔

" ارے بھئی ذرا سیٹھ جی کو باہر بھیجنا "

" آتا ہوں "

یہ کہکر سیٹھ جی کے پیٹ میں ہیبت وخوف کے چوہے دوڑنے لگے اور منیم جی سے کہا کہ ہو نہ ہو سلیمان نے ہماری سب باتیں سن لیں میں باہر نہ جاونگا ذرا تم دیکھ آؤ کہ یہ زبردست ڈانٹ سے بلانے والا ہے کون ۔ اگر سلیمان ہو تو اندر نہ بلانا ۔ اور ذرا ہاتھوں کو بھی دیکھ لینا ۔

اتنے میں پھر آواز آئی :-

"سیٹھ جی ! ذرا باہر آئیے "

سیٹھ جی اچھل پڑے ۔ اور حواس بجا رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے " ٹھیرو صاحب آپ نے تو ٹٹی کرنا دوبھر کر دی " ۔ آخر منیم جی آگے آگے اور سیٹھ جی پیچھے پیچھے دروازہ پر پہنچے ۔ نووارد نے پوچھا " سلیمان شکوہ والا مکان خالی ہے ؟" منیم جی نے سیٹھ جی کی طرف مڑ کر اشارہ کیا کہ آجاؤ ۔ سیٹھ جی کھکارتے کھانستے سامنے آئے اور کہا ذرا جلدی سے فرما دیجئے ۔ مجھے فرصت نہیں ہے ۔

نوارد۔ اگر سلیمان والا مکان خالی ہو تو میں کرایہ پر لینا چاہتا ہوں۔
سیٹھ جی۔ (گھبراہٹ آمیز خوشی کے ساتھ) ہاں خالی ہے آپ کیا کرایہ دے سکتے ہیں؟
نوارد۔ مکان آپکا اور کرایہ میں بتاؤں؟
سیٹھ جی۔ (ذرا جھینپ کر) میں یہ کہہ رہا تھا کہ... مکان بہت بڑا ہے۔ آپ کیا کرایہ دیں گے یعنے کرایہ بھی زیادہ ہے۔
نوارد۔ عجیب بات ہے آپ سے کرایہ دریافت کیا جا رہا ہے اور آپ تحقیر کر رہے ہیں۔ جو کچھ آپ لینا چاہیں بتا دیجئے۔ میں مناسب سمجھونگا لے لونگا۔ ورنہ واپس چلا جاؤنگا۔
سیٹھ جی (مونچھوں پہ ہاتھ پھیر کر) "میاں جی اس کا کرایہ کچھ نہیں کچھ نہیں تو... (منیم جی کیطرف دیکھکر) کوئی پندرہ روپے ماہوار سے کیا کم ہوگا"
منیم جی۔ میاں جی وہ مکان تھوڑا ہی ہے۔ چھوٹا سا ایک قلعہ سمجھو۔ سیٹھ جی نے کرایہ ٹھیک بتایا ہے۔ مکان دیکھتے ہی طبیعت خوش ہو جائیگی"
نوارد۔ "اچھا منظور ہے"
سیٹھ جی۔ مگر......"
نوارد۔ مگر کیا؟
سیٹھ جی۔ کچھ نہیں... میں پوچھتا تھا یعنے میں کہتا تھا کہ..... اگر ایک مہینہ کا کرایہ پیشگی دیدیتے... تو.... یہ لیجئے کنجی لیتے جایئے۔
نوارد۔ (مسکرایا) ۔ جیب سے پندرہ روپے نکال سیٹھ کے ہاتھ پر دیدیئے۔ اور کنجی لے کے یہ جا وہ جا۔

جب وہ چلا گیا تو سیٹھ جی منیم جی سے کہنے لگے بڑی چوک ہوئی کچھ لکھت پڑھت ہو جاتی تو اچھا تھا۔ روپے دیتے وقت اس کا کچھ مسکرانا بھید سے خالی نہ تھا۔
منیم جی۔ اجی سیٹھ جی۔ یہ تو پردیسی سا لگے ہے کچھ فکر نہ کیجئے۔
سیٹھ جی۔ منیم جی تم نہیں جانتے۔ پندرہ روپیہ کی مٹھی بھر چاندی امیر آدمی ہی دے سکتا ہے۔ اور پھر یہ کہ ایک دمڑی اس نے کم نہ کی اور سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ وہ مسکرایا تھا۔
منیم جی۔ اچھا تو پھر کل جا کر لکھت پڑھت کرا لینگے۔
سیٹھ جی۔ ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے۔

(۴)

دہلی سے کئی میل کے فاصلہ پر جمنا کے کنارے ایک پھونس کی جھونپڑی میں کچھ عجیب طرز میں فطرت کی زبان حال عبرت کے سبق پڑھا رہی تھی۔ سر شام چاروں طرف جنگل میں سناٹا چھایا ہوا تھا جمنا کی سبک سیر موجیں ساحل کے قدم چوم چوم کر عجز و نیاز کے طریقے سکھا رہی تھیں جسے دیکھ دیکھ کر مہتاب اپنی سیم افشانی سے داد دے رہا تھا۔ اس خاموش اور نورانی فضا میں اسی ویران جھونپڑی سے کبھی کبھی کراہنے کی آواز آجاتی تھی۔ جو ایک سیکنڈ کے لئے اس طلسم سکوت کو توڑ دیتی اور پھر سناٹا چھا جاتا۔

کوئی آٹھ بجے کے قریب ایک گھوڑا گاڑی اس جھونپڑی کے کنارے آکر رکی۔ اور ایک شریف صورت خوش پوشاک آدمی اس گاڑی سے اتر کر اس جھونپڑی کے دروازہ پر آواز دی "اس کے اندر کون ہے؟" کوئی آواز نہ آئی۔ نووارد اندر چلا گیا۔ ایک ضعیفہ فرش خاک پر لیٹی ہوئی نیم مردہ حالت میں کراہ رہی تھی۔ ایک چھ سال کا دوسرا آٹھ سال کا بچہ زمین پر پڑا ہوا سو رہا تھا۔ ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی بیٹھی ہوئی زار و قطار رو رہی تھی۔ ایک نوجوان اپنے زانو پر ضعیفہ ماں کا سر رکھے ہوئے اس کے نورانی چہرے کو دیکھ دیکھ کر آبدیدہ ہو رہا تھا۔ غرض نووارد اس عبرت انگیز منظر کو دیکھ کر چند سیکنڈ کے لئے ششدر رہ گیا۔ جونہی ضعیفہ کے چہرہ پر اس کی نظر پڑی بیساختہ اس کے منہ سے نکلا "آہ بھابی جان" ضعیفہ نے آنکھ کھولی اور آہستہ سے نحیف و ناتوان آواز میں کہا "دارا.. شکوہ.. تم... کہاں؟" نووارد نے جواب کچھ نہ دیا اور بوڑھی شہزادی سے چمٹ کر خوب رویا اس وقت جو بیدار تھے وہ سب رو رہے تھے اور اس درد سے رو رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا چاند ستارے۔ آسمان۔ زمین۔ دریا۔ ساحل۔ تری کا ہر قطرہ، خشکی کا ہر ذرہ رو رہا ہے اور شاید کبھی خاموش نہ ہونے کے تہیہ سے رونا شروع کیا گیا۔ دیر تک یہی جگر خراش سلسلہ بندھا رہا...... جب خوب جی بھر کے رو چکے۔ اور دلوں کی بھڑاس نکل گئی تو نووارد نے کہا کہ اب گھر چلیئے گاڑی تیار ہے" اتنا کہکر نووارد نے سب سے پہلے ضعیفہ کو اور پھر سب بچوں کو گاڑی میں سوار کرایا۔ اس کے بعد سلیمان کو ساتھ لیکر خود بیٹھا۔ گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

(۵)

آج پھر یہ ستم رسیدہ قافلہ اپنے آبائی مکان میں ہے۔ اسی مکان میں جس سے دو دن پہلے نہایت بیدردی سے نکال دیئے گئے تھے ۔

ضعیفہ نے کہا سلیمان دیکھو یہ تمہارے چچا ہیں ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا اور سنو دارا تم بچوں کا خیال رکھنا۔ اب میرا وقت قریب ہے۔ پھر اپنی "آپ بیتی" بھی سنا دی ہوتی" دارا نے کہا، بھابی جان! خدا آپ کو شفا دے۔ میں اس وقت آپ کو کیا آپ بیتی سناؤں۔ میری ساری آپ بیتی دو لفظوں میں یہ ہے کہ والد مرحوم کی حیات ہی میں، میں دکن چلا گیا تھا۔ غدر سے پہلے میں آنے والا تھا کہ غدر بپا ہو گیا۔ اب جو یہاں پہنچا تو رنگ ہی بدلا ہوا پایا۔ یہ گھر میں نے کرایہ پر اس لئے لیا کہ دادا جان نے اس مکان میں زمین دوز تہہ خانے بنوائے تھے جن میں بہت روپیہ اور سونا محفوظ ہے اگر بھائی صاحب کی موت اچانک واقع نہ ہوتی تو وہ ضرور آپ کو کچھ نہ کچھ بتا دیتے۔ سوائے ان کے اور میرے یہ راز کسی اور کو معلوم نہ تھا۔ بھائی صاحب نے ساہوکار سے ضرورتاً قرض نہیں لیا تھا بلکہ مصلحتاً لیا تھا۔ آپ کے مقدر کا لکھا پورا ہونا سو ہو گیا اب وہ تمام خزانہ تمہارا ہے"

اتنا کہکر بھاوج کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں حلقہ میں پہنچ چکی تھیں اور جانکنی ہو رہی تھی۔ دارا نے گھبرا کر کہا سلیمان پانی لاؤ۔ حلق میں پانی کا ٹپکانا تھا کہ بوڑھی شہزادی نے آخری ہچکی لی اور جان شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(۶)

آج پھر اس مکان میں اگلی سی رونق ہے۔ زرق برق پوشاکیں ہیں۔ مردانہ کمروں میں قیمتی قالین۔ اعلیٰ درجہ کا فرش اور نفیس سامان غرض سب امیرانہ بلکہ شاہانہ ٹھاٹھ ہے۔ دو توانا پٹھان خدام کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ صدر قالین پر ایک چاندی کا خاصدان اور ایک شاندار پیچوان بیچ میں رکھا ہوا ہے۔ سلیمان شکوہ زربفت کی شیروانی پہنے کہیں جانے کو تیار کھڑا تھا کہ اتنے میں سیٹھ جی ایک اسٹامپ ہاتھ میں لئے جا دھمکے اور سلیمان کو پہچانے بغیر سلام کرکے کہنے لگے کہ ذرا بڑے نواب صاحب کو کرایہ نامہ لکھنے کے لئے بلوا بھیجئے اس نے سیٹھ سے کہا بیٹھئے۔ اور دونوں ملازموں کو آواز دی۔ جبار خاں! قہار خاں!..... دونوں حاضر ہوئے۔ سلیمان نے حکم دیا "ہندو بچہ کہ پیش نظر شما نشستہ است بر فرق دانش کفش کاری کنید تا آنکہ من حکم ثانی دہم" حکم پاتے ہی سیٹھ جی کی جو تواضع ہوئی وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ آخر تصفیہ اس طرح ہوا کہ بجائے کرایہ نامہ لکھے جانے کے سیٹھ جی کی طرف سے بیعنامہ لکھا گیا۔ اور دو ہزار روپیہ نقد بطور زر فدیہ ادا کیا گیا۔ تب کہیں جا کر وہ جان بچی لاکھوں پائے خیر سے لالہ گھر کو آئے" کہتے ہوئے سیٹھ جی دکان پر پہنچے۔

منیم جی۔ کیوں سیٹھ جی! آپ نے دو ہزار روپیہ رقعہ بھیجکر پٹھان کے ہاتھ کیوں منگوایا تھا؟ کیا لال قلعہ کا سودا کر لیا؟؟

سیٹھ جی۔ ٹبّر لوٹ گیا۔ کل عدالت میں دیوالہ کی درخواست دیدو اور شہر میں دیوالہ پٹوا دو۔

غزل

:- از جناب اشرف خاں صاحب اثر چاندوڑی مدرس بسین ضلع تھانہ بمبئی

کیوں مفت عمر اپنی غفلت میں کھو رہا ہے؟ کیوں اپنے ہاتھوں اپنی لٹیا ڈبو رہا ہے؟
جاگ اٹھی ساری دنیا تو ہے کہ سو رہا ہے! غفلت پہ تیری مجھ کو افسوس ہو رہا ہے!
محروم علم و دانش خود کو جہاں میں رکھ کر کیوں اپنی رہ گزر میں کانٹے تو بو رہا ہے؟
تنظیم کا جہاں میں اعلان اٹھ کے کر دے شیرازہ قومیت کا پامال ہو رہا ہے!
چشم اثر سے پیہم کیوں بہہ رہے ہیں آنسو غمگین حال مسلم کی غم میں رو رہا ہے

مزاحیہ
(افسانہ)

بیجوڑ شادی

از عزیزہ ہز بنت
حکیم محمود علی خانصاحب
مناھرا - فراشخانہ دہلی

(۱)

نواب رشید احمد خاں دہلی کے، نیک دل، خلیق، اور فیاض امراء میں سے تھے۔ شہر کے تمام معزز لوگ ان کے ہاں آتے تھے ان کے حسن اخلاق کی ساری دلی میں دھوم تھی۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی ایک نامی گرامی سوداگر کی بیٹی تھیں۔ بدقسمتی سے ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی جس کا میاں بیوی دونوں کو افسوس تھا۔ اور ارمان بھی۔

یکایک نواب صاحب کو نمونیہ ہوگیا۔ شہر کے مشہور ڈاکٹر حکیم۔ وید۔ بلائے گئے۔ چند روز کے اندر ہزارہا روپیہ پانی کی طرح بہا دیا مگر علاج مرض کا ہو سکتا ہے موت کا نہیں۔ شدنی کی گھڑی انہیں آرام ہونا تھا نہ ہوا۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر نواب صاحب اس جہان فانی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہکر عالم جاودانی کو سدھار گئے۔

(۲)

ساڑھے چار ماہ بعد بیگم صاحبہ کی عدت پوری ہوگئی۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ ساری عمر رنڈاپے میں گزار دینگی مگر نکاح ثانی کا نام نہ لیں گی۔ کیونکہ نہ اب نواب مرحوم سا کوئی ملے گا نہ وہ اس قید و بند کو گوارا کرینگی۔ مگر یہ سب خیالات غلط نکلے بیگم نے تو عدت پوری کرتے ہی نظریں دوڑانی شروع کیں۔ آخر یہ کہ انہوں نے ایک بڑھیا کٹنی تلاش کر ہی لی جو اپنے آپ کو حجن ظاہر کرکے اپنی پارسائی کا سکہ جماتی تھی۔ اس کٹنی کا تعلق شہر کی ایک اوباش پارٹی سے تھا۔ اور یہ اکثر ناسمجھ اور مالدار عورتوں کا اس پارٹی کے کسی نہ کسی ممبر سے نکاح کرا کر دونوں طرف سے اپنا کمیشن وصول کیا کرتی۔ ایسی حجن اور گندم جو فروش بڑھیا سے بیگم صاحبہ کو جو کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا ظاہر ہے۔ روزانہ بیگم صاحبہ اس کٹنی کی خوب خاطر مدارات کیا کرتیں اور وہ بھی انہیں خوب سبز باغ دکھایا کرتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز بیگم صاحبہ نے خفیہ طور پر ایک نوجوان سے بمشورۂ دلالہ مذکورہ نکاح کر ہی لیا

(۳)

نکاح جیسی تقریب بھلا کب تک چھپ سکتی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے ملازموں کو خبر ہوئی۔ وہ بھی اس وقت جب دولہا میاں نکاح کے بعد گھر میں تشریف لائے۔ اور بیگم صاحبہ نے اپنی پرانی ملازمہ کو آواز دی۔

"رحیمن! اے رحیمن!!"

رحیمن۔ (باورچی خانہ ہی میں سے) جی بیگم۔ آئی۔ ابھی حاضر ہوئی۔"

بیگم۔" دسترخوان بچھاؤ۔ کھانا لاؤ۔"

رحیمن ہاتھ دھلانے کے لئے سیلابچی اور پانی کا لوٹا لائی۔ کمرے میں گھستے ہی دولہا میاں کی صورت دیکھکر رحیمن نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پانی کا بھرا ہوا لوٹا دولہا میاں کے سر پر دے مارا۔ اور کہا:۔

"ارے کم بخت (کم بخت) بندو تو یہاں کیسے آیا؟ جوانا مرگ کیسا دولہا بن کے بیٹھا ہے تجھے خدا کی مار۔ آج پانچ برس سے میری بالیاں چرا کر غائب ہوا۔ تو مردار کی صورت آج نظر آئی۔ وہ بھی کس ڈھنگ سے"

شرمندگی اور غصہ سے بیگم صاحبہ عرق عرق ہوگئیں اور تمام فرش پانی سے تر بتر ہوگیا۔ بیگم صاحبہ غصہ کے مارے کانپنے لگیں اور اپنی ماما (رحیمن) سے خفگی کے لہجہ میں سوال کیا کہ یہ کون ہے؟ جانتی بھی ہے؟ بے ادب۔ گستاخ۔ ایسی حرکت؟

ماما نے تیوری بدل کر جواب دیا کہ یہ بدمعاش میرا سوتیلا بیٹا ہے۔ بڑا بدمعاش ہے۔ پکا چور ہے۔ ایک دو دفعہ جیلخانہ کی چکیاں بھی پیس چکا ہے۔

بیگم صاحبہ یہ الفاظ سنکر چکرا گئیں اور نکاح کا تمام نشۂ خوشی ہرن ہوگیا۔

چاندنی رات

(از جناب مولینا عبد السلام صاحب رضا ذکی (عثمانیہ))

لیلیِ شب نے اپنے بال کھولدیئے فضا میں جب فرشِ زمیں پہ بچھ گیا دامِ درازِ زلفِ شب،
چار طرف زمین پر چاند نے کھیت کر دیا نور جہاں فروز سے سارے جہاں کو بھر دیا
فرشِ زمیں سے تا فلک بقعۂ نور ہو گیا منظرِ ماہتاب بھی رشکِ طور ہو گیا
حسنِ ازل کی اک جھلک چاندنی سے ہے آشکار جس کی ادائے حسن پر دلبری شگفتہ نثار
رونقِ بزمِ دہر کو تو نے لگائے چار چاند روز کی آب و تاب بھی پڑ گئی تیرے آگے ماند

مہر لگی ہے چار سو خامشی و سکوت کی
جوشِ نشاط دل میں ہے روح میں بھی ہے تازگی

آ بھی رہینِ خانہ آ! منظرِ ماہتاب دیکھ گلشنِ دہر پہ عیاں نور فگن سحاب دیکھ
دیکھ فلک پہ چھا گئی تابشِ نور کی گھٹا آنکھوں میں نور آ گیا دل پہ فروغ چھا گیا
عالمِ کائنات پر سحر ہے اس کا چل گیا دیکھ کے ایسی کیفیت پہلو میں دل مچل گیا
دیکھ نگاہِ غور سے ساحلِ بحر کا سماں، قدرتِ کردگار کے جلوے ہیں چار سو عیاں
بحر میں لطف آب کے آب میں کیفیت ماہ کے دلکش و دلپذیر ہیں کیسے کرشمے دہر کے

عشق ہے ماہتاب کے بحر میں شور ہے بپا
قلزم و جیحون پہ بھی چاند کا سحر چل گیا

باغوں کا ہے سماں عجب چمن پہ ہے نکھری چاندنی برگِ شجر سے دیکھنا کیسی ہے چھنتی چاندنی!
چادرِ نور اوڑھ کر گو ہیں درخت سو رہے دیکھ کے ان کو لوگ سب دل کو ہیں اپنے کھو رہے،
پیاری ادا سے چاندنی لیتی ہے اک جہان کا دل باغ کے گلرخوں کا دل انجمِ آسماں کا دل!
دیدۂ حق شناس سے پوچھئے لطفِ ماہتاب اس سے ہی ہے بے خبر آنکھ ہے جس کی محوِ خواب
کہتے ہیں چاندنی کو لوگ شاعرِ خوشنوا کا خواب چاند ہے آئینہ وہ کہ جس میں ہے نورِ آفتاب

غزل

پروفیسر تصبی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "ادبی دنیا" کو جب یہ غزل بغرض اشاعت بھیجی گئی تو ادارہ نے لکھا کہ یہ غزل کسی مشہور استاد کی ہے اور غالباً مطبوعہ ہے۔ اس لئے پروفیسر تصبی کے فرضی نام سے جن صاحب نے یہ غزل بھیجی ہے۔ وہ ہمیں معذور سمجھیں میں ادبی دنیا صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں نے میرے جیسے ہیچمداں کو ایک استاد تسلیم کیا۔ دراصل لیکن میں خود اپنے آپ کو مبتدی سمجھتا ہوں۔ وہ یقین فرمائیں کہ یہ میری ہی غزل ہے

شکستہ دل اگر کوئی بھی سرگرم فغاں ہوتا
ابھی تک کیا اسی صورت سے قایم آسماں ہوتا

اگر لاغر ہی ہونا تھا تو اتنا ناتواں ہوتا
زمانہ کو مرے ہونے نہ ہونے کا گماں ہوتا

حقیقت بادہ خواری کی اگر واعظ پہ کھل جاتی
تو راہ مکیشی میں وہ بھی خضر میکشاں ہوتا

وفا اور بیوفائی کے نہیں جوہر عیاں ہوتے
اگر اپنا عدو کے ساتھ ہی میں امتحاں ہوتا

سواد حشر پنہاں تھا نمود شام غربت میں
ہمیں ناداریوں پر کیوں نہ محشر کا گماں ہوتا

مزا آتا نیاز و ناز کے جھگڑے مٹانے کا
اگر میری جبیں ہوتی کسی کا آستاں ہوتا!

یہ حسن و عشق کے راز و نیاز آپس کی باتیں تھیں
ہمائے ان کے جھگڑے میں خدا کیوں درمیاں ہوتا

قیامت بھی نہ آئی ہوائے قسمت کیا قیامت ہے
کسی کا وعدہ دیدار پھر ایفا کہاں ہوتا؟

کسی کی آہ و زاری پر عبث تم کو تحیر ہے!
نہ تم کرتے ستم برپا نہ کوئی نوحہ خواں ہوتا

یقیناً داستان عشق کچھ اپنا مزہ دیتی
یہ افسانہ تھا جس کا، کاش وہ ہی قصہ خواں ہوتا

یہی حسرت یہی ارماں یہی ہے آرزو یارب!
کہ دشمن کی طرح ان کا تصبی بھی رازداں ہوتا

غزل

مولانا فرقت لکھنوی ہمارے پرانے کرمفرماؤں میں سے ہیں ۲۳ رجب المرجب کو آپ کے ہاں دختر فرخندہ اختر تولد ہوئی ہے مبارکباد عرض ہے۔ آپ نے چندہ کا بھی پوچھا ہے۔ اماں اب چندے کا کیا پوچھنا جتنا جی چاہے اور جب جی چاہے بھیج دیجئے۔ کائنات آپکا۔ چندہ آپ کا۔ اور پھر خوشی کا ہنگام!! (مدیر)

نہ قلب ہے مرا محتاج رازداں کے لئے
نہ نامہ بر کی ضرورت ہے درمیاں کیلئے

چھپایا میں نے ہوا چہرہ سے مرے ظاہر
فسانہ بن گئی الفت مری جہاں کے لئے

مصیبتوں میں گرفتار ہے ہر اک انساں
زمین اور بنے دور آسماں کے لئے

گھڑی ہی بھر مرے سینہ پہ ہاتھ رہنے دو
دوا ہے یہ مرے سوز غم نہاں کے لئے!

ہر ایک چیز میں ظاہر ہے پھر نہیں محدود!
مکاں کی قید نہیں کوئی لامکاں کے لئے!

یہاں بھی جب نہ ملو اور نہ آخرت کی امید
تمہیں بتاؤ سفر پھر کریں کہاں کے لئے

نہ قیس کی ہے حکایت نہ قصہ فرہاد
کلیجہ چاہیئے فرقت کی داستاں کے لئے

شاہراہ زندگی

میں

انسان تین منزلوں میں سے گزرتا ہے

بچپن جوانی بڑھاپا

بچپن! آغوش مادر و شفقت پدر میں گزر جاتا ہے۔ جوانی۔ لاابالی، استغنا، لہو و لعب اور فضول خرچی میں ختم ہوتی ہے رہا بڑھاپا۔ یہ ایک ایسا بھیانک۔ عمیق و دشوار گزار سمندر ہے کہ اس کو مصداق ہے

کون ہوتا ہے بُرے وقت کی حالت کا شریک ؛ مرتے دم آنکھ کو دیکھا ہے کہ پھر جاتی ہے

کم قوتی۔ بڑھے ہوئے اخراجات۔ کثرت اہل و عیال اور کم آمدنی کے باعث عبور کرنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن اس بُرے وقت میں زندگی کے بیمہ کی کشتی اگر جوانی کے لہو و لعب و فضول اخراجات میں سے کچھ پس انداز کر کے تیار کر لی گئی ہو تو ایک ایسا ذریعہ بن سکتی ہے کہ عمیق سے عمیق و دشوار گزار سمندر کو بھی آسانی سے عبور کر سکتا ہے۔

اور نہ صرف یہی

بلکہ پسماندگان کے آنے والے بُرے وقت کے لئے بھی یہی کشتی بحر مصیبت و مفلسی سے عبور ہونے کا بہترین ذریعہ بن سکتی ہے اس لئے آج ہی سے آپ اپنی زندگی کے بیمہ کی کشتی کی بنیاد ڈال دیں اور صرف دو پیسے روز یعنی ایک روپیہ ماہوار جس کو آپ روزانہ پان سگرٹ۔ برف۔ سوڈا و سینما وغیرہ پر فضول ضائع کر دیتے ہیں پس انداز کر کے

دی پرشین انشورنس بنک لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور

کی ایزی انشورنس سکیم یسینشیل سٹڈن ہیلپ سکیم کے ممبر بن جائیں

جو

(۱) آپ کے بڑھاپے میں ایک بڑی رقم سے آپکی مائش کا سامان کرے گی (۳) آپ کے بچوں کی تعلیم اور پرورش کا انتظام کرے گی۔
(۲) آپ کے بُرے وقت میں مالی امداد دے گی۔ (۴) کسی حادثہ یا بیماری کی حالت میں آپ کی مدد کرے گی۔

یہ کمپنی چونکہ آپ کی قومی کمپنی ہے اس لئے آپکا اخلاقی فرض ہے کہ اس میں اپنی اپنے بیوی بچوں کی زندگی و تعلیم وغیرہ کا بیمہ کرا کر اپنی مسرت کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیں۔

ہمارے نرخ ارزاں — ہمارا سرمایہ محفوظ — ہماری خدمات مستعد — ہماری ادائیگی فوری ہے

آج ہی قواعد و ضوابط طلب کیجئے — محنتی اور ہوشیار ایجنٹوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ تنخواہ و کمیشن معقول

مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کی تصانیف

پھل بوٹ

دلکھائی چھپائی اور شان طباعت کے لحاظ سے اردو کی شاندار ترین کتاب ہے۔ اسی کا اشتہار آخری ٹائٹل پر بھی ہے۔ چھوٹے بڑے تیس حصوں میں انیس باب کا ایک نہایت ہی دلچسپ ناول ہے۔ مصنف کا مخصوص طرز بیان، عبارت کی شوخی اور پلاٹ کی ظرافت کے علاوہ اس کتاب کی خوبی جذبات کی روانی ہے اور پھر خاص طور پر ایک پھل بوٹ جیتا جس طرح کا ایک پارٹ کرتا ہے، وہ قابل داد ہے۔ چکنا ولایتی کاغذ، کراؤن سائز۔ سرورق دوہرا رنگین فوٹو بلاک کا ہے، بہترین جلد بندی ہوئی ہے۔ لائبریری کی زینت کے لئے یہ کتاب ضروری ہے۔ مصنف کا فوٹو بھی شامل ہے۔ قیمت عہ

کولتار

کتاب کیا ہے سنجیدہ ظرافت کا گلدستہ ہے تبسم و خندیدگی ہر باب پر نثار ہے اس کا سنٹرل باب اردو کے بہترین مزاحیہ افسانوں میں سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں سولہ باب ہیں سائز بڑا ہے۔ کولتار کا ہر باب بجائے خود ایک دلچسپ مزاحیہ افسانہ ہے۔ سرورق باتصویر قیمت صرف دو روپے عام

روح ظرافت

آٹھ مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے اس میں مصنف کا شاہکار "انگوٹھی کی مصیبت" شامل ہے جو اردو کا بہترین مزاحیہ افسانہ ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ عہ

شریر بیوی

کراؤن سائز اچھی لکھائی چھپائی نیا مصور ایڈیشن بڑی دلچسپ کتاب ہے اس میں چار رنگین تصویریں آرٹ پیپر پر اپنی ہیں جو افسانوں سے متعلق ہیں۔ خصوصاً شریر بیوی کی تصویر تو بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ فوٹو بلاک کا بہترین آرٹ کا نمونہ ہے۔ جلد خوبصورت قیمت وہی عہ

روح لطافت

یہ روح ظرافت کا دوسرا حصہ ہے اور اس میں مصنف کا مشہور افسانہ کہار لی کا نوٹ بھی شامل ہے۔ قیمت عہ دونوں سیٹ لیجئے۔ کراؤن سائز پر بہترین لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ سرورق فوٹو بلاک کا۔ ہر کتاب کا محصول ڈاک خریدار کے ذمہ ہوگا۔ ذیل کے پتہ سے منگائیے۔

پتہ:- دفتر کتابت (عظیم بیگ چغتائی وکیل) جودھپور اسٹیٹ (مارواڑ)

حدیث اور پردہ

از

مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی وکیل جودھپور

خصوصیات (۱) کتاب کے شروع میں مصنف کی طرف سے پانچسو روپے کے انعام کا اعلان ہے یہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو ایک بھی حدیث ایسی پیش کرے جس میں پردہ کا حکم ہو۔

(۲) کتاب میں قریبًا سوا سو احادیث پردہ کی مخالفت میں بجنسہ درج ہیں۔

(۳) اندھوں سے پردہ کرنے والی مشہور حدیث کی تفصیل کے ساتھ حقیقت بیان کی گئی ہے۔

(۴) وہ سب حدیثیں نقل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پردہ نہ تھا۔

(۵) یہ کتاب مصنف کی مشہور کتاب "قرآن اور پردہ" کا دوسرا حصہ ہے قیمت ایک روپیہ عہ ر

قرآن اور پردہ کی قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ ر) علاوہ محصول

مزاحیہ لٹریچر

(۱) چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز ۸ ر
(۲) تفویض ———— ۵ ر
(۳) مرزا جنگی (مزاحیہ ڈرامہ) ۱۲ ر

ایک کارڈ لکھکر مفصل فہرست طلب کیجئے اور معلوم کیجئے کہ کون کون سی کتابیں زیر طبع ہیں۔ آج ہی لکھ بھیجئے۔

ان تمام کتب کے ملنے کا پتہ یہ ہے

دفتر کتابت (مرزا عظیم بیگ چغتائی وکیل) جودھپور۔

اردو کتاب گھر لاہور کی بہترین کتب

علم و عمل طب } مصنفہ عالیجناب کرنل بھولا ناتھ صاحب آئی ایم ایس - آئی سی ایس ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل آف ہاسپٹلز (الہ آباد) اس کتاب کو اطبا ہند نے سند پسندیدگی دی ہے - حجم ۱۲۱۶ صفحات - لکھائی چھپائی عمدہ - اصل قیمت پانچ روپے رعایتی ساڑھے تین روپے مجلد محصولڈاک ۱۵/ ۱

۱۲۰ سال عمر } کتاب مفتاح الصحت کی ہدایات پر عمل کرنے سے آپ کی عمر ۱۲۰ سال ہو سکتی ہے بڑی دلچسپ اور مفید کتاب ہے قیمت صرف ۱ روپیہ دس آنے

رموز ازدواج } مصنفہ حکیم عبدالکمیل صاحب حاذق وہ کتاب ہے جسے طبی اور غیر طبی دنیا نے یکساں پسند کیا ہے - بہت سی رنگین تصویریں بھی ہیں مصنف نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک مردوں کے لیے ہے دوسرا عورتوں کے لیے - دونوں حصوں کی قیمت دو روپے مجلد سوا دو روپے

عروس و نوشہ } نام سے مفہوم ظاہر ہے بڑی دلچسپ کتاب ہے تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں قیمت ایک روپیہ چار آنے علاوہ محصول -

قانون مواصلت } عیش و نشاط کی زندگی کا رہبر سمجھیے - قیمت صرف ایک روپیہ

بیوی کے فرائض } بیویوں اور بیوی بننے والی لڑکیوں کے لیے بیحد مفید ہے قیمت ۸/

لطف شباب } یہی وہ کتاب ہے جس سے شباب کا لطف حاصل ہو سکتا ہے قیمت ۱۲/

قرآن کریم } ہر قسم کے قرآن کریم چھوٹے سائز سے بڑے سائز تک - خفی - جلی - سادہ - مترجم - تفسیر والے - ۸/ سے لیکر ۸۰ روپے ہدیہ تک کے ہم سے طلب کیجیے - ہدیہ کم اور لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ رمضان شریف کی وجہ سے ۲۵ فیصدی رعایت کر دی گئی ہے -

پنجسورے } سہ رنگ بلاک کے چھپے ہوئے اتنے نفیس اور خوبصورت کہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو جائے - ہدیہ صرف ۸/

تجرید بخاری } سب سے زیادہ مستند حدیث بخاری شریف کا ترجمہ معہ حالات حضرات راویان دو حصوں میں نہایت عمدہ کاغذ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت چھ روپے محصولڈاک ۱۰/

قصص الانبیاء کلاں } انبیا علیہم السلام کے مستند حالات اور مشہور واقعات اور بیحد دلچسپ قصے جنہیں پڑھکر ایمان تازہ ہوتا ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ قصص الانبیا خورد ۱۲/

بہشتی زیور معہ بہشتی گوہر مکمل گیارہ حصے

مصنفہ فقیہ العصر علامہ دہر مولانا مولوی اشرف علی صاحب تھانوی - عورتوں کو دینی اور مذہبی معلومات اور ہر قسم کے مسائل شرعی سے واقف و آگاہ کرنے کے لیے اس سے بہتر آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اور پھر اس قدر ارزاں کہ جیسے مفت یعنی صرف ۱۲/ ۱ ہر کتاب کا محصول بذمہ خریدار ہے

ہر قسم کی کتابیں منگانے کا پتہ

اردو کتاب گھر حلقہ نمبر ۱۴ لاہور

مُصدّقہ فرم کی مُصدّقہ گھڑیاں

ستائیس ۲۷ سال سے ملک کے ہر گوشہ میں اس فرم کا مال رغبت کیساتھ طلب کیا جا رہا ہے ہر قسم کی گھڑیاں کلاک وغیرہ امتحان و تجربہ کے بعد فروخت کرتے ہیں ہر گھڑی کی جو تعریف بیان کی ہے اسمیں اشتہاری مبالغہ قطعی نہیں جس قسم کی اور جس قیمت کی گھڑی کی ضرورت ہو بلا تکلف طلب فرمائیے کیونکہ یہ فرم اپنا کاروبار نہایت ایمانداری سے کر رہی ہے جس کی تصدیق علمائے کرام و مدیران جرائد و روسائے عظام وغیرہ نے فرمائی ہے طوالت کے خوف سے صرف چند تصدیقات درج ذیل ہیں ۔ نوٹ ۔ ہر ہیکر و ہر قسم کی گھڑیاں اسٹاک میں موجود رہتی ہیں اور مرمت بھی بکفایت ہوتی ہے

امیر الہند جانشین حضرت شیخ الہند

حافظ عبد الرزاق صاحب مالک نصیر واچ کمپنی میرٹھ نہایت معتبر اور قابل اطمینان شخص ہیں ان کے معاملات نہایت صاف اور صحیح ہیں وعدہ اور جھوٹ کا ان کے یہاں گذر نہیں اسلئے میں تمام مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ حافظ صاحب موصوف پر اعتماد کریں اور معاملات کو جاری کر کے کسی قسم کے پس و پیش کو راہ نہ دیں ۔ دستخط حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی دار العلوم دیوبند

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلی

درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی ۔ نصیر واچ کمپنی صدر بازار میرٹھ ایک مشہور فرم ہے ہم نے ۱۹۲۳ء میں ایک ٹائم پیس منگایا تھا وہ بہت مقبول ہوا تھا ۔ میں اس کمپنی سے ذاتی طور پر واقف ہوں اس کے اشتہار مبالغہ آمیز نہیں ہوتے اور اسکا کاروبار دیانتداری اور اعتماد کا ایک نمونہ ہے ۔ دستخط حضرت خواجہ حسن نظامی دہلی

موقر اخبار مدینہ بجنور کی رائے

اس فرم کی گھڑی ٹائم پیس مدینہ کے کارکنوں کے استعمال میں آ چکی ہیں اور ہم تجربہ کی بنا پر اس کی عمدگی کی تصدیق کرتے ہیں حال ہی میں ایک الارم دفتر مدینہ کے لئے منگایا ہے ۔ امید ہے کہ وہ بھی پائیداری کے لحاظ سے تسلی بخش ثابت ہوگا ۔

امید ہے کہ آپ اس رعایتی اعلان سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے احباب کو بھی متوجہ کریں

مسٹر ریاض الاسلام آفیسر انچارج

تھانہ سوائمہ الہ آباد

مکرمی تسلیم

جو آپ سے ایک گھڑی ۱۹۲۳ء میں منگائی تھی میں مسرت کیساتھ لکھتا ہوں کہ وہ ابتک صحیح طور پر کام دے رہی ہے جس سے میں آپکا بیحد ممنون ہوں ۔ براہ کرم ایک اچھی گھڑی اپنی پسند سے میرے دوست کے لئے ... بالالتزام وی ۔ پی پارسل سے روانہ فرمائیے ۔

بیگمات پسند رسٹ واچ

لیور چال ... توقی والی ... گارنٹی ... سال

جو تقدار سے شوق سے استعمال

کرتی ہیں خوبصورتی نفاست میں دنیا میں بے جواب ہے ... رعایتی قیمت ... نمبر ... طلائی کیس کی قسم اعلیٰ ... روپیہ

ہفت روزہ لیور رسٹ واچ

نمبر ۲۸

گارنٹی ۵ سال

اس گھڑی میں آٹھ روز میں چابی لگا

در ہفتہ بھر تک بلا تکلف صحیح ٹائم دیکھئے ۔ اصلی ہیڈ اس کارخانہ کی ... سال تک کام دینے والی رعایتی قیمت ۲۸ ... کیس ... رعایتی قیمت ۲۹ ... سلور کیس ... روپیہ ۔

نیو ڈیزائن گولڈن رسٹ واچ

نمبر ۳۲

گارنٹی ... سال

بانداز و زکا تبلیغی الارم نمبر ۱

نمبر ۳

رعایتی قیمت ...

مکمل پرائس لسٹ مفت طلب فرمائیے

اسکی عمدگی کا تعلق موقر اخبارات نے نہایت شاندار الفاظ میں تصدیق کی ہے اور سینکڑوں خریدار ... ہیلتھ ... نیا ... نمبر ... صرف ... دیتا ہے ... اس کو ... بجائے ... کلاک ... قیمت ... علاوہ محصول ڈاک ... رعایتی قیمت ... لمبائی اور ۱۲ انچ ... لمبائی ۱۲ انچ ... رعایتی قیمت ... روپیہ

نئی قسم کا خوبصورت آفس کلاک

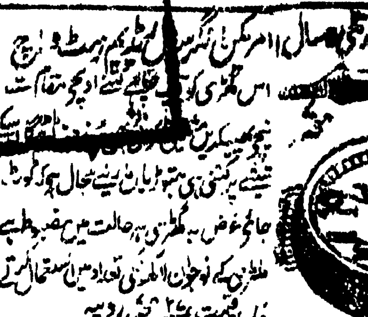
نمبر ۳۵

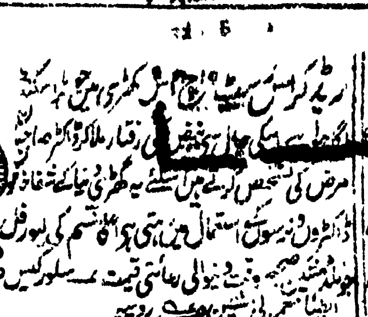
رعایتی قیمت ...

آٹھ روزہ ... پانچ روپیہ ... بیٹری ... اور اپنے ... گارنٹی ... سال

ملنے کا پتہ حافظ عبد الرزاق نصیر واچ کمپنی ۲۶ میرٹھ (یوپی) Meerut (U.P.)

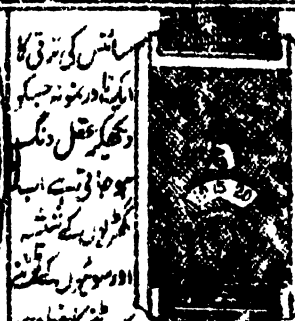
نمبر ۲۷
رعایتی قیمت

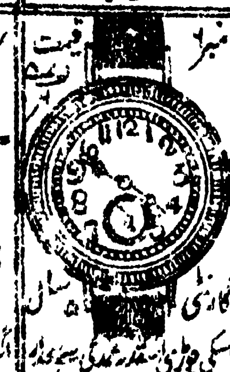




ریڈیو گراس سیٹ واچ

غلاف دار گولڈ سٹ واچ	بالکل نئی قسم کی حیرت انگیز گھڑی	نیو فیشن ہیئت زدہ پاکٹ واچ	اسکرو کیس لیمبر جول دار	موٹے گلاس کی رسٹ واچ







جدید نقش و نگار رسٹ	پائیدار دو گھنٹی والا الارم ٹائم پیس	اصلی بلو اسٹیل پاکٹ واچ	گولڈن ریڈیم رسٹ واچ	نیو ڈیزائن لنگولر رسٹ







NASIR WATCH Co No 41 MEERUT ملنے کا پتہ حافظ عبد الرزاق نصیر واچ کمپنی میرٹھ

آپکی ریزگاری کہاں جاتی ہے؟

پان - سوڈا - سگرٹ - برف - چائے - سینما وغیرہ پر ضائع ہوتی ہے اگر آپ دو پیسہ روزانہ بھی انسی ریزگاری سے بچاکر ایک روپیہ ماہوار

دی پرشین انشورنس بنک لمیٹڈ لاہور

کی سہل انشورنس سکیم میں جمع کریں تو آپ اپنی مصیبت کے وقت بذریعہ تار ایک کثیر رقم حاصل کرسکتے ہیں - قواعد وضوابط نہایت آسان - ہر شخص، مرد - عورت - بلالحاظ مذہب وملت ۱۸ سال سے ۶۵ سال کی عمر کے درمیان بادائیگی ۱۲؎ فیس داخلہ ممبر بن سکتا ہے - سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ اور باہمی امدادی چندہ (بہ ترمیم) ماہواری بھی صرف ایک روپیہ ہے یعنے کل تیرہ روپیہ سالانہ دینا پڑتے ہیں - ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت نہیں - عمر وغیرہ کے ثبوت کی ضرورت نہیں - کوئی خاص آمدنی کی ضرورت نہیں - امیر سے امیر اور غریب سے غریب بآسانی ممبر بن سکتا ہے - کسی ممبر کے مرنے یا حادثہ یا مرض سے اپاہج ہوجانے پر ماہواری باہمی چندہ امدادی (بترمیم) فراہم شدہ میں سے ۲۰ فیصدی اخراجات اسٹامپ وغیرہ کاٹ کر فوت شدہ ممبر کے ورثا کو یا معذور شدہ ممبر کو تقسیم کردیا جاتا ہے - یا ۵۰ فیصدی کاٹ کر سبکدوش شدہ ممبر کو دیدیا جاتا ہے -

نوٹ ہر شخص ممبر بننے کے چودہ سال بعد سبکدوش ہوجاتا ہے اور کسی ممبر کے بذریعہ حادثہ یا بذریعہ مرض لاچار اور اپاہج ہوجانے پر جسکے بعد ممبر دلیا روزی کمانے کے قابل نہ رہے - معذور سمجھا جاتا ہے -

تمثیل فرض کیجئے کہ آج کمپنی کے ۶۰۰ تو چندہ ماہواری (ترمیم) ۶۰۰ روپیہ ماہوار کمپنی میں جمع ہوگا جس میں سے ۲۰ فیصدی کے حساب سے ۱۲۰ روپیہ اخراجات کمپنی وضع کرکے بقیہ ۴۸۰ روپیہ فوت شدہ - معذور شدہ یا سبکدوش شدہ ممبر کو دیا جائے گا -

اس کے علاوہ دوسری فوری امدادی سکیم میں ممبر بننے سے بروقت ضرورت ۵۰۰ روپے تک اور بروقت فوری ضرورت یا حادثہ وغیرہ ۳۰۰ روپے تک لبطور امداد مل سکتا ہے - مفصل قواعد وضوابط کے لئے آج ہی لکھ بھیجیں -

با رسوخ ایجنٹوں کی ہر جگہ ضرورت ہے - کمیشن و تنخواہ معقول دی جاتی ہے -

منیجر دی پرشین انشورنس بنک لمیٹڈ لاہور پنجاب

باہتمام سید سراج احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپا اور دفتر رسالہ کائنات لاہور سے شائع ہوا۔